اُردو طنز و مزاح پر مبنی سہ ماہی برقی مجلّہ

ارمغانِ ابتسام

جولائی ۲۰۱۷ء تا ستمبر ۲۰۱۷ء

مُدیر:

نوید ظفر کیانی

مُدیر:

نوید ظفر کیانی

مشاورت:

کے ایم خالد

خادم حسین مجاہد

محمد امین

روبینہ شاہین

ارمغان ابتسام

http://www.facebook.com/groups/837838569567305/

برقی ڈاک کا پتہ برائے خط وخطابت

mudeer.ai.new@gmail.com

حلقہ ارباب مزاح

مزاح نگار ڈائریکٹری

مرتب کرنے کا ارادہ رکھتا ہے حلقہ ارباب مزاح کی خواہش ہے پوری دنیا میں بسنے والے ہر اس مزاح نگار کا تعارف اس میں شامل ہو جس کے قلم نے کسی بھی ذی روح کے ہونٹوں پر مسکان دی ہو

زیادہ سے زیادہ آٹھ سو الفاظ پر مشتمل اپنا تفصیلی تعارف ان پیج فارمیٹ میں اپنی خوبصورت ترین تصویر (شادی والے دن کے علاوہ) حلقہ ارباب مزاح کو ای میل ایڈریس halqa.mezah@gmail.com پر ای میل کر دیں۔ آپ کا تعارف درج ذیل نکات کا احاطہ کرتا ہو۔

☆ پیدائش کا علاقہ (شہر اور ملک)، گردش دوراں نے کون کون سے علاقے دکھائے اور موجودہ سکونت کس شہر (ملک) میں ہے۔
☆ اسکول، کالج یونیورسٹی کے نام اور تعلیمی دور کا کوئی یادگار واقعہ
☆ لکھنے کا آغاز کتنی عمر اور کہاں اور کس ادیب سے متاثر ہو کر کیا، پہلی تحریر کہاں چھپی۔
☆ جرائد، اخبارات اور ویب سائٹس کے نام۔
☆ کسی ادبی شخصیت سے دوستی یا ملاقات کا کوئی واقعہ
☆ شائع شدہ کتابوں کے نام پبلشرز کی تفصیل کے ساتھ (اگر شائع ہوئی ہوں)۔
☆ مستقبل میں آنے والی کتابوں کے نام۔
☆ کسی ریڈیو یا ٹی وی کے پروگرام میں شرکت کی ہو تو چینل اور پروگرام کا نام۔
☆ حکومت یا کسی ادارے سے کوئی ایوارڈ حاصل کیا ہو تو اس کی تفصیل۔
☆ رہائش کا پتہ (آپشنل) ای میل ایڈریس (ضروری)، موبائل فون (آپشنل)
☆ فیس بک آئی ڈی (ضروری)، ٹویٹر آئی ڈی (اگر ہے تو)، سکائپ (اگر ہے تو)
☆ چند تحریروں کے ویب سائٹ لنک یا اپنی تحریر کے چند سکین نمونے ضرور ای میل کریں۔

اگر فیس بک کے دوست اپنے قرب و جوار میں رہنے والے کسی مزاح گو شاعر، مزاح نگار یا کارٹونسٹ سے واقف ہوں تو ان کا تعارف حلقہ ارباب مزاح تک پہنچائیں تا کہ ان کا تعارف "مزاح نگار ڈائریکٹری" کی زینت بن سکے۔

مزاح نگاروں کا ایک با اعتماد، نمائندہ حلقہ

کیا کیا کہاں کہاں

اداریہ

پرانے چاول

قندِ شیریں

جوکے

قسطوں قسط

مزاحیے

سفر وسیلۂ ظفر

نظمالوجی

جستہ جستہ

اُرسلانؔ بلوچ، خادم حسین مجاہدؔ، اعظم نصرؔ، بغدادی نژاد رازی، ڈاکٹر محمد یونس بٹ وغیرہ کے جستہ جستہ فقروں ،قہقہہ آور چٹکلوں اور ادارۂ ہٰذا کے تشخیص کردہ شرارتی کارٹون، مجلّے کے مختلف صفحات پر۔

سفر نامہ نگار

لفظوں کے ہیر پھیر سے مزاح پیدا کرنا ایک فن ہے جس میں یوسفی صاحب یدِ طولیٰ رکھتے ہیں۔ ویسے تو ہر چھوٹا بڑا مزاح نگار اس کی کوشش ضرور کرتا ہے اور یہ ایک بہت پر لطف تجربہ ہوتا ہے، جیسے یوسفی صاحب نے ایک جگہ جملۂ معترضہ کی جگہ حملۂ معترضہ استعمال کیا ہے۔ ایسی خوبصورت مثالیں ہر مزاح نگار کے ہاں مل جاتی ہیں۔ یہ تجربہ اس وقت زیادہ خوبصورت ہو جاتا ہے جب الفاظ یا حروف میں تبدیلی کم سے کم ہو لیکن اگر مزاح پیدا کرنے کے لئے تصنع آمیز زبان سے کام لیا جائے تو تحریر بوجھل ہونے کی وجہ سے پر لطف نہیں رہتی اور تکلف ہونے کی وجہ سے معنی آفرینی تو شائد مل جائے لیکن اکثر اوقات تحریر قابلِ فہم بھی نہیں رہتی اور حشو و زوائد سے پُر ہو جاتی ہے جو تحریر کے حُسن کو گہنا دیتی ہے۔ مزید یہ کہ بعض مزاح نگار یہ سمجھتے ہیں کہ اُن کے لئے درست زبان لکھنا ضروری نہیں، وہ غلط بھی لکھیں گے تو مزاح سمجھ کر نظر انداز کر دیا جائے گا۔ بے شک ہوتا ایسا ہی ہے لیکن اُلٹ پھیر کے علاوہ مزاح نگاروں کے لئے بھی درست زبان لکھنا اِتنا ہی ضروری ہے جتنا شاعر یا ادیب کے لئے۔ مزاح نگاروں کو تنقید نگار شک کا فائدہ دیتے ہوئے زیادہ گرفت نہیں کرتے لیکن اس سے غلط زبان لکھنا مزاح نگاروں کی عادتِ ثانیہ بن جاتی ہے جو کہ کوئی مثبت رویہ نہیں، اس لئے ہم کچھ عام غلطیوں کی نشاندھی کرنا چاہتے ہیں جو عام ادیب اور شاعر اکثر کرتے رہتے ہیں مثلاً لکھا جاتا ہے کہ اُس کے تو چودہ طبق روشن ہو گئے۔ اس جملے کی درست صورت ہے اس پر چودہ طبق روشن ہو گئے کیونکہ چودہ طبق سے مراد ہیں سات زمینیں اور سات آسمان اور اس جملے کا مطلب ہے حقائق واضح ہو جانا، باخبر ہو جانا، عقل آ جانا۔ اسی طرح لکھا جاتا ہے کہ فلاں اداکار سے انٹرویو لیا گیا۔ اس جملے میں سے کی جگہ کا کا استعمال ہوگا کیونکہ انٹرویو کا مطلب ہے اندرونی نقطۂ نظر۔ اسی طرح سمجھ آنا غلط روزمرہ ہے، اسے کہیں گے سمجھ میں آنا۔ ان شاء اللہ کو غلط طور پر انشاء اللہ لکھا جاتا ہے جس کا مطلب ہے اللہ کی لکھائی جبکہ مراد ہے اگر اللہ نے چاہا تو۔ بمع اور بمعہ غلط ہیں، صرف مع استعمال ہوگا جس کا مطلب ہے ساتھ۔ اس کے ساتھ ب نہیں لگائیں گے کیونکہ اس کا مطلب بھی ساتھ ہی ہے۔ ایک ہی سلسلۂ کلام میں صیغہ بدلنے کو شتر گربہ کا عیب کہتے ہیں۔ مثلاً اگر پہلے آپ استعمال کیا ہے تو آگے بھی آپ ہی استعمال کریں گے، تو یا تم نہیں اور متکلم کے لئے میں استعمال کیا ہے تو آگے ہم نہیں لکھیں گے بلکہ میں ہی آئے گا۔ اسی طرح پنجاب مین بعض جہلاء مہمانوں کے استقبال کے لئے بسم اللہ کے الفاظ کو بگاڑ کر بسم اللیاں بولتے ہیں اور یوں اپنی دانست میں مزاح پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو کہ سخت بے ادبی کی بات ہے اس لئے اس سے بچنا چاہیے۔ اسی طرح جب ہم کسی کو کوئی کام شروع کرنے کا کہتے ہیں تو اس کے لئے روزمرہ استعمال کرتے ہیں بسم اللہ کریں کسی اچھے کام کے لئے تو یہ روزمرہ استعمال کرنا مستحسن ہے لیکن ہم ہر کام کی نوعیت دیکھے بغیر یہ روزمرہ استعمال کر جاتے ہیں۔ یاد رکھیں کسی غلط کام کے لئے یہ روزمرہ استعمال کرنا گناہ کا موجب ہے مثلاً پتے بانٹنے اور رشوت کی رقم تقسیم کرنے کے لئے اس روزمرہ کا استعمال کچھ ایسا ہی ہے جیسے بسم اللہ پڑھ کر چوری یا ڈکیتی کے لئے نکلنا۔ اسی طرح قدیم شعراء اپنی ہر مصیبت کا ذمہ دار فلک / چرخ / گردوں کو قرار دیتے تھے۔ ان سب کا مطلب ہے آسمان، یوں ان الفاظ کے پردے میں اللہ تعالیٰ سے اظہارِ ناراضی کرتے تھے۔ بعض تو گالیاں تک دے دیتے تھے مثلاً تفو بر چرخِ گرداں تفو (اے گھومنے والے آسمان تجھ پر لعنت ہو) لیکن فلک اور چرخِ گرداں کی نسبت اللہ تعالیٰ سے ہونے کے باعث یہ فعلِ مذموم ہے اور اللہ کی اس توہین سے بچنا چاہیے۔ اِسی طرح ہمارے کچھ ادباء خلیفہ کا لفظ حجام کے لئے استعمال کرتے ہیں حالانکہ خلیفہ کا مطلب ہے نائب، بعد میں آنے والا، نمائندہ اور امیدوار۔ قران مجید میں انسان کو خلیفہ کہا گیا کیونکہ جنوں کے بعد زمین پر انسان کو اُتارا گیا پھر آنحضور ﷺ کے بعد مسلمان حکمرانوں کو خلیفہ کہا گیا کیونکہ وہ آنحضور ﷺ کے نائب تھے، اس لئے اس لفظ کا بطورِ حجام استعمال خلفاء کی توہین ہے، اس سے بچنا چاہیے۔ مزید لفظ بربریت کا استعمال وحشت کے معنوں میں عیسائیوں نے مسلم بربر قبائل کی بہادری کی مذمت کے لئے استعمال کیا کیونکہ اُنہوں نے صلیبیوں کو شکست دی تھی، اس کے بجائے سربیت، چنگیزیت، امریکیت یا برہمنیت کا لفظ استعمال کرنا چاہیے۔ عملِ قومِ لوط کے لئے لواطت کا لفظ استعمال ہوتا ہے جو کہ پیغمبر کی نسبت کی وجہ سے غلط ہے، ان کو سدومی کہنا چاہیے۔

خادم حسین مجاہد

مجتبیٰ حسین

قصہ ایک ہمشکل کا

بعض اوقات کچھ ایسے واقعات پیش آ جاتے کے باوجود آپ لوگوں کو یہ یقین نہیں دلا سکتے کہ یہ واقعہ آپ کے ساتھ پیش آیا ہے۔

پچھلے دنوں میں بذریعہ ٹرین دہلی سے حیدرآباد جا رہا تھا۔ ایک حیدرآبادی دوست بھی میرے ہم سفر تھے۔ ناگپور کے اسٹیشن پر گاڑی بڑی دیر تک ٹھہرتی ہے۔ ہم دونوں سفر کی بوریت کو ختم کرنے کے لئے پلیٹ فارم پر اُترے تو اچانک ایک شخص بڑی گرم جوشی کے ساتھ میری طرف آیا اور مجھ سے بغل گیر ہوتے ہوئے بولا ''یار! دیپک سکسینہ، کیسے ہو؟ کہاں جا رہے ہو؟؟''

میں نے کہا ''حیدرآباد جا رہا ہوں۔''

پوچھا ''تو کیا اب حیدرآباد میں بھی تم نے اپنا بزنس شروع کر دیا ہے؟''

میں نے کہا ''شروع تو نہیں کیا ہے، شروع کرنے کا سوچ رہا ہوں۔''

کہنے لگا ''بہت اچھا خیال ہے، یہ بتاؤ گھر پر سب کیسے ہیں؟''

میں نے کہا ''سب اچھے ہیں، مہندر انجینئرنگ کرنے کے بعد باہر چلا گیا ہے۔ سرلا اپنی سسرال میں خوش ہے۔ وریندر کے بارے میں تو تم جانتے ہو گے کہ اُس نے اب پلاسٹک کی چیزیں بنانے کا اپنا ایک کارخانہ کھول لیا ہے۔''

اس شخص نے کہا ''اچھا مجھے پتہ نہیں تھا کہ وہ اِتنا بڑا ہو گیا ہے۔ وہ ذہین پہلے ہی سے تھا، کاروبار میں تم سے یقیناً آگے جائے گا۔''

میں نے کہا ''بس تمہارا آشیرواد چاہیئے۔''

پھر اُس شخص نے پوچھا ''اور بھابی کا کیا حال ہے؟''

میں نے کہا ''بھگوان کی کرپا سے بالکل اچھی ہیں۔ وہ جو الٰہ آباد کے مشہور وید پنڈت پربھاکر ویدی ہیں ناں، اُن کے علاج سے بڑا فائدہ ہوا ہے۔ جوڑوں کا درد بالکل جاتا رہا ہے۔''

اُس شخص نے حیرت سے کہا ''اچھا تو وید جی اب تک زندہ ہیں۔ بہت بوڑھے ہو گئے ہوں گے۔ کیا اُسی پرانے مکان میں رہتے ہیں؟''

میں نے کہا ''ہاں، وہی گھاس منڈی والے مکان میں

رہتے ہیں۔"

بولا "اچھا کیا تم نے بتلا دیا۔ اُنہیں خط لکھتا ہوں۔ پچھلے کچھ دنوں سے میں بھی جوڑوں کے درد میں مبتلا ہوں۔ حیدر آباد سے الٰہ آباد کب واپس جاؤ گے؟"

میں نے کہا "ایک ہفتہ میں واپس ہو جاؤں گا۔"

بولا "یار تمہاری دکان کی مٹھائیاں اور نمکین چیزیں بہت یاد آتی ہیں۔ کئی برس ہو گئے الٰہ آباد آئے ہوئے، اب کے آؤں گا تو ضرور ملوں گا اور ہاں تمہیں یاد ہوگا کہ الٰہ آباد سے چلتے وقت میں نے تم سے سو روپے اُدھار لئے تھے۔ پورے چھ برس بیت گئے۔ ہمیشہ خیال آیا کہ تمہیں منی آرڈر کر دوں لیکن فرصت ہی نہیں ملی۔ اب رکھ لو۔"

یہ کہہ کر اُس نے مجھے سو روپے کا نوٹ دیا۔ میں نے پوچھا "مگر یہ تو بتاؤ کہ تم ناگپور میں کیا کر رہے ہو؟ اپنا پتہ تو دو۔"

اس اثناء میں ٹرین نے چلنے کی تیاری شروع کر دی۔ اُس شخص نے اپنا وزیٹنگ کارڈ مجھے دیا اور ٹرین کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہنے لگا "الٰہ آباد کی صحبتیں بہت یاد آتی ہیں۔ سارے دوستوں کو میری طرف سے پوچھنا اور بھابی کو نمستے کہنا۔ بچوں کو پیار اور ہاں حیدر آباد سے واپس ہوتے وقت ایک دو دن ناگپور میں رُک جاؤ۔ اب میرے حالات اچھے ہو گئے ہیں۔ پہلے کی سی بات نہیں رہی۔"

گاڑی آگے کو نکل گئی اور وہ بڑی دیر تک پلیٹ فارم پر ہاتھ ہلاتا رہ گیا۔ جب ہم ڈبہ میں واپس آئے تو میرے حیدر آبادی دوست نے کہا "یار مجتبیٰ! کمال ہے۔ تم تو عملی مذاق بھی خوب کر لیتے ہو۔ یہ تم مجتبیٰ سے دیپک سیکسینہ کیسے بن گئے۔ یہ الٰہ آباد، یہ گھاس منڈی اور پربھاکر وویدی، یہ سب کیا ہے اور تمہارا بیٹا مہندر کہاں سے آ گیا اور یہ وریندر نے پلاسٹک کا کارخانہ کب کھول لیا اور ہاں بھابی تو کبھی جوڑوں کے درد میں مبتلا نہیں ہوئیں۔"

میں نے ہنس کر کہا "اس شخص سے سو روپے لینے کے لئے یہ کہنا ضروری تھا۔"

میرے دوست نے کہا "مگر تم نے تو اسے سو روپے نہیں دیئے تھے۔"

میں نے کہا "مگر دیپک سیکسینہ نے تو دیئے تھے۔"

میرے دوست نے پوچھا "کیا مذاق کرتے ہو؟ کون ہے یہ دیپک سیکسینہ؟؟"

میں نے کہا "وہی جو الٰہ آباد میں رہتا ہے۔ رانی منڈی میں اس کی کنفکشنری کی دکان ہے اور جس کی بیوی جوڑوں کے درد کی مریضہ ہے۔"

میرے دوست نے کہا "تب تو یہ سو روپے اُس دیپک سیکسینہ کے ہوئے۔ تم نے کیوں وصول کر لئے؟"

میں نے کہا "اور وہ جو میرے مزاحیہ مضامین کی داد ہر ایک سے وصول کرتا رہتا ہے تو یہ داد کس کھاتے میں جائے گی؟"

میرے دوست نے جھنجھلا کر کہا "یار، یہ معمہ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے، کھل کر بتاؤ کہ کیا معاملہ ہے؟"

اور میں نے جو بات اپنے حیدر آبادی دوست کو بتائی وہ اب آپ سب کو بھی بتائے دیتا ہوں۔ بات دراصل یوں ہوئی کہ آج سے سات آٹھ برس پہلے میں دہلی کے کناٹ پلیس کی ریگل بلڈنگ کے سامنے کھڑا تھا کہ ایک شخص نے اچانک پیچھے سے آ کر مجھے گھونسہ رسید کرتے ہوئے کہا "ابے دیپک سیکسینہ تو یہاں کیا کر رہا ہے؟ کب آیا حیدر آباد سے؟"

میں نے اپنی پیٹھ کو سہلاتے ہوئے کہا "معاف کیجئے گا، میں دیپک سیکسینہ نہیں ہوں، آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔"

وہ شخص بولا "ابے لفنگے! مجھ سے مذاق کرتا ہے، بچپن کا دوست اور مجھے "آپ" کہہ کر شرمندہ کر رہا ہے۔ اچھا یہ بتا کب آیا الٰہ آباد سے؟"

میں نے قدرے بلند آواز میں اس سے کہا "دیکھئے جناب! آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں دیپک سیکسینہ نہیں ہوں اور نہ ہی الٰہ آباد سے میرا تعلق ہے۔ خوامخواہ میرا وقت برباد کرنے کا کیا فائدہ۔"

اس پر وہ شخص بپھر گیا اور غصہ سے بولا "اب میں سمجھا کہ تو

کس بات پر خفا ہے۔ یہی ناں کہ میں نے تیری دُکان سے تین ہزار کی مٹھائی اُدھار لی تھی۔ یہ لے پانچ روپے اور رکھ اپنی جیب میں۔ تیری پائی پائی چکا دوں گا۔ تو سمجھتا کیا ہے اپنے آپ کو۔ بہت دنوں سے الہ آباد نہیں آیا تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں تیرے پیسے ہڑپ کرنا چاہتا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ تو پیسوں کے لئے اتنا گر جائے گا۔ آج سے تیری میری دوستی ختم۔''

اُس شخص نے غصے میں پانچ سو کا نوٹ میری شرٹ میں ٹھونس دیا اور میرے منع کرنے کے باوجود آگے نکل گیا۔

اس واقعہ کے بعد بہت دِنوں تک وہ پانچ سو روپے میری جیب میں ہی پڑے رہے۔ چار برس پہلے کسی ادبی محفل کے سلسلے میں مجھے لکھنؤ جانا پڑا۔ لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن کے دو چار دوستوں کے ساتھ میں امین آباد پارک میں سے گزر رہا تھا کہ اچانک ایک صاحب نے پیچھے سے پکارا ''بھائی دیپک سیکسینہ! کیسے ہو یار؟ دیکھ کر بھی انجان بنے جا رہے ہو۔ مٹھائیاں اچھی بناتے ہو تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ پرانے دوستوں کو بھی بھول جاؤ۔''

دیپک سیکسینہ کا نام سُن کر مجھے اچانک کناٹ پلیس والا واقعہ یاد آ گیا۔ قبل اس کے کہ میں اس کی غلط فہمی دور کرتا، میرے ریڈیو کے دوستوں نے اس سے کہا ''معاف کیجئے۔ یہ دیپک سیکسینہ نہیں مجتبیٰ حسین ہیں۔ دہلی سے آئے ہیں۔''

مگر میں نے بیچ میں مداخلت کرتے ہوئے اس شخص سے کہا ''حضور ان کی باتوں میں نہ آیئے۔ میں ہی دیپک سیکسینہ ہوں، الہ آباد والا۔ آپ نے میری دکان سے جو مٹھائی لی تھی اس کے پیسے اب تک نہیں دیئے۔ میں آپ کو کیسے نہیں پہچانوں گا۔''

اُس شخص نے ندامت سے کہا ''ہاں بھئی دیپک، ابھی پچھلے مہینے تو تم نے سو روپے کی مٹھائی اُدھار دی تھی۔ ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ اگلے ہفتے الہ آباد آ رہا ہوں، پیسے دے دوں گا۔''

تب میں نے اس شخص پر اپنی اصلیت کو ظاہر کرتے ہوئے کہا ''حضور! مجھے ذرا اس دیپک سیکسینہ کا پتہ تو بتایئے۔ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔ یہ کیسا آدمی ہے کہ ہر ایک کو اُدھار میں مٹھائی دے دیتا ہے اور پھر بھی اس کا کاروبار چل رہا ہے۔''

بہرحال میں نے اس شخص سے دیپک سیکسینہ کا پورا پتہ حاصل کیا۔ اتفاق سے اس واقعہ کے پورے ایک سال بعد ایک ادبی محفل کے سلسلے میں الٰہ آباد جانا پڑ گیا تو میں دیپک سیکسینہ کی کنفکشنری کی دکان میں گیا۔ دیپک سیکسینہ کو دور سے دیکھا تو یوں لگا کہ جیسے میں خود دکان پر بیٹھا مٹھائیاں بیچ رہا ہوں۔ جیسے ہی میں اس کی دکان مین گیا دیپک سیکسینہ نے مجھے ایک نظر دیکھا اور زور سے بولا "السلام علیکم مجتبیٰ صاحب! کب آئے آپ دہلی سے الٰہ آباد؟ مجھے یقین تھا کہ آپ ایک نہ ایک دن میری دکان پر ضرور آئیں گے۔"

میں نے کہا "یار دیپک سیکسینہ! تمہیں میرا نام کیسے معلوم ہوا؟"

بولا "کمال کرتے ہیں آپ بھی۔ جیسے آپ کو میرا نام معلوم ہو گیا ویسے ہی مجھے بھی آپ کا نام معلوم ہو گیا۔ دو ایک بار دہلی گیا تو جگہ جگہ لوگوں نے مجھے "مجتبیٰ حسین" سمجھ کر پکڑ لیا۔ آپ کے ایک دوست نے مجھے بے پناہ گالیاں بھی دیں کی رات کھانے کی دعوت پر آنے کا وعدہ کر کے میں اُن کے ہاں نہیں پہنچا۔"

دیپک سیکسینہ سچ مچ میرا ہم شکل تھا۔ مجھ سے مل کر وہ بہت خوش ہوا۔ مجھے خوشی خوشی اپنے گھر لے گیا۔ بیوی بچوں سے ملایا۔ شام کو مجھے الٰہ آباد کی ایک ادبی محفل میں شرکت کرنی تھی سو میں نے دیپک سیکسینہ کو بھی ادبی محفل میں شرکت کی دعوت دے دی۔ کسی وجہ سے میں ادبی محفل میں دیر سے پہنچا تو دیکھا کہ ادبی محفل کے منتظمین اسے زبردستی پکڑ کر ڈائس پر بٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ تو اچھا ہوا کہ میں نے بر وقت بیچ بچاؤ کیا ورنہ اس دن دیپک سیکسینہ کو پتہ چلتا کہ ہوٹنگ کس کو کہتے ہیں۔

منتظمین ہم دونوں کی مشابہت کو دیکھ کر پریشان تھے۔

بہرحال جب میں الٰہ آبد سے دہلی واپس جانے لگا تو دیپک سیکسینہ میرے لئے مٹھائی کے کئی ڈبے لے کر آ گیا۔ میں نے اس کے کناٹ پلیس والے دوست کے دیئے ہوئے پانچ سو روپے دینے کی کوشش کی تو دیپک نے کہا "مجتبیٰ صاحب! آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ آپ کی تصویریں ہندی رسالوں میں چھپتی ہیں۔ ٹیلیویژن پر بھی آپ اکثر آتے رہتے ہیں۔ آپ کو کیا پتہ کہ میں نے آپ کے مزاحیہ مضامین کی جتنی داد وصول کی ہے اس کے آگے ان پانچ سو روپیوں کی کیا حیثیت ہے۔ اِنہیں اپنے پاس ہی رکھیئے۔"

میں نے پوچھا "دیپک سیکسینہ یہ تمہیں کیسا لگتا ہے؟"

بولا "بہت اچھا لگتا ہے، لیکن کبھی کبھی اس ملک میں جب فرقہ وارانہ دنگے ہونے لگتے ہیں تو آپ کے تعلق سے تشویش میں مبتلا ہو جاتا ہوں۔"

میں نے کہا "دیپک! تم میرے لئے تشویش میں مبتلا ہو جاتے ہو، اس بات کی مجھے خوشی ہے، مجھے اور کیا چاہیئے، مگر مجھے تم سے ہمدردی ہے۔ حالانکہ تمہارا کاروبار ٹھیک چل رہا ہے لیکن لوگوں کو اُدھار میں مٹھائی تو نہ دیا کرو۔"

بولا "مجتبیٰ صاحب! آپ بھی تو لوگوں کو اُدھار میں ہنستے ہنساتے رہتے ہیں۔ یہ سماج آپ کی باتوں پر ہنس تو لیتا ہے لیکن اس کی قیمت آپ کو کہاں ادا کرتا ہے۔"

دیپک سیکسینہ کی اس بات کو سن کر مجھے یوں لگا جیسے میں مٹھائی فروش ہوں اور وہ مزاح نگار ہے۔

میں نے مشاعروں کے بعض ایسے مقبول شاعر بھی دیکھے ہیں جو دونوں ہاتھوں سے مشاعرہ اور مشاہرہ یعنی معاوضہ دونوں کو لوٹتے ہیں لیکن ادب میں ان کا کوئی نام لیوا نہیں ہوتا۔ برخلاف اس کے ہمارے ہاں ایسے شاعر بھی ہیں جو ادب کے جائزہ میں بہت اونچے منصب پر فائز ہوتے ہیں لیکن مشاعرہ میں غلطی سے اپنا منہ کھولتے ہیں تو سامعین کے منہ بھی کھل جاتے ہیں۔ مشفق خواجہ نے کسی شاعر کے بارے میں ایک جگہ لکھا تھا کہ "فلاں شاعر" نہایت وسیع المطالعہ شخص ہے کیونکہ یہ سال کے بارہ مہینے مشاعرے پڑھتا ہے۔ زبیر بھی سال کے بارہ مہینے نہ سہی چھ مہینے تو ضرور ہی مشاعرہ پڑھتے ہیں لیکن بقیہ چھ مہینوں میں مشاعروں کے علاوہ اور بھی بہت کچھ پڑھتے ہیں جیسے کتابیں اور چہرے وغیرہ۔

زبیر رضوی از مجتبیٰ حسین

مراد علی شاہد

شاعری۔ ایک متعدی مرض

جدید شاعراتی و ادبی تحقیق سے یہ بات اظہر من الشمس ہو چکی ہے کہ دو طرح کی بیماریوں نے پوری دنیا کو اپنے جراثیمی کرب میں لپیٹ رکھا ہے۔

۱۔متعدی مرض (اچھوت کی طرح ایک دوسرے کو لگ جانا)

۲۔تعدی (حد سے بڑھ جانا) مرض

اوّل الذکر مرض (متعدی) کو شاعری اور موخر الذکر (تعدی) مرض کو آئی ٹی کے نام سے تخصیص کیا گیا ہے۔

ثانی الذکر کی تفصیل مؤخر کرنا اس لئے ضروری خیال کرتا ہوں کہ مابدولت خود آج کل اس بیماری میں مبتلا ہیں، تاہم متعدی مرض (شاعری) کے وائرس زدہ افراد (شاعروں) سے بالواسطہ یا بلاواسطہ میرا تعلق و ربط رہا ہے یا رہتا ہے، تو حقِ دوستی کا تقاضہ پورا کرنے کے لئے اس موضوع کا اپنے قلم سے سرِقلم کرنا میں اپنا فرضِ عین خیال کرتا ہوں اور یہ سلسلہ اس وقت تک ممکن ہے، چلتا رہے جب تک کہ یہ شاعرانہ جراثیم اپنے تمام لاؤلشکر کے ساتھ مجھ پر حملہ آور نہ ہو جائیں۔

ایامِ جوانی میں ایک قطعہ سُنا تھا، احباب کی نذر کرتا ہوں۔

شاعر کے گھر میں روٹی نہیں ملتی
مل جائے روٹی تو دال ندارد
بیوی نے تنگ آ کے بیچ دی ردی
حالؔی و غالبؔ و اقبالؔ ندارد

مگر صاحب یہ ازمنۂ قدیم کی باتیں ہیں، قصۂ پارینہ ہے، اساطیر ہے، افسانے ہیں۔ آج کا زمانہ دورِ جدید ہے۔ عصرِ حاضر میں میں تو شاعر کی بیوی یہ غلطی کبھی سرانجام نہیں دے سکتی کیونکہ وہ جانتی ہے کہ

بیوی نے تنگ آ کے جو چھوڑ دیا شاعر
بنگلہ و گاڑی و بیلنس ہے ندارد

اب اس مسئلہ کی بنیاد کو تلاش کرنے کی سعی کرتے ہیں کہ اصل میں اس بیماری کا آغاز ہوتا کہاں سے ہے۔ اچھا خاصا مناسب وضع قطع کا شخص شاعر شاعر سا کیوں لگنے لگ جاتا ہے۔ کہاں سے اور کس محفل سے اور کیسے اس بیماری کے جراثیم حملہ آور ہوتے ہیں کہ جو آپ کو شاعر بننے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ تو جناب شاعری کے جراثیم دو طرح سے ایک عام سے شخص کے اندر سرائیت کر کے اسے شاعر بنا دیتے ہیں۔

۱۔ شاعرانہ وراثت (شاعر ابن شاعر)

یہ وہ مثبت جراثیم ہوتے ہیں جن سے ایک ''متاثرہ'' شخص پختہ شاعری کرتا ہے، یعنی پختہ شاعر بنتا ہے یعنی وہ وزن، عروض، بحر، قافیہ و ردیف وغیرہ میں وراثتی پختگی اپنی پیدائش کے ساتھ ہی لے کر آتا ہے یعنی شکاری کا بیٹا شکاری۔ اس قسم کے شاعر کو ''بحر'' کے علوم کے لئے کسی عمیق بحر میں غوطہ زن ہونے کی چنداں ضرورت نہیں پڑتی بلکہ ان کے اندر ہی ایک وراثتی بحرِ بیکراں موجزن ہو جاتا ہے۔ اسے بس اس بحر میں غوطہ زن ہونے کی ضرورت ہوتی ہے۔ وزن میں بھی وزن ہونے کے لئے بھی انہیں کسی بڑے ''لحیم شحیم'' شاعر کے وزن اُٹھانے کی ضرورت درپیش نہیں آتی کہ یہ اسکیل اسے گھر سے ہی میسر ہوتا ہے۔

۲۔ مشاعرانہ جراثیم یا مشاعرانہ وراثت

ایسے جراثیم عموماً اور خصوصاً کسی مشاعرہ سے آپ کے دماغ میں سرائیت کر جاتے ہیں جب آپ کو کسی مشاعرہ مین نبہ نفسِ نفیس جانے کا اتفاق ہو اور اوپر سے کوئی اور شخص اساتذہ شعرائے کرام کی موجودگی میں اپنے آپ کو سخن گو خیال کرتے ہوئے پوری کی پوری بے وزن غزل دیدہ دلیری سے پڑھ دے اور وہ بھی اس اعتماد کے ساتھ کہ سامعین اسے ''دادِ سخن'' سے بھی نوازیں تو پھر میرے جیسے بندے کا دل بھی افتخار عارف کے اس شعر کے مصداق کراُٹھتا ہے کہ اگر [یہ ''تو پھر'' میں کیوں نہیں۔

جیسے سب لکھتے رہتے ہیں غزلیں نظمیں گیت
ویسے لکھ لکھ کر انبار لگا سکتا تھا میں

فی زمانہ شعراء حضرات کی جو اقسام دریافت ہو سکی ہیں وہ درج ذیل ہیں۔

۱۔ سرقہ شاعر
۲۔ برقعہ شاعر
۳۔ دُم چھلا شاعر
۴۔ موقع پرست
اور
۵۔ مشاہرانہ شاعر

۱۔ سرقہ شاعر

کسی اور کی شاعرانی صلاحیت کو اپنا حق خیال کرنے والے افراد سرقہ شاعر کہلاتے ہیں۔ ایسے شاعر ہرگز چور نہیں بلکہ سینہ زور واقع ہوتے ہیں۔ زر ان کی جیب اور ایوارڈ ہاتھ میں ہوتے ہیں۔ سرقہ شاعر دھن دولت ہی نہیں، دو ایک پختہ شاعر بھی اپنی پاکٹ میں رکھتے ہیں، جو بوقتِ مشاعرہ ان کے کام آتے ہیں اور اپنا دام بڑھاتے ہیں۔ اس لئے کہ ''جیب زدہ'' شاعر کی ضرورت ثروت اور سرقہ شاعر کی تمنا ایوارڈ، شہرت اور عالمی مشاعرہ مقصود ہوتی

پیری میں سب سے بُرا حال ان کا ہو جاتا ہے، جن کے ذہناں ماؤف ہو جائیں۔ بھول چوک تو سب سینچ ہوتے، پکّی ضدّی پن، ہٹ دھرمی اور ایک بات کو پکڑ کو بیٹھے تو اُس کیچ پیچھے۔ اخیر پو آدمیاں کی پہچان بھی نئیں۔ گذر گئے سووالوں کو یاد کر کو رورئیں اور ہے سووالوں کو گذر گئے سمجھ روئیں۔ کاں ہے سوئیں معلوم، پُرانے گھراں کی یاد۔ بستر پو پڑے ہوئے مِٹ مِٹ دیکھ رئیں۔ کھائے سو یاد نئیں کھائے۔ سو یاد، بستر چ فارغ۔

پیری از افسر آرموری

ہے۔ سونے پہ سہاگہ یہ کہ کبھی کبھار تو اُنہیں ''عالمی ایوارڈ'' سے بھی ''نواز'' دیا جاتا ہے۔ کیوں نہ نوازا جائے، بھئی حکومت ہی نوازنے والوں کے ہاتھ میں ہے۔

۲۔ برقعہ شاعر

سرقہ اور برقعہ شاعر لازم و ملزوم خیال کئے جاتے ہیں اس لئے کہ سرقہ شاعروں کو برقعہ شاعروں کی ''پشت پناہی'' حاصل ہوتی ہے کہ سرقہ شاعر جو بھی کلام اور سخن نوازی فرماتے ہیں وہ برقعہ شاعروں کی پشت اور پناہ میں رہ کر ہی کرتے ہیں۔ اگر برقعہ شاعر سرقہ شاعروں کو ''مواد'' مہیا کرنا چھوڑ دیں تو اُن کی حالت اُن لوگوں جیسی ہو جائے جن کی Beach چوراہے میں ہوتی ہے۔

۳۔ دُم چھلا شاعر

لفظ دُم چھلا سے آپ سب ضرور متعارف ہوں گے مگر دُم چھلا شاعر سے شاعر سے آپ شائد آپ پہلی مرتبہ متعارف ہو رہے ہوں۔ اس سے میری مراد وہ شاعر یا سخن گو ہیں جن کا کام حکیم صاحب کے تلمیذِ خاص کی طرح جزدان اُٹھائے رکھنا، پڑیا باندھنے دوا دارو کرنے اور خدمت کے ماسوا کچھ نہیں ہوتا۔ دُم چھلا شاعروں کا منصب بھی محض شاعروں کی خدمت، ان کا سامان اُٹھانا اور سامان فراہم کرنا ہوتا ہے۔ اس خدمت کے عیوض کسی مشاعرے میں شرکت کا موقع تلاش کرنا ہوتا ہے (راضی برضا سپانسر)۔

میرا ایک دوست گزشتہ ایک دہائی سے شاعروں کی خدمت اور مشاعروں کی ترتیب و تنظیم میں مصروفِ عمل ہے کہ شائد کبھی بہ نفسِ نفیس اسے بھی کسی مشاعرہ میں غزل پڑھنے کا موقع فراہم ہو جائے جو وہ اپنے تایا شاعر سے لکھوا کر لایا ہے۔

۴۔ موقع پرست شاعر

تفصیل سے قبل ایک واقعہ یاد آ گیا کہ ہاسٹل لائف میں میرا ایک دوست ہمیشہ دال چاول اس وجہ سے کھاتا تھا کہ دکاندار سے ایک دفعہ غلطی سے مرغ کی بوٹی بھی آ گئی تھی۔ اسی موقع کی تلاش میں اس نے دو سال دال چاول ہی کھائے مگر دوسری بوٹی ندارد، ایسے ہی ایک بار حلوائی کی دکان پر ایک بچہ ''شوکیس'' میں رکھی رنگ برنگی مٹھائیوں کو بڑی دیر سے غور سے تکے جا رہا تھا، دکاندار نے جھلا کے پوچھا ''اوئے تم کیا چاہتے ہو؟'' تو بچہ معصومیت سے بولا ''ایک موقع!''

ایسے ہی موقع پرست شاعر نہ کوئی موقع ہاتھ سے جانے دیتے ہیں اور نہ ہی کوئی مشاعرہ۔ موقع اور مشاعرہ کی ایسے تاک لگائے رہتے ہیں جیسے ٹام جیری کے انتظار میں۔ موقع پرست شاعروں کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہونے کی بناء پر پختہ شاعروں کی فصل ناپیدسی ہوتی نظر آتی ہے ؂

ہیں لوگ مگر چیدہ چیدہ

۵۔ مشاہرانہ شاعر

شعراء کی یہ قسم شاعری اور مشاعرہ پر اِتنی توجہ مرکوز نہیں کرتی جتنی مشاہرہ پر۔ ایسے شاعر اپنی شاعری کو passion نہیں بلکہ profession خیال کرتے ہیں اور پروفیشن کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ پہلے دام پھر کام۔

کبھی ایسے شعراء دال میں ''روڑ'' کے برابر تھے۔ اب تو سب کچھ روڑ ہی روڑ ہے، دال تو خال خال نظر آتی ہے۔

درج ذیل اقسام سے کن کو کون سا جراثیم کہاں سے دستیاب ہوا اور وہ کون سی شاعرانہ بیماری (غزل، نظم، ہائیکو، ترویج، قطعات، فکاہیہ) میں مبتلا ہوا، اس کی تشخیص کا لٹمس پیپر ایک عدد بین الاقوامی مشاعرہ ہے کہ جس میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا اور بہت سے شعرائے کرام تو ہو سکتا ہے کہ پانی پانی ہو جائیں۔

آخر میں ایک درخواست کہ اِس مضمون میں استعمال ہونے والے نشتروں کے معنی و مفہوم اور اطلاق کے کسی بھی شاعر سے مطابقت کو اتفاقیہ خیال کیا جائے اور دل پر نہ لیا جائے کیونکہ یہ بہت سوں کی رازداری کا معاملہ ہے۔

نورم خان

پیاری ساسُو ماں

گزشتہ روز ایک وحشت ناک خبر یہ آئی کہ اس بار برطانوی پولیس نے ہماری ایک روایتی ساس نصیباں بی بی کو صرف اس بات پر دھر لیا ہے کہ اُنھوں نے اپنی تین بہوؤں کو چودہ سال تک رام اور سیتا کی طرح ''بن باس'' یعنی مغربی معاشرے کے مطابق ''گھر باس'' پر مجبور کیا۔ مطلب یہ کہ انہوں نے اس دوران اُن پر نہ صرف کڑی نگرانی رکھی بلکہ گھر سے باہر نکلنے پر بھی مکمل پابندی لگادی۔ اس طرح کی حرکتیں اگر طالبان کرتے تو کسی کو کوئی گلہ نہ ہوتا کہ اب سب ان باتوں کے عادی ہو چکے ہیں مگر ایک عورت دوسری عورتوں کے ساتھ ایسی حرکتیں کرے تو گوروں کا چکرانا لازمی تھا۔ شاید اسی لئے ایک ساس کی جانب سے، جو بہر حال ایک عورت ہوتی ہے، اس قسم کی حرکت گوروں کو ہضم نہیں ہوئی اور اُنھوں نے لندن کے مقامی ججوں سے مل ملا کر انہیں بہوؤں کے ساتھ چودہ سالہ زیادتی کے بدلے سات سال کی سزا دلوا دی۔ اس اندوہناک واقعہ پر ہمارے نستعلیق قسم کے دانشور ایک بار پھر بھڑک اٹھے ہیں اور ہر طرف شور برپا ہے کہ گوروں نے ایک بار پھر ہماری تہذیب وثقافت اور رسم و رواج پر حملہ کیا ہے۔

اللہ خیر کرے۔ ابھی ہم یہاں نصیبو لعل کو ہی بھگت رہے تھے کہ وہاں نصیباں بی بی اپنے نصیبوں کو روتی جیل پہنچ گئیں۔ تاہم ہمارے خیال میں گوروں نے ان کے ساتھ پھر بھی پچاس فیصدی رعایت کی ہے کہ چودہ سالہ زیادتیوں کے بدلے صرف سات سال کی سزا دلوائی۔ اگر انہیں ہماری روایتی ساس اور رسم و رواج کے بارے میں پتہ ہوتا تو شاید یہ آدھی سزا بھی معاف ہو جاتی۔ سو اس کالم کے توسط سے ہم نے ان گوروں کو سمجھانے کا بیڑا اٹھایا ہے کہ ''شاید کہ اتر جائے تیرے دل میں میری بات''۔ تو جناب سب سے پہلے سمجھنے والی بات یہ ہے کہ ساس اور Sauce میں قدر مشترک یہ ہے کہ روایتی تیکھے پن کے باوجود ایک آدمی نما داماد ان دونوں سے کبھی بدمزا نہیں ہوتا۔ ساس اور بہو سے زیادہ ساس اور داماد کا رشتہ اٹوٹ ہوتا ہے۔ اسی لئے ہم جیسے کسی فلسفی شوہر کا قول ہے کہ ماں اور بیٹے کے رشتے میں کسی اچانک کھٹ پٹ سے تو بدمزگی پیدا ہو سکتی ہے مگر ساس اور داماد کا رشتہ ایسا پائیدار ہوتا ہے کہ مثبت اور منفی ہر طرح کے حالات میں قائم ودائم رہتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ''ساس'' اور ''داماد'' کو آپ سیدھی طرف سے پڑھیں یا الٹی طرف سے، ہر دو صورت میں ساس، ساس رہتی ہے

اور داماد، داماد۔

وجہ بھی صاف ظاہر ہے کہ اپنی چہیتی بیٹی کسی کے پلے باندھنے سے پہلے ہی غریب ساس اپنے داماد پر واری واری جانے کا آغاز کرتی ہے تو پھر یہ سلسلہ قبر میں اترنے تک برقرار رہتا ہے۔ بھلے داماد جی دن کو آئیں یا آدھی رات کو، پیاری ''ساسو ماں'' اپنی پیاری نیند کی قربانی دے کر اسی وقت رسوئی (کچن) کا رخ کرتی ہے اور محلے والے حیران ہوتے ہیں کہ اتنی رات کو اتنے مزیدار کھانوں کی اشتہا انگیز خوشبو کس گھر سے اور کیوں آرہی ہے؟ اسکے باوجود بیچاری ساس کا دل دھڑ کتا رہتا ہے کہ اللہ نہ کرے کہ نیم خوابی کی حالت میں نمک مرچ کی کمی یا زیادتی داماد کا موڈ خراب کردے۔

لیکن یہ ستی ساوتری ''ساسو ماں'' اس بے وقت کی مداخلت اور کچی نیند سے اٹھائے جانے پر طبیعت کی گرانی کا سارا بوجھ بہت دیر تک نہیں اٹھائے رکھتی۔ دو چار گھنٹوں کے بعد صبح ہو جاتی ہے جب غریب بہو اپنے میاں کو دفتر بھیجنے کی تیاریوں کے سلسلے میں اپنے کمرے سے باہر آتی ہے تو اسی وقت اسے احساس ہو جاتا ہے کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ خدا خیر کرے کہ ''ساسو جی'' کے قہر کا سامنا بڑے سے بڑے پھنے خاں کے بس کی بات نہیں تو ایک عام عورت کا، جسے گھر والے ''بہو'' اور دنیا والے صنفِ نازک کے نام سے پکارتے ہیں، ذکر ہی بے معنی ہے......سو بیٹے کے نکلتے ہی اس میٹھی میٹھی ''ساسو ماں'' کی ساری شیرینی رخصت ہو جاتی ہے اور اس کی توپ کا رخ غریب بہو کی طرف ہو جاتا ہے اور رات بھر کی اپنی بے آرامی کا سارا نزلہ بیچاری بہو پر گرنا شروع ہو جاتا ہے۔ اس گولہ باری کو دیکھ کر یقین ہی نہیں آتا کہ یہ وہی ساسو ماں ہیں جو رات کو اپنے داماد پر دیدہ و دل فرشِ راہ کئے بیٹھی تھیں۔ یہ ہے ساس کے دو عجیب و غریب روپ کہ اسکی گہرائیوں میں جائیں تو فلسفے اور منطق کی کئی جلدیں تیار ہو جائیں مگر اس پیچ در پیچ رشتے کی گتھیاں پھر بھی نہ سلجھیں۔

برصغیر پاک و ہند میں ہمارے معاشرتی نظام کی بنیاد یہی رشتۂ خاص ہے جو لڑکی اور لڑکے والوں کو ایسے بندھن میں جکڑے ہوئے ہے جسکی بہترین مثال مشہور سمندری جانور آکٹوپس (ہشت پا) سے دی جاسکتی ہے۔ اس آٹھ پاؤں والے جانور کی طرح ساس بھی نہ صرف اپنی بلکہ بہو کی فیملی کو بھی بحسن و خوبی کنٹرول کرتی ہے۔ ویسے کچھ لوگ اسے عام گھریلو زبان میں

انگلیوں پر نچانا بھی کہتے ہیں۔ لیکن ذرا غور کریں تو ان غیر معمولی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے اصل محرک بہو کی ذات ہی ہوتی ہے۔ یعنی جب تک بہو قابل اعتراض عادات و اطوار کا مظاہرہ نہ کرے ''ساسوماں'' کا ایکشن بھی پھیکا پھیکا سا لگتا ہے۔ لیکن ہماری اکثر خواتین اس معاملے میں غیر معمولی صلاحیتوں کی مالک ہوتی ہیں۔ کوئی بہو کیسی ہی ستی ساوتری یا نیک پروین ہو اور اپنے اخلاق، مسکراہٹ اور فرمانبرداری کے مذموم ہتھیاروں سے ساسوماں کے حربوں کو ناکام بنانے پر تلی ہو، ایک نہ ایک دن ضرور اس پھندے میں گرفتار ہوتی ہے۔ یہ وہی مبارک دن ہوتا ہے جب ساسوماں کے منہ سے بہو کو اپنے خاندان کے ایسے ایسے فضول رازوں کا پتہ چلتا ہے جو اسکے گھر والے بچپن سے جوانی تک اس سے چھپائے رکھنے میں کامیاب رہے تھے۔

اس نیک پروین کی بشری کمزوریوں میں صبح دیر سے کمرے سے برآمد ہونا (دن بھر پوری فیملی کی خدمت گزارنے کے بعد کوئی کتنے سویرے اٹھ سکتا ہے؟)، دیوروں کو صبح سکول یا کالج جاتے وقت ناشتے کا انتظار کروانا، وقت پر کھانا تیار نہ کرنا اور تیار شدہ کھانا بدمزہ ہونا ایک عام سی بات ہے۔ اسکے علاوہ نمک مرچ کی زیادتیوں سے نندوں کو ویسے ہی مرچیں لگی ہوتی ہیں اور وہ بھابی کے خلاف شکایتوں کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتیں۔ گویا یہ سلسلہ رات گئے جاری رہتا ہے۔ گاہے اسکے کانوں میں ساسو جی اور نندوں کی یہ آوازیں بھی آتی رہتی ہیں کہ ''پہلے سارا کام کتنے سکون سے وقت پر ہو جایا کرتا تھا مگر اب تو سارا گھر اوپر نیچے ہو رہا ہے''...... اور وہ غریب دل ہی دل میں سوچتی ہے کہ اس سے پہلے گھر کا سارا کام جنات کر جاتے تھے؟ قانونِ قدرت بھی عجیب ہے۔ کچھ یہی شکایتیں اس کی بڑی نند کے سسرال والوں کو بھی ہے۔ جب بھی اس کی نند کے سسرال سے شکایتوں کا پٹارہ لئے کوئی نازل ہوتا ہے، اس کا مرجھایا ہوا چہرہ کھِل اٹھتا ہے۔ وہ بظاہر مہمانوں کی خاطر مدارات میں لگی ہوتی ہے اور مگر اسکے کان ایک جدید ریڈار کی طرح انکی کھسر پھسر بخوبی کیچ کر رہے ہوتے ہیں۔ تب اس کا جی چاہتا ہے کہ اس ستم ظریفی پر زور زور سے قہقہے لگائے۔

عزیز قارئین ...... یہ سارا سلسلہ سینکڑوں سال سے ہمارے یہاں جاری ہے۔ اسلئے ''ساس بھی کبھی بہو تھی'' کی سینکڑوں قسطیں چلنے کے بعد بھی یہ مسئلہ ہنوز حل طلب ہے کہ ساس ظالم ہوتی ہے یا وہ بہو جو ساس بننے کے اچھے دنوں کے انتظار میں تمام زیادتیوں کو خوشی خوشی جھیل لیتی ہے؟ دنیا کے بہت سے ملکوں میں بہوؤں کے انتخاب کے لئے عجیب و غریب آزمائشیں ہیں۔ مثلاً کچھ افریقی تو یہ تک دیکھتے ہیں کہ بہو میں اتنا دم بھی ہے یا نہیں کہ وہ خود بھی کما کر کھائے اور میاں کو بھی کھلائے۔ کچھ بہوؤں کو جسمانی فٹنس ثابت کرنے کے لئے مختلف تکلیف دہ آزمائشوں سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔ لیکن ان عجیب و غریب رسومات پر کسی ملک کو کوئی اعتراض نہیں۔ لے دے کہ ایک ہم ہیں کہ ہماری ہر بات میں کیڑے نکالے جاتے ہیں۔ لیکن ان گوروں کو یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے کہ ہم اپنے علاقوں میں انگی بمباری برداشت کر سکتے ہیں، اپنے جوہری اثاثوں کے خلاف بیان بازیوں پر بھی چپ رہ سکتے ہیں، حتیٰ کہ ڈاکٹر عافیہ اور پاکستانی طلباء پر مظالم کی خبروں پر بھی ہمیں کوئی خاص تکلیف نہیں۔ لیکن ایک روایتی ساس کے خلاف برطانوی حکومت کی تازہ کارروائی پر شدید احتجاج کرتے ہیں۔

وہ شاید نہیں جانتے کہ انہوں نے کسی ساس کو للکارا ہے۔ ہماری ''ساسیں'' وہ شمشیر آب دار ہیں کہ اگر ایک بار نیام سے باہر نکل آئیں تو بیس کروڑ آبادی کے اس ملک کا ایک ایک غیور داماد باہر نکل آئے گا۔ اس لئے برطانوی حکومت جتنی جلدی یہ سزا منسوخ کر کے انہیں باعزت بری کر دے، بہتر ہے۔ ورنہ خدشہ ہے کہ ہماری تہذیب و ثقافت پر اس تازہ مداخلت سے عالمی امن بھی خطرے میں پڑ سکتا ہے۔ کیونکہ ہم جیسے شوہر یہ کبھی برداشت نہیں کر سکتے کہ ان کی پیاری ''ساسوماں'' جو تازہ ہوا کھانے کے بہانے اکثر ان کے گھر آیا کرتی ہیں، اتنی ذرا سی بات پر سات سال جیل کی ہوا کھانے پہنچ جائیں!

سید عارف مصطفیٰ

کیا آپ کو انگریزی آتی ہے؟

کیا آپ کو انگریزی آتی ہے؟ انگریزی بولنا ہم کو ہمیشہ سے ہی مرغوب ہے لیکن انگریزوں ہی کو ہماری یہ رغبت مطلوب نہیں۔ جب بھی ہم نے کسی گورے کے سامنے اپنی انگریزی کا دبستان کھولا، وہ مانو بہرہ سا ہوگیا۔ اپنی طویل گفتگو میں ہم نے جتنے بھی سوالات کیئے، کسی ایک کا جواب بھی اُس سے بن نہ پایا، محض کندھے اچکا کر ہی رہ گیا یا عجب سے ہونق انداز میں دونوں بازو اٹھا کر لہرا کر آگے بڑھ گیا۔ اس روکھے پھیکے فرنگی طرزِ عمل سے ہمارے لسانی جذبات مجروح ضرور ہوئے لیکن ہر بار ولولوں کی آنچ اور بڑھتی سی محسوس ہوئی اور ہم نے نئے عزم سے ڈکشنری کو جھاڑ کر کتابوں کے ڈھیر سے برآمد کیا اور اس میں مزید نئے الفاظ رٹنے میں جت گئے۔

شروع شروع میں تو جزبات اس درجہ گرمائے سے رہتے تھے کہ ایسے ہر واقعے کے بعد کم از کم اس دن ڈکشنری ہی دیر تک شریک بستر رہتی تھی اور کبھی ہم ڈکشنری پہ تو کبھی ڈکشنری ہم پر پڑی دکھتی تھی۔ ڈکشنری کے ساتھ ہماری یہ "ہم بستری" رنگ نہ لائے ایسا کبھی نہیں ہوا اور ہم نے اگلے ہی دن کتنے کو نئے سیکھے الفاظ کی باڑھ پہ دھر لیا اور حسبِ توفیق سر کھجانے بلکہ سب کچھ کھجانے پہ مجبور کر دیا

لیکن۔۔۔ لیکن اس سے ہرگز یہ نہ سمجھا جائے کہ ہمیں انگریزی سے کوئی شکایت نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ زمانہ طالبعلمی میں بس یہی اک مضمون ایسا تھا کہ جس نے ہم سے کبھی وفا نہ کی، کتنا ہی اور کیسا ہی رٹا گھوٹا کیوں نہ لگایا ہو لیکن جب بھی کبھی اس کے ٹیچر نے آناً فاناً برسرِ عام کوئی سوال کیا وہ ہمارے سر سے پتھر کی مانند ٹن سا ٹکرایا، پھر دفعتاً دماغ میں جیسے دھواں سا بھر گیا اور آنکھوں میں گویا اندھیرا سا چھا گیا اور کندھے اور منہ ایک ہی ساتھ لٹک گئے۔ ثابت ہوا کہ انگریز بڑی بے وفا قوم ہے، اتنی بے وفا کہ اس کی زبان

تک ہم دیسیوں کا یوں اچانک ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔ ساتھ تو ہمارا کہنے کو عمرے کے دوران کئی بار عربی زبان نے بھی چھوڑا لیکن مخاطب یعنی بندۂ عربی نے ہمیں نہیں چھوڑا اور مفہوم سونگھ کر ہی دم لیا۔ ۱۹۹۷ء میں عمرے پہ جاتے ہوئے ہم حفظِ ماتقدم کے طور پر عربی کے چالیس پچاس ایسے جملے رٹ کر گئے تھے کہ جو اکسیر کی مانند تھے اور روزمرہ امور بھگتانے کے لئے ''حل المشکلات'' کا درجہ رکھتے تھے۔ یہ جملے ہم نے چند دن میں فرفر عربی بولنے پہ قادر کرنے والی ان کتابوں سے سیکھے تھے کہ جن کا مرکز ریگل چوک پہ ہے اور وہاں تو گویا کئی عربی جامعات اس کے فٹ پاتھ پہ علم کی عاجزی کے پیغام کے ساتھ لیٹی ہوئی ہیں اور جن سے رجوع کے لئے خود بھی عاجزی کے ساتھ پینتالیس کے زاویئے سے زمین کی طرف جھکنا پڑتا ہے۔ اِن جامعات سے برق رفتار وایمر جینسی تحصیلِ علم کے بعد سعودیہ میں عمرے کے اس قیام کے دوران یہ افتاد کئی بار ٹوٹی کہ ٹیکسی کو اشارے سے بلایا وہ تو فوراً آ گئی لیکن ساتھ ہی عربی فٹافٹ چلی گئی۔۔۔ وہاں ایک مسئلہ یہ بھی تھا کہ متبادل کے طور پہ صحیح انگریزی میں گویائی، غلط عربی بولنے سے زیادہ ناگوار نتائج کا سبب بن جاتی تھی، جس کا اندازہ ڈرائیور کے چہرے پہ نمودار ہونے والے فوری وسخت مہیب اثرات سے ہوجاتا تھا، تاہم ہمارے حلیئے اور بشرے کی رعایت سے کئی بار خود ڈرائیور نے ہی ترس کھایا اور رواں اُردو میں ہمارے مدّعا کی بابت معلوم کر کے ہمیں فقیرانہ سی ممنونیت کا موقع دیا۔

انگریزی کی بابت ہم یہ بصد ناز یہ اعتراف کرتے ہیں کہ یہ ہماری کمزوری ہے لیکن یہ کمزوری اس ذمرے میں نہیں آتی کہ کوئی روایتی ماہرِ کمزوریات دور کر سکے ورنہ تو ڈکشنری کو بستر اور اعصاب پہ یوں سوار کیوں کرتے، آن کی آن کسی ماہر بیگ ماہر سے مل لیتے اور ''عین وقت'' کی شرمندگی سے کیوں نہ بچ جاتے کہ ان کا ہنر تو خاص ایسے ہی مواقع پہ خصوصی طور پہ کام آنا بتایا جاتا ہے، اگر ایسا ہوتا تو پھر تو یہ محض دس پندرہ پھکیوں ہی کی مار ہوتی۔۔۔ لیکن کمزور انگریزی کا ٹیڑھا پن یوں آسانی سے نہیں جاتا۔ منہ ٹیڑھا کئے بغیر یہ کجی و لاغری پورے طور سے نہیں جاتی۔ مزید استحکام مقصود ہو تو منہ کے ساتھ ساتھ مزاج کو بھی خاصا ٹیڑھا کرنا پڑتا ہے، شنید ہے کہ سیدھے منہ انگریزی بولنے میں دو شدید نقصانات ہیں۔ ایک تو لوگ آپ کو پیلے اسکول سے فارغ التحصیل باور کرنے لگتے ہیں دوسرے یہ سمجھتے ہیں کہ کسی کی دھمکی ملنے کے بعد آپ منہ سنبھال کر بات کرنے کے لئے مجبور ہیں۔۔۔ بعضے لوگوں کے مطابق مستند انگریزی بولنے کے لئے قمیض اور کوٹ کے کالر بھی کھڑے کرنے پڑتے ہیں اور اس میں البتہ وضعداری و شرافت بار ہا بیٹھ بیٹھ جاتی ہے۔

یہ نہیں کہ انگریزی کے عشق میں ایک ہم ہی مبتلا ہیں، اس کے متاثرین ہر طبقہ عمر اور ہر کالونی میں پڑے ملتے ہیں۔ کسے شوق نہیں کہ ''اپ ٹو ڈیٹ'' کہلائے حتیٰ کہ وہ بھی جو شطرنج کی بساط کے دونوں طرف ہر وقت مستقل آنکھیں موندے ملتے ہیں اور وہ بھی کہ جو گلی محلے کے دو کمرے کے اسکولوں میں پھٹی نیکر اور پھٹی آواز میں ''ہمپٹی ڈمپٹی'' الاپتے سنائی دیتے ہیں۔۔۔ ایسے اسکولوں میں بالعموم اسکولوں سے بھاگے ہوئے لیچڑ ٹیچر کے روپ میں اسٹاف روم میں پڑے ملتے ہیں، یہ لوگ اسکول سے عام طور پہ اس لئے بھاگتے ہیں کیونکہ انہیں آگے کسی اسکول میں ٹیچر کی اسامی خالی دِکھتی ہے۔

انگریزی سے ہماری قومی الفت یونہی بے سبب نہیں۔۔۔ دراصل یہ اس کی آسانیاں پیدا کرنے کی غیر معمولی صلاحیت کے باعث ہے۔ انگریزی بولنا کوئی کھل جا سم سم جیسا منتر ہے کہ یہاں

تعلقات

احمد ندیم قاسمی پندرہ بیس سال پہلے تک بالوں میں خضاب نہیں لگاتے تھے، بعد میں اُنہوں نے باقاعدگی سے بالوں کو رنگنا شروع کر دیا۔ پچھلے دنوں ریڈیو اسٹیشن کی ایک تقریب میں کئی معروف لوگ اکٹھے ہوئے۔ سب قاسمی صاحب سے اپنے تعلقات کے عرصے کا ذکر کر رہے تھے۔ احمد راہی نے بڑے فخر سے کہا ''ہمارے تو قاسمی صاحب سے تب کے تعلقات ہیں، جب اُن کے بال سفید ہوا کرتے تھے۔''

قلمکاروں کی خوش کلامیاں از نارنگ ساقی

ہر پھاٹک پاٹوں پاٹ کھل جاتا ہے۔۔۔کسی لمبی سی قطار میں کھڑے لوگوں میں سے کوئی انگریزی بول کر ''ایکسکیوزمی'' کا ورد کرتے ہوئے ایک ہی کوشش میں باآسانی دو چار لوگوں کو آن کی آن پھلانگ سکتا ہے اور کوششوں کا یہ سلسلہ جاری رکھ کر بڑی تیزی سے کاؤنٹر تک رسائی پالیتا ہے اور ان پھلانگے گئے لوگوں کو برا بھی نہیں لگتا بلکہ وہ الٹا خود کو پھلانگے جانے کے اعزاز پر شکر گزار ہو جاتے ہیں۔۔۔دیسی زبان منہ میں رکھ کر ایسی کوشش ذرا بھی کی جائے تو نجانے کیوں ہر ایک ایسی زبان کھینچ لینے کی اپنی سی ایک ''ٹرائی'' ضرور کرتا ہے۔

مشاہدے سے پتا چلتا ہے کہ انگریزی فلمیں دیکھنے والے کنوارے خود بخود گھر پڑے پڑے بھی بہت لائق و قابل سمجھے جاتے ہیں اور جلد ہی چندے آفتاب سی من کی مراد پاتے ہیں، جبکہ شادی شدہ ہوں تو نیا گھر بسنے کی نوبت آجاتی ہے کیونکہ وہ گھر میں پڑی چمڑی کا فلم کی سفید چمڑی سے موازنہ کرنے لگتے ہیں جس کا نتیجہ عام طور پہ تبدیلی کے حق میں ہی نکلتا ہے۔۔۔
انگریزی کے معاملے میں برصغیر کی حد تک یہ بڑے گر کی بات ہے کہ انگریزی صرف اس کے سامنے بولنی چاہیئے کہ جسے بولنی نہ آتی ہو ورنہ آپ کو اس کی بات کا جواب بھی دینا پڑ جائے گا جس میں آپ کے لئے ''آبیل مجھے مار'' جیسا معاملہ بھی چھپا ہو سکتا ہے اور ویسے بھی آپ نے انگریزی کسی مباحثے کے لئے نہیں محض اس لئے سیکھی ہے کہ دوسرا خشوع و خضوع سے صرف سنے، اگر وہ بھی آگے سے منہ کو آئے تو کیا خاک فائدہ انگریزی بولنے کا؟

انگریزی بولنے کے فوائد میں سے ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہے کہ بندہ پیدائشی لفنگا ہو تب بھی دائم معزز دکھائی دینے لگتا ہے اور اُس کو کسی بھی جگہ کہیں سے کرسی حاضر کر کے بیٹھنے کو پیش کر دی جاتی ہے۔اس کا اعتبار محلے کے دکانداروں پر اس حد تک قائم و راسخ ہو جاتا ہے کہ اس کو اُدھار مانگنے کی نوبت ہی نہیں آتی۔ دکاندار سامان پیک کروا کر سپردگی کے بعد بس اتنا ہی پوچھتا ہے کہ ''پیسے ابھی دیں گے یا بعد میں لے لوں''۔۔۔اہمیت کا تو یہ حال درپیش رہتا ہے کہ قومی و بلدیاتی انتخابات کے موقعوں پہ علاقے کی ہر کارنر میٹنگ میں امیدوار اپنے پہلو میں بڑے چاؤ سے بٹھاتا ہے اور اگر پہلے سے کوئی اس جگہ پہ قابض ہوا بیٹھا ہو تو اسے بڑے تاؤ سے اٹھاتا ہے۔

جہاں تک ہماری قوم کا اپنی زبان سے محبت کا تعلق ہے تو وہ دائم ''آنکھ مٹکے'' کی شوقین نار کا سا ہے جہاں گھر والوں کی نظر چوکی اور وہاں کسی سے آنکھ لڑی، دنیا جہاں کی زبانوں سے آناً فاناً مراسم استوار کر لیتے ہیں۔بس اپنی زبان کو بقول یوسفی ''گالی گنتی و گانے کے لئے ''خاص'' وقف کر رکھا ہے۔گانے کے معاملے میں تو عجیب یتیمانہ سا رویہ ہے۔چپکے چپکے لتا و مکیش کو سنتے ہیں مگر کھلم کھلا انگریزی گانے لگا کر تھرکتے ہیں حالانکہ اُردو گیت سنگیت بہت ریاض سے معیار کو پہنچتا ہے جبکہ انگریزی گانے کا معاملہ بہت ہی سہل ہے، برف کا ٹھنڈا پانی جسم پہ ڈال کر منہ سے فوراً جو بھی بول نکالئے وہ آپ ہی آپ انگریزی گانے میں بدل جائے گا۔اُدھر اہل مغرب میں جو انگریز نہیں جیسے فرانس، ہالینڈ یا جرمنی وغیرہ تو کہتے ہیں کہ کہ اُن کا اپنی اپنی زبانوں سے محبت کا یہ عالم ہے کہ اگر وہاں کوئی انگریز سڑک پہ گر پڑے تو لاکھ انگریزی میں کتنی ہی ٹیاؤں ٹیاؤں کرے، کوئی مدد کو نہیں آتا اور یہاں کہیں اگر ایسا ہو جائے تو ہاتھ تھامنے کو ہر طرف سے اِتنے لوگ بھاگتے آتے ہیں کہ وہ انگریز ہراساں و بدحواس ہو کر خود ہی دوڑ پڑتا ہے، اگر نہ دوڑے تو کوئی بٹوا تھام لیتا ہے تو کوئی گھڑی اور کوئی جینز۔۔۔ہاں گرنے والی اگر خاتون ہو تو جھٹ گود میں اٹھائے اٹھائے پھرتے ہیں اور وہی سڑک اِدھر اُدھر سے چار پانچ بار کراس کر جاتے ہیں۔

مگر چند لوگ ایسے بھی ہیں کہ جنہیں اس زبان سے کوئی مرعوبیت نہیں اس لئے اربابِ اختیار کو ان کے لئے مرغوبیت نہیں۔ان دوانوں کو اپنی زبان سے عشق کے سوا اور کوئی کام نہیں اور ایسے لوگوں سے باقیوں کو کوئی سروکار نہیں کیونکہ ایسے مجنوں تو کسی کے کام کے نہیں بلکہ اپنے گھر والوں کے کام کے بھی نہیں۔ اُنہیں انگریزی سے کوئی پرخاش ہے تو بس اتنی کہ وہ ہم کو بخش کیوں نہیں دیتی اور بطور ایک آزاد و خود مختار قوم ہمیں پنپنے کیوں نہیں دیتی۔

ڈاکٹر عابد علی

میری بیوی بھی بائیو میٹرک تصدیق کرتی ہے

بیوی جسے انگلش میں وائف، عربی میں زوجہ، سندھی میں زال، ڈینش میں کون، فرنچ میں فیم، جرمن میں ایہی فراؤ، اٹیلین میں موگلی، پولش میں زونا، پورٹوگیزی میں اسپوسا، سویڈش میں فرو، ہندی میں لگائی، ازبک میں رفیقہ، فارسی میں زن، ٹگالو میں اساوا اور ملائی میں استری کہا جاتا ہے، اس نام سے پہچانی جانے والی شخصیت سے کون واقف نہیں۔

میرے ایک دوست کی بیوی کا نام ثروت ہے۔ مذاق میں، میں اسے صاحبِ ثروت کہہ کر پکارتا ہوں۔ کہتے ہیں اپنی غلطی پر ہنسنا آپ کی زندگی کو لمبا کر دیتا ہے جبکہ اپنی بیوی کی غلطی پر ہنسنا آپ کی زندگی کو مختصر کر دیتا ہے۔

بیوی کو تھپڑ مار کر شوہر بولا، آدمی اسی کو مارتا ہے جس سے وہ پیار کرتا ہے۔ بیوی نے جواباً دو تھپڑ اور چار لاتیں رسید کر کے کہا ”آپ کیا سمجھتے ہیں کہ میں آپ سے پیار نہیں کرتی؟“

سنا ہے، تھپڑ کھانے سے گالوں پر فنگر پرنٹس بھی اُبھر آتے ہیں۔

بقول شاعر ؎

مولانا عبدالماجد دریا آبادی نے تحریر فرمایا ہے:۔

سنہ غالباً ۱۹۱۸ء یا ۱۹۱۹ء ہے، اکبرالہٰ آبادی لکھنؤ میں امین الدولہ پارک کے ایک بالا خانے میں مقیم ہیں۔ایک صاحب جو بی اے، ایل ایل بی اور اُس وقت منصف کے عہدے پر ممتاز تھے، صاحبانہ مسلک و خیال کے ساتھ ملنے تشریف لائے، گفتگو کچھ عورتوں کی تعلیم، آزادی پر چلی، اکبر نے کہا ''ہم تو اپنے زمانے میں آزاد خیالی کا امام سرسیّد احمد خان (سرسیّد) کو سمجھتے تھے لیکن عورتوں کی آزادی اُنہیں بھی سخت ناپسند تھی۔''

وہ صاحب جیسے بھرے بیٹھے تھے، بات کاٹ کر بولے ''سرسیّد کی رائے اس معاملے میں سخت قابلِ ترمیم ہے۔''

اکبر برجستہ بول اُٹھے ''جی کیوں نہیں، ایک اِسی معاملے میں کیا، خدا معلوم کتنے معاملوں میں اُن کی رائے قابلِ ترمیم ہے، وہ خود قابلِ ترمیم تھے، دیکھئے ناں زمانے نے اُنہیں کی ترمیم کردی، وہ گزر گئے اور اُن کی بجائے آپ کو پیدا کردیا۔''

جما کر روز گالوں پر مرے دو چار چھ تھپڑ
وہ میرے شوہرانہ خوف کی تحقیق کرتی ہے
مرے گالوں پہ چھپ جاتے ہیں خود فنگر پرنٹ اُسکے
مری بیوی بھی بایو میٹرک تصدیق کرتی ہے

ہمارے معاشرے میں لوگ بیویوں کو اس قدر سر پر سوار کرلیتے ہیں کہ پھر انہیں پشیمانی اٹھانی پڑتی ہے۔ مرد دو (۲) قسم کے پائے جاتے ہیں، ایک وہ جو بیوی سے ڈرتے ہیں، دوسرے وہ جن کی بیویاں اُن سے نہیں ڈرتیں۔ گھر سے باہر پولیس آفیسر شیر بنا پھرتا ہے لیکن گھر میں آنے کے بعد بھیگی بلی بن جاتا ہے۔ اپنے گھر میں گم صم زندگی گزارنے والے گھر سے باہر ایک اچھے مقرر، شاعر یا ادیب ہوتے ہیں اور وہ افراد جن کو بیگم کی جلی کٹی باتیں سننا پڑتی ہیں، وہ عموماً نقاد ضرور بن جاتے ہیں۔

مارک ٹوئین سے کسی نے پوچھا کہ آپ اتنا اچھا مزاح کس طرح تخلیق کرلیتے ہیں؟ تو اس نے کہا کہ میں جو کچھ لکھتا ہوں اپنی بیگم کو ضرور پڑھاتا ہوں۔ جن فقروں پر وہ زور زور سے قہقہے لگاتی ہے میں اُنہیں اپنے مضمون سے نکال دیتا ہوں اور جن کو پڑھ کر وہ بالکل نہیں ہنستی انہیں رہنے دیتا ہوں کیونکہ ان جملوں پر ساری دنیا ہنستی ہے۔ اسد جعفری کہتے ہیں:

اے مری بیگم نہ تو میری خودی کمزور کر
یہ شریفوں کا محلّہ ہے نہ اتنا شور کر
شب کے پرتسکین لمحوں میں نہ مجھ کو بور کر
اِس سعادت مند شوہر کو نہ یوں اگنور کر

ہمارے معاشرے میں لوگ بیویوں کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں:

پولیس: سب مجھ سے ڈرتے ہیں اور میں بیوی سے۔

موچی: میں جوتوں کی مرمت کرتا ہوں اور بیوی میری۔

اداکار: میں ڈراموں میں اداکاری کرتا ہوں اور بیوی حقیقت میں۔

ٹیچر: میں اسکول میں مسلسل بولتا ہوں اور گھر میں صرف سنتا ہوں۔

کرکٹر: میں گراؤنڈ میں چوکے چھکے مارتا ہوں اور بیوی گھر میں۔

افسر: میں دفتر میں افسر ہوں اور گھر میں ادنیٰ سا ملازم۔

جج: میں کورٹ میں انصاف دیتا ہوں اور گھر میں انصاف طلب کرتا ہوں۔

ناظم: میں علاقے میں خوشحالی لاتا ہوں اور گھر میں اپنی بدحالی پر روتا ہوں۔

وزیر: میں سارے ملک کا دورہ کرتا ہوں اور گھر میں مجھے دورے پڑتے ہیں۔

سیاستدان: میں عوام سے جھوٹے وعدے کرتا ہوں اور بیوی سے کھری کھری سنتا ہوں۔

مصنف: میں صرف خیالات بُنتا ہوں۔

کہتے ہیں دنیا میں مردوں کو زندہ رہنے کے لئے تین چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے'' دولت، بیوی اور بیوی سے چھٹکارا۔'' دنیا کے تمام شوہر تاج محل بنوا سکتے ہیں بشرطیکہ ان کی بیویاں مرنے کیلئے تیار ہوجائیں۔ دنیا میں اکثر بری چیزوں کا نام ''ب'' سے شروع ہوتا ہے مثلاً بدروح، بدمزاج، بدتمیز، بے شرم، بے حیا وغیرہ وغیرہ۔

نیاز محمود

عورت اور خاموشی

عورتوں سے متعلق جہاں بہت سی باتیں مشہور ہیں وہاں ایک بات یہ بھی کہی جاتی ہے کہ عورتوں کی ڈکشنری میں لفظ ''خاموشی'' نہیں ہے یعنی ان کے پاس بولنے کے لیے الفاظ کی کمی نہیں۔ آپ سن سن کے تھک جائیں گے لیکن ان کی بیٹری کبھی لو ہوگی ہی نہیں۔ کبھی کبھی خواہش جاگتی ہے کہ کاش ایسی بیٹری اپنے موبائل میں بھی ہوتی۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ بولنے سے چارج بھی ہوتی ہے۔۔۔ نہیں یقین تو اک ذرا کوشش کر کے دیکھ لیں، چارج کی سپیڈ بڑھانی ہو تو کوئی ایسی بات کر دیں جس پہ بیگم کو غصہ چڑھے اور اگر سپر چارج کروانا ہو تو آگ لگا کر اگنور کر کے بیٹھ جائیں۔

اچھا تو بات ہم کر رہے تھے خاموشی کی کہ عورتوں اور خاموشی کی آپس میں نہیں بنتی۔ جہاں عورتیں ہوں گی وہاں خاموشی کا تصور ہی ممکن نہیں اور اگر کہیں خاموشی ہو تو سمجھ جائیں کہ دور دور تک عورتوں کا نام و نشان نہیں۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں ؎

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں

شاید عورتوں سے پہلے یہ دنیا پرسکون، خاموش اور بے رنگ تھی. جس طرح ٹی وی پہلے بلیک اینڈ وائٹ ہوا کرتا تھا۔۔۔ پھر عورتیں نازل ہوئیں اور دنیا رنگین ہوگئی۔ جذبات میں طلاطم آئے، زندگی ہنگامہ خیز ہوگئی، شور کا احساس ہو۔۔۔ اور تب سے اب تک یہ سب جاری ہے۔

لیکن کیا واقعی عورت کی ڈکشنری میں لفظ ''خاموشی'' کا کوئی وجود نہیں؟ پچھلے دنوں ایک دوست سے کافی عرصہ بعد ملاقات ہوئی۔ موصوف کو ماشاء اللہ یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس کی سننے اور برداشت کرنے کی صلاحیت بہت زیادہ ہے۔ اگرچہ یہ سب اسے مجبوراً کرنا پڑتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ خاموشی کی مد میں وہ کافی مالدار ثابت ہوئے ہیں۔ یہ بھی آپ مانتے ہوں گے کہ مالدار لوگ کنجوس بھی ہوا کرتے ہیں، اِس لیے مجال ہے جو میرے پاس آتے

ہوئے وہ تھوڑی سے خاموشی اٹھا کے لے آئے۔ آج بھی اپنی عادت سے مجبور فوراً اپنا قصہ لے بیٹھے لیکن آج خلافِ معمول بڑے خوش دکھائی دے رہے تھے کیونکہ اسے خاموشی کا ایک خزانہ ہاتھ لگ گیا تھا۔ مجھے اس پر ترس بھی آ رہا تھا کہ بے چارا اتنی خاموشی کا آخر کرے گا کیا؟ وہ مزے لے لے کے اپنی رُوداد سنا رہا تھا۔

قصہ کچھ یوں تھا کہ کل کسی بات پہ اس کی بیگم اس سے ناراض ہوگئی اور بیگم نے چھپ کا روزہ رکھ لیا۔ شام تک گھر کا موحول انتہائی کشیدہ رہا۔ بیگم کے ماتھے پہ پڑی شکنیں کسی بڑے طوفان کا پتا دے رہی تھیں۔ بچے بھی معاملات کی نزاکت بھانپ گئے تھے اور اشاروں کنایوں سے اک دوسرے کی خبرگیری کر رہے تھے۔ رات ہوگئی اور سب سو گئے لیکن موصوف ایک جانے پہچانے خوف کے باعث سو نہیں پا رہے تھے۔ نہ معلوم کب اور کس وقت آنکھ لگ گئی۔ صبح دیر تک گائے بھینس بھیڑ بکری سب حتیٰ کہ گھوڑے بیچ کر سوتے رہے۔ کہتے ہیں جب صبح آنکھ کھلی تو پہلے تو مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ صبح ہوگئی ہے۔ کمرہ خالی، میرے بیڈ کے علاوہ ہر چیز سے ترتیب اور سلیقہ چھلک رہا تھا۔ گھر میں مکمل معنی خیز خاموشی اور سکون۔ نہانے گیا تو گرم پانی تولیہ صابن کپڑے سب تیار ملے۔ غسل کر کے واپس آیا تو ٹیبل پر ناشتہ پڑا تھا۔ مجھے لگا کوئی غیبی قوت ہے جو سب کر رہی ہے اور بیگم صبح سویرے ہی گھر چھوڑ کر ماں کے ہاں چلی گئی ہے اور بچے بھی ہمیشہ کی طرح ماں کے ساتھ ہی چلے گئے ہیں۔ تھوڑی دیر تو میں فکرمند رہا۔ اگلے ہی لمحے خیال آیا کہ چلو ایک آدھ دن تو آزادی نصیب ہوئی، جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ اگرچہ اس کے بعد کے حالات کیا ہونے ہیں اس کے بارے میں سوچنا ہی جان نکال لینے کے لیے کافی تھا۔ خیر نئی نئی آزادی کے مزے لیتے ہوئے، وہ کہتے ہیں، کہ میں کمرے نکلا تو میری نظر کچن پہ پڑی اور ایک ٹھنڈی آہ لے کے رہ گیا، بیگم کچن میں موجود تھی۔ مجھے اگنور کرتے ہوئے بچوں سے کچھ کہا اور بچے نہایت خاموشی سے میرے پیچھے پیچھے آ کر گاڑی میں بیٹھ گئے۔ میں ان کو سکول پہنچا کے کام پہ چلا گیا اور اب جب دوپہر کے بعد کام سے واپس آیا تو وہی سکون اور خاموشی میری منتظر تھی۔

وہ اپنی کہانی سنا رہا تھا اور مجھے عورتوں کی ڈکشنری کے ضمیمے کا خیال آیا جس کے صفحوں کو پھاڑ کر الگ کر دیا گیا تھا اور ان صفحوں سے رہ گئے ٹکڑوں پر کہیں کہیں لفظ ''خاموشی'' کے ٹوٹے پھوٹے حروف ''شی شی'' کر رہے تھے۔

ضیاء اللہ محسنؔ

مزاحمت

علامہ اقبال کی ''خودی'' سے تو ہم بہت بعد میں واقف ہوئے، لیکن بقول اہلِ خانہ خودداری کے ''جراثیم'' بچپن سے ہی ہمارے اندر وافر مقدار میں پائے جاتے تھے۔ چھوٹے موٹے کام تو کسی کھاتے میں نہیں، اکثر اوقات ہم بڑے مسائل بھی یوں چٹکی بجانے میں حل کرلیا کرتے تھے۔ مثلاً آپ شیر خواری کے زمانے کو ہی لیں۔ جب بھوک لگتی، تو دائیں ہاتھ کا انگوٹھا ہم اپنی مدد آپ کے تحت منہ میں اُڑس لیتے۔ پھر پیٹ بھر کر اسے چوس لیا کرتے۔ تب کہیں جا کے بھوک بندش ہوتی۔ زمانہ فیڈری میں کبھی رونے کی حاجت ہوتی تو اس معاملے میں بھی اپنی مدد آپ کے تحت ہم پھس پھسا منہ کرکے رونے دھونے کا شغل فرمالیتے۔ ہماری چیخ و پکار میں شاعرانہ ردھم نمایاں ہوتا۔ وہ الگ بات کہ رونے کے بعد چپ بھی ہمیں خود ہی ہونا پڑتا تھا۔

لاڈلے تو ہم شروع دن سے ہی تھے۔ قدم قدم چلنا شروع کیا تو ہماری خودارانہ صلاحتیں مزید نکھر کر سامنے آتی گئیں۔ لوگ ہماری اس عادتِ عالیہ کے خوب گرویدہ تھے۔ جی ہاں، ہماری یہ خوبی اب آپ کو بھی ماننا ہی پڑے گی۔ جو نہیں مانے گا اس کے منہ میں۔۔۔اوہ معذرت! وہ تو آپ بچپن میں کھاتے ہی رہے ہوں گے۔ لیجیے! اب آپ مسکرا بھی رہے ہیں۔ خیر کوئی بات نہیں، ضرور آپ اس ''خاک سار'' کی بات کا مطلب غلط سمجھے ہیں۔ وہ کیا کہا شاعر نے کہ

زندگی خاک نہ تھی، خاک اُڑاتے گزری

اُڑانے اور کھانے کے لیے ضروری نہیں کہ صرف خاک ہی ہو۔ بل کہ منہ میں خا۔۔۔خالص گھی شکر بھی تو ہوسکتا ہے ناں۔ مگر کیا کریں جی، ان دونوں چیزوں کی قیمتیں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں جب کہ خاک ہمیشہ سے ''اَن مول'' رہی ہے۔

بات گھوم کے کہاں چلی گئی۔ ہمارے بچپن کا ذکر ہو رہا تھا، تو سنیے جناب! ابا دولت نے ذرا ہوش سنبھالنا شروع کیا تو ایک ہیبت ناک قسم کی جیل سے واسطہ پڑ گیا۔ لوگ شاید اسے ''اسکول'' کے نام سے یاد کر رہے تھے۔ اس زمانے میں بھی ہم کمال کے خوددار تو تھے، لیکن ''شوخے'' بہر حال کبھی نہ رہے تھے۔ پھر ایک دن نہ جانے کیا ہوا۔ ہم ساتویں جماعت میں تھے تو استاد صاحب نے

کلاس میں مقابلہ خوش خطی کا اعلان کروادیا۔ ہم سات آٹھ لڑکوں نے بڑھ چڑھ کر اس مقابلے میں حصہ لیا۔ ایک گھنٹے بعد جب نتیجہ نکلا تو ہم پہلے نمبر پر تھے۔ چناں چہ جیت کی خوشی میں ہم لگے ڈینگیں اور شوخیاں مارنے۔۔۔اس دوران ہم پھول کر کُپا بن چکے تھے۔ لیکن یہ کیا؟ کچھ ہی دیر میں ہمارے شوخ غبارے سے ہوا نکلنے لگی۔ کیوں کہ استاد صاحب نے بطور ''انعام'' ہمیں اپنی اسائن منٹ کا پلندہ پکڑا دیا تھا۔ ''لو بچہ جی! اسے بہت اچھا اور پیارا سا کر کے لکھنا ہے۔ یاد رہے، بس دو تین دن میں لکھ کر ہمارے حوالے کر دینا۔'' اس جملے کے ساتھ ہی ہماری شوخی فوراً پر لگا کر اُڑ گئی۔ ہم ہونقوں کی طرح استاد صاحب کا منہ تکنے لگے۔ جب کہ کلاس کے دیگر دوست کھی کھی کی دبی ہنسی میں ہمارا مذاق اُڑانے لگے۔

محمود رضوی صاحب ہمارے اسکول میں تاریخ کے استاد ہوا کرتے تھے۔ ان کی عمر یہی کوئی ساٹھ پینسٹھ کے لگ بھگ ہوگی۔ علامہ اقبال سے انہیں خاص عقیدت تھی۔ ان کے سینکڑوں اشعار رضوی صاحب نے زبانی یاد کر رکھے تھے۔ ایک دن کسی بات پہ غصے میں آئے تو کلاس کے سب سے نالائق بچے اقبال حیدر کو مفت میں پھینٹی لگا ڈالی۔ ساتھ ساتھ رضوی صاحب اسے سخت سست بھی کہے جا رہے تھے: '' حرام خور کہیں کے...... تمھاری عمر میں علامہ اقبال نے شعر کہنا شروع کر دیے تھے۔ مگر تم لوگ ۔۔۔ ہونہہ۔۔۔ نکھٹو کہیں کے'' سر رضوی نے غضب ناک لہجے میں اسے گھور کر کہا تو اقبال حیدر پٹائی لگنے کے بعد یک ٹک سر کو دیکھنے لگا، جیسے زبانِ حال سے کہہ رہا ہو کہ سر اگر میری عمر میں علامہ اقبال نے شعر کہنا شروع کر دیے تھے تو آپ کی عمر وہ فوت بھی تو ہو گئے تھے ناں۔۔۔ ہونہہ۔''

بے چارا اقبال حیدر اپنا جسم سہلاتا ہوا ہمارے پاس آ گیا۔ چوں کہ ہم کلاس کے مانیٹر تھے، سو اس نے روہانسے لہجے میں ہم سے التجا کی ''ارے بھائی! اس روز روز کی پھینٹی سے میری جان چھڑواؤ۔ تمھاری بڑی مہربانی ہوگی......''

''ہاں اقبال۔۔۔ واقعی! میرے پاس ایک تجویز ہے۔ اس طرح تم روزانہ کی مار سے بھی بچ سکتے ہو اور تمام اساتذہ کے دل میں تمھاری قدر بھی بڑھ جائے گی۔۔'' ہم نے کچھ سوچتے ہوئے کہا تو اقبال حیدر اچھل پڑا ''ارے واہ۔۔۔ بہت خوب، جلدی بتاؤ یار!''

''دیکھو بھئی! تم علامہ اقبال کے ہم نام ہو، میں تمھیں ان کے بچپن کا ایک دلچسپ واقعہ سناتا ہوں، سنو۔۔۔'' ہم نے اسے متوجہ کرتے ہوئے کہا'' علامہ اقبال اس وقت چھوٹے بچے تھے۔ ایک دن وہ اسکول میں تاخیر سے پہنچے تو استاد نے دیر سے آنے کی وجہ پوچھی۔ اقبالؒ بڑے حاضر دماغ تھے۔ فوراً بولے: سر، اقبال (بلندی) تو ہمیشہ دیر سے ہی آتا ہے۔ اُن کے اس جواب سے استاد صاحب بڑے خوش اور حیران ہوئے تھے۔ اقبال یار! اگر تم بھی اگر یہی طریقہ اپناؤ تو بہت عزت بن سکتی تمھاری بھی۔۔۔'' ہم نے اقبال حیدر سے کہا تو وہ سر ہلا کر رہ گیا۔

اگلے دن خلافِ معمول واقعی اقبال دو پیریڈ دیر سے کلاس میں پہنچا تو اسے دیکھتے ہی رضوی صاحب کا پارہ ہائی ہو گیا۔

''اقبال! تم آج اتنی دیر سے کیوں آئے ہو۔؟'' سر نے تقریباً چیختے ہوئے پوچھا تو اقبال مسکرا دیا۔

''سر! اقبال ہمیشہ دیر سے ہی آتا ہے۔'' ابھی اس کے منہ سے یہ جملہ نکلا ہی تھا کہ ایک زبردست گھونسہ اس کے سر پہ لگا۔ یہیں پہ بس نہیں! رضوی صاحب اب اپنے ہاتھ میں ''مولا بخش'' پکڑے پوری طرح اقبال حیدر پہ پل پڑے تھے۔ اس کی چیخ و پکار اور ہائے وائے کے ساتھ کلاس میں دبی ہنسی کی آوازیں آنے لگیں۔ اِدھر ہم اس منصوبے کی ناکامی پہ حیران ہوئے جا رہے تھے۔ ہمیں اقبال کی غضب ناک نگاہوں سے ڈر لگ رہا تھا۔ ''لگتا ہے اب اس کے ہاتھوں ہماری خیر نہیں۔'' ہم نے اپنے تئیں سوچا اور چھٹی کی گھنٹی بجتے ہی بستہ اپنی بغل میں دبا کر گھر کو بھاگ لیے۔

سال دو سال بعد ہمارے علمی قد کاٹھ نے اُٹھان بھری تو ہم ہائی اسکول کو سدھار گئے۔ ایک روز ہم اسکول سے واپس آئے تو امی جان نے فوری طور پر ہمیں خبردار کیا ''سٹور روم میں بھڑوں

نے اپنا گھر بنا رکھا ہے۔ وہاں جانا ہو تو احتیاط کا دامن تھام لینا۔"
ہمیں سٹور روم میں جانے کی فی الوقت ضرورت تو نہ تھی، لیکن خود کو تیس مار خاں سمجھتے ہوئے ہم نے بھڑوں کے چھتے کا جائزہ لینا ضروری سمجھا۔ اصل میں اپنے ہم عمر بچوں پہ ہم اپنی بہادری کا رعب جمانا چاہ رہے تھے۔ اب ہاتھ میں ایک عدد چھوٹی سی چھڑی اور منہ پہ رومال لیے ہم اسٹور روم میں داخل ہوئے۔ ہماری عقابی نگاہیں جو اس وقت نقابی نگاہیں بنی ہوئی تھیں، اِدھر اُدھر کا جائزہ لیتے ہوئے بھڑوں کا چھتہ تلاش کر رہی تھیں۔ اچانک بھیں بھیں کے "راگ" نے ہماری سماعتوں پہ دستک دی۔ اس سے قبل کہ ہم کچھ سمجھتے، پیلے رنگ کے چند حملہ آور ہمارے چہرے پہ موجود رومال کی دیواریں پھلانگ کر ہماری آنکھوں تک پہنچ گئے۔ بھڑوں کو عین ناک تلے دیکھ کر ہم ہڑبڑا اٹھے، لیکن اب دیر ہو چکی تھی۔ ظالموں نے دیوانہ وار ہمارے منہ کو چومنا شروع کر دیا۔ اس سے آگے کیا ہوا، مت پوچھیے۔ ویسے ہمارے "چہرہ مبارک" کا دیدار کرنے کے بعد لوگوں کو مشکل پیش آ رہی تھی کہ نقشہ آسٹریلیا کا ہے یا روس کا۔

آئندہ ہم نے شوخی مارنے سے توبہ کرنے کی کوشش تو کی، لیکن کالج کی زندگی نے موقع نہ دیا۔ قصہ مختصر کہ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ملازمت کے لئے ہم پاکستان کے سب سے بڑے آئس کریم پلانٹ پہ جا پہنچے، پلانٹ کیا تھا؟ ایک طلسمی دنیا تھی، جہاں ہر شے جدید، خودکار اور اجلی اجلی سی تھی۔ چکا چوند دیواریں، شیشے سے بنے فرش، بڑے بڑے شفاف ہال، دیو ہیکل مشینوں کی دھیمی دھیمی رُوں رُوں، ۱۸ ڈگری سینٹی گریڈ میں مہکتی خوشبوئیں، اوپر نیچے، دائیں بائیں کنویئرز پہ چلتے آئس کریم کپ، چاکلیٹ اور رنگ برنگی چیزیں، مشینوں پہ روبورٹ کی مانند کام کرتے لوگ، ہر چیز میں نظر آتی نفاست، گویا یہ جگہ کسی اور ہی دنیا کا حصہ لگ رہی تھی۔

یہ جدید کارخانہ ہمارے گھر سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ ہم انٹرویو کے لئے کمرے میں داخل ہونے لگے تو دروازہ خود بخود کھلتا چلا گیا۔ یہ دیکھ کر ہمیں بچپن میں پڑھی ہوئی "کھل جا سم سم" والی کہانی یاد آ گئی، انٹرویو کے دوران یوں محسوس ہوا جیسے ہم کسی خلائی شٹل میں بیٹھے چاند کی جانب محوِ پرواز ہوں۔ سامنے والی دیوار زراڈیجیٹل طرز کی تھی۔ اس دیوار سے آنے والی بارعب آواز سے ہم گھبرا گئے، ہمارا حال چال پوچھا گیا، پھر سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

سوالات کے جواب دیتے ہوئے ہم اپنی "دیسی انگریزی" کا سہارا لینے کا سوچ رہے تھے، پھر خیال گزرا کہ چھوٹا سا منہ ہے، کوئی سپیلنگ پھنس گیا تو مشکل ہوگی۔ بہر حال اس طلسمی ماحول میں ایک بار تو ہمیں یوں لگا کہ ابھی عمرو عیار یا کسی جادوگر سے بھی ہمارا واسطہ پڑنے والا ہے۔ بصد شکر کہ ایسا کچھ نہیں ہوا، کمرے سے باہر آ کر راہداریوں میں لگے واش بیسن سے ہم نے ہاتھ دھونا چاہے تو پانی خود بخود کھلتا چلا گیا، چوں کہ ایسے ماحول سے ہمارا یہ پہلی بار سامنا ہوا تھا، چناں چہ ڈر کے مارے ہم اِدھر اُدھر تکنے لگے۔

مختصر یہ کہ دو دن بعد ہمیں ایک عدد نامہ موصول ہوا جس میں بطور "کوالٹی کنٹرول آفیسر" ہماری تعیناتی کے احکامات تھے۔ چناں چہ خوشی خوشی ہم اپنی ڈیوٹی پہ جا پہنچے۔ کنٹرول روم کی لیب انتہائی وسیع اور جدید ترین مشنری سے آراستہ و پیراستہ تھی۔ لیکن ایک بات حیران کن کہ وہاں ہم تو تھے مگر ہماری کرسی نہ تھی۔ انتظامیہ پہ ہمیں تھوڑا بہت غصہ تو آیا، پھر سوچا کہ کرسی نہیں تو کیا ہوا، ہم ان کے جوڑوں میں ہی بیٹھ جاتے ہیں۔ لیکن پھر صبر ہی کرنا پڑا۔ کرسی کے آنے تک ہمیں آیت الکرسی کا سہارا لیتے رہے۔ لیب میں ایک ہفتہ تک ہمیں تربیتی مراحل سے گزارا گیا۔ اب ہم بھی روبوٹ طرز کا لباس پہنے مشینوں پہ بننے والی آئس کریم کا جائزہ لینے لگے۔ اپنی مرضی سے ہم کسی بھی مشین سے کپ، کون یا بڑا پیکٹ اُٹھاتے اس کا معیار اور مقدار ڈیجیٹل میٹر پہ جانچنے کے بعد اگر کوئی کمی یا خامی ہوتی تو متعلقہ مشین کے آفیسر کو وارننگ جاری کرتے، چوں کہ اس کام میں ہمارا ابھی پہلا دن تھا تو ایک انجانا سا خوف اور جھجک لاحق ہونا عام سی بات تھی۔ ہماری نشست اختتام پذیر ہوئی تو ایک لڑکا دوڑتا ہوا ہمارے آیا "سر......وہ......وہ سب لوگ کہہ رہے کہ

حکومتِ حجاز نے ایک برطانوی کمپنی کو "حجاز لائن" تعمیر کرنے کا ٹھیکہ دیا۔ تجویز یہ تھی کہ جدہ سے مکہ معظمہ تک ریل کا اہتمام کرکے حاجیوں کی سفری مشکلات کا خاتمہ کردیا جائے۔ اکبرالہ آبادی تک جب یہ خبر پہنچی تو اُن کی جولانئ طبع نہ رُک سکی، فرمانے لگے۔

مکے تک ریل کا سامان ہوا چاہتا ہے
اب تو انجن بھی مسلمان ہوا چاہتا ہے

آپ کو استقبالیہ دینا ہے۔ اس لئے آپ کو تھوڑی دیر رکنا پڑے گا۔"

لڑکے کی بات سن کر ہم رک گیا۔ معلوم ہوا کہ یہاں کام کرنے والے پرانے لوگ ہر نئے آنے والے کی سیوا کرتے ہیں۔ اس میں آفیسر اور ورکر بھی لوگ شامل ہوتے ہیں۔ سیوا کے نام پہ ہمارا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ ہماری سوچ کا آوارہ اُلو ادھر ادھر بھٹکنے لگا۔ ایک سے بڑھ کر ایک خیال ہمارے دماغ پہ دستک دینے لگا کہ آخر سیوا میں ہوگا کیا؟ صرف چائے؟ یا دیگر لوازمات بھی۔۔۔ رات کا کھانا ہوگا یا پھل میلہ بھی لگے گا۔؟ بہت خوب۔۔۔ ارے بھئی، اتنی عزت افزائی؟ واہ بھئی واہ۔۔۔ مزہ آگیا"

ابھی ہم "شوخے" سے بنے انہیں سوچوں میں گم تھے کہ قریب سے ایک آواز آئی "پہلے ہم لوگ مشینوں کے بارے میں مزید جان لیں اس کے بعد دیگر کام کریں گے۔"

یہ تجویز ہمیں بھی پسند آئی، چناں چہ ہم ایک آفیسر اور کچھ ورکرز کے ساتھ ایک جہازی سائز کی مشین کے پاس جا کر کھڑے ہوگئے۔ اب ہمیں مشین کے متعلق بتایا جانے لگا، کچھ ہی دیر میں ہمیں محسوس ہوا کہ سب لوگ ایک طرف ہوچکے ہیں، جبکہ اپنی جگہ پہ کھڑے ہم مشین کا یوں جائزہ لے رہے تھے جیسے کوئی ماہر معائنہ کار ہو۔ پلانٹ کی بلند و بالا چھت کے نیچے سے بے شمار پائپ نصب تھے، جن میں دودھ اور مکسچر کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جاتا تھا۔ ہم چالیس فٹ لمبی اس مشین کے قریب کھڑے دلچسپی کے ساتھ اسے دیکھ رہے تھے، عین اسی وقت ہمارے اوپر سے گزرنے والے بڑے سائز کے آئس کریم مکسچر والے پائپ کا جوڑ کھل گیا، بس پھر کیا تھا، سارا مکسچر کسی نیاگرا آبشار کی مانند ہمارے اوپر گرنے لگا۔ ایک لمبی سی جھرجھری لے کر ہم ایک طرف ہوئے، مگر وہاں بھی ہمارے ساتھ یہی کچھ ہوا۔ یخ بستہ آئس کریم مکسچر نے ہمیں ڈراؤنی شکل والا بھوت سا بنا ڈالا تھا۔ اس ناگہانی آفت سے گھبرا کر ہم ایک طرف بھاگنے لگے تو فرش کی پھسلن نے ہمیں آڑے ہاتھوں لیا۔ دھڑام کے شور کے ساتھ ہی قہقہوں کی آوازیں گونجنے لگیں

"ہاہاہا"۔۔۔ زوردار ہنسی کی آوازوں کے ساتھ ساتھ ٹھنڈا ٹھار آئس کریم مکسچر بھی ہمارے اوپر بارش کی طرح برس رہا تھا۔

اٹھارہ ڈگری سینٹی جیسا سرد ماحول، اوپر سے ٹھنڈی ٹھار آئس کریم۔۔۔ چچ چچ چچ۔۔۔ اب جو طویل قہقہوں کی آوازیں بلند ہوئیں تو ہم ساری بات سمجھ گئے۔

مابدولت ٹھنڈ میں بھیگی بلی بنے دانت بجا رہے تھے۔ ٹھٹھرتے ہوئے ہم نے ادھر ادھر دیکھا مگر کسی کو بھی اس سراپا آئس کریم بنے مظلوم پہ ترس نہ آیا۔ یہ کارستانی ان "خدمت کاروں" کی تھی جو ہماری سیوا کے لئے بے چین تھے۔ دراصل ہمیں سیوا کے نام پہ بے وقوف بنایا گیا تھا۔ ہمیں مشین کے پاس کھڑا کرکے اوپر سے پائپ کا جوڑ کھول دیا گیا یوں ہم "آئس کریم زدہ" سے ہو کر اپنی بے وقوفی اور لوگوں کی شرارت پہ دانت پیس رہے تھے۔

گویا نئے آفس میں ہماری آمد کی ساری شوخی اب قدرے ٹھنڈی پڑ گئی تھی۔ کوئی اور ہوتا تو ہم مزاحمت بھی کرتے، لیکن یہاں تو ہم کچھ کر بھی نہیں سکتے تھے۔۔۔ خیر ارد گرد کھڑے کچھ لوگوں کو ہماری حالت پہ ترس آیا، اُن میں سے کچھ نے آگے بڑھ کر ہمیں سہارا دیا جب کہ باقی لوگ دانت نکالتے ہوئے ہلکی آواز میں نعرہ لگانے لگے۔ "کر سیوا۔۔۔ تے۔۔۔ کھا میوا" ساتھ ساتھ یہ لوگ آئس کریم مکسچر کے لئے رکھے گئے میوہ جات کی تھیلیوں میں سے میوے نکال کر کھانے لگے۔

بس وہ دن اور آج کا دن۔۔۔ اللہ معاف کرے۔ شاید ہی کبھی ہماری طبیعت میں کسی کو شوخیانہ پن نظر آیا ہو۔

کائنات بشیر

سُرمہ میرا نزالا

السّلامُ علیکم مہربان، قدردان تے پائی جان سُرمہ میرا نزالا آنکھوں میں جس نے ڈالا

جیون ہوا اجالا ہے کوئی نظر والا

اکھیاں والیو، اکھیاں بڑی نیامت نے۔۔۔۔تو اس نیامت کی حفاظت بھی کرونا۔۔!

اگر آنکھوں میں درد ہو، سوجن ہو، آنکھ بوٹی کی طرح لال ہو اور اس سے موسلا دھار برسات ہو، آنکھوں میں لگرے شکرے ہوں۔ لگے کسی نے مٹھی بھر ریت آپ کی آنکھ میں پھینک دی ہو۔ قریب کی چیز دور نظر آئے اور دور کی چیز کے لیے آنکھوں کے آگے تمبو تن جائے۔ موتیا شوتیا اترنے کو ہو تو فکر کی بات تو ہے نا۔ لیکن سوہنیو، موتیاں والیو میرے ہوتے ہوئے بالکل بھی گھبرانے شھرانے کی بات نہیں ورنہ لکھ لعنت میری زندگی پہ، میرے پاس ہے ایک جادوئی ٹوٹکہ، خاندانی نسخہ، جو پرم پراسے ہوتا میرے دادا تک پہنچا اور وہاں سے ہتھو ہتھ میرے تک پہنچ گیا ہے جسے میں اپنے جیسے بھین بھراو؟ں تک پہنچا رہا ہوں۔ بوت ای ستا تے بہت ہی ارزاں، بوت ای کم دا تے بوت ای کاردا۔۔ پیسے نہ ہونے کے برابر، بس اتنے کہ میرا کرایہ نکل پڑے۔ آخر کو گھار وی جانا ہے۔ اور گھر والی کو گھار میں رہنے، کھانے پینے اور سونے جاگنے کا کرایہ بھی دینا ہے اور بچوں کو جگا ٹیکس۔۔۔۔!ایک شیشی کی قیمت میرے مہربان، قدردان، صرف بیس روپے بیس روپے۔۔اپنی اپنی جیبوں میں ہتھ ڈال کے تے بٹوے ٹٹول لو کہ کہیں مت تو نہیں ماری گئی، میرا مطبل جیب تو نہیں کٹ گئی اور ساتھ ای سُرمے کے پیسے وی نکال لو۔ میں ابھی باری باری آپ تک پہنچتا ہوں اور اس نیاب سرمہ ڈالنے کے لیے سرمہ کی سلائی آپ کو بالکل مفت فری چونگے میں ملے گی۔ دل چاہئے تو میرا ابھرا ایک سلائی بیشک ابھی ڈال لو۔ دوسری سلائی گھار جا کر ڈال لینا۔۔ آرام نہ آئے تو پکی گارانٹی دیتا ہوں سرمہ واپس کر جانا اور پیسے آن کر لے جانا۔

یہ وہ مہربان ہیں جو بس اور کوچ میں اچانک ڈاکٹر کی طرح چھاپہ مارتے کہ کہیں لوگ آشوبِ چشم کے ساتھ سفر تو نہیں کر رہے۔ موقع بھی اچھا اور ماحول بھی۔۔۔ادھر بس دوسری بس سے

ریس لگا رہی ہوتی ہے اور یہ آن کر استاد کی طرح کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ہر طرح کے چھوٹے بڑے موٹے پتلے طالب علم ان کے سامنے موجود ہوتے ہیں۔ تعلیم بالغاں کی کلاس شروع ہو جاتی ہے۔ مائیں بچوں کے ایک دو ٹکا کے چپ کرا دیتی ہیں اور ہمہ تن گوش ہو جاتی ہیں۔ بس میں مسافر سرمہ خریدیں یا نہ خریدیں لیکن ان کا لیکچر ضرور دھیان سے سنتے ضرور ہیں۔ آخر جانکاری میں اضافہ تو بہر حال ہوتا ہی ہے کہ آنکھوں کو مزید اور کون کون سی بیماریاں ہو سکتی ہیں۔

ویسے بائی دی وے۔۔۔ سُرمہ کا استعمال کبھی اِتنا عام ہوا کرتا تھا کہ عورتوں کے علاوہ مرد بھی بے تکلفی سے اِس کا استعمال کر لیا کرتے تھے۔ سُرمہ سلائی گھروں کے علاوہ دیہاتوں کی بیشتر مساجد میں کسی ستون کے ساتھ لٹکتی ہوئی نظر آتی تھی۔ اسے لگانا سنت ہے جسے پورا کرنے کے لیے مالاکنڈ سمیت خیبر پختونخوا کے دیہاتی علاقوں میں اب بھی سرمہ سلائی کا استعمال موجود ہے۔ گو سرمہ کی فروخت کے لئے ''بنجاری'' کا گلی گلی گھومنا متروک ہو چکا ہے اور اب اس کی خرید و فروخت۔۔ جمعہ بازار یا اتوار بازار۔۔ میں ہوتی ہے۔

سرمے کا دوسرا روپ کاجل ہے جس کی بیوٹیشن اور ماڈل قلوپطرہ تھی۔ جو ''ات خدا داویز'' بڑی سیاستدان مگر تخلیقی عورت تھی جس نے اپنا وقت فضول باتوں، چغلیوں میں ضائع کرنے کی بجائے ایسے شوق میں لگایا کہ عورتوں میں اس کی بلے بلے ہو گئی۔ آج بھی قلوپطرہ کاجل بہت سی آنکھوں کی زینت بنتا ہے۔ اور عام سی آنکھوں کو بھی کجرارے نینوں میں بدل دیتا ہے۔

پہلے وقتوں ہیروئن دوسری عورت کے نینوں کے وار سے ڈر جاتی تھی اور سیاں کو تاکید کرتی،

مار کٹاری مر جانا یہ اکھیاں کسی سے نہ ملانا نا۔۔۔

جواباً سیاں جی کو کہنا پڑتا ڈونٹ وری،

گوری تورے نیناں ہیں جادو بھرے ہم پہ چھپ چھپ جلم کریں

مگر کاجل نے عاشقوں کے لیے سیاپا ہی ڈال دیا،

کجرا محبت والا اکھیوں میں ایسا ڈالا کجرے نے لے لی میری جان، ہائے رے میں تیرے قربان:

ناول، ڈرامے، افسانے کی ہیروئن بھی اس کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ فلم روڈالی میں راج ببر صحرا میں ڈمپل کپاڈیا کے ہاتھوں گھاگر سے پانی پیتے ہوئے بے اختیار اس کی کاجل بھری تیکھی نظروں کا شکار ہو گیا۔ اگر ہیروئن کی آنکھیں صحرا کی طرح خالی، بنجر، اجڑی ہوئی ہوتیں تو ہیرو شائد اس پر محض ایک اچٹتی نظر ڈالتا۔ دوبارہ اس کی طرف دیکھتا بھی نہ، شرمیلا ٹیگور اور ریکھا منہ سے بولیں نہ بولیں لیکن ان کی آنکھیں باتیں کرتی ہیں تو یقیناً اس میں کاجل کا بھی اہم کردار ہوگا۔ سرمہ لگانے سے چھوٹی آنکھیں بڑی دکھائی جا سکتی ہیں اور موٹی آنکھوں میں لگا کر دیدے پھیلائے جا سکتے ہیں۔ ویسے تو یہ خالص زنانہ فیشن ہے مگر کچھ مرد حضرات بھی اسے اپنی آنکھوں میں لگا کر سرمے والی سرکار بن جاتے ہیں۔ دیہی علاقوں میں آج بھی مائیں چھوٹے چھوٹے بچوں کو لٹا کر زبردستی ان کی آنکھوں میں سرمے کی سلائی گھسیڑ دیتی ہیں۔ بچے اس ناگہانی آفت، زبردستی پر روتے رہ جاتے ہیں اور سرمہ بطور احتجاج ان کی آنکھوں سے نکل کر گالوں پر پھیل جاتا ہے اور ماں کا لاڈلا، شہزادہ لگنے کی بجائے بھوت لگنے لگتا ہے۔

ٹی وی مارننگ شو میں جب کوئی ماڈل میک اَپ کے جوہر دکھانے کے لیے لائی جاتی ہے تو بالکل پھیکے شلجم کی طرح نظر آتی ہے۔ پر جیسے ہی اس کی آنکھوں میں کاجل لگا تو قیامت کا آغاز ہونے لگتا ہے۔

سرمہ، کاجل، آئی پنسل، آئی لائنر، اُف خدایا ایک آنکھ اور ہزار ستم۔۔!

پہلی حسینائیں سُرمہ لگاتے ہوئے آنکھ کے باہر ایک لمبی رسی نما لکیر کھینچ لیتی تھیں۔ اللہ جانے کیوں؟ اس سے انھوں نے کس کو باندھنا ہوتا تھا۔۔!

سُرمہ لگانا چونکہ سنت ہے اس لیے یہ کبھی آوٹ آف فیشن نہیں ہو سکتا۔ دادی جان اور نانی ماں کے لیے مکے مدینے کے سرمے کی آج بھی بڑی اہمیت ہے۔ لوگ آب زم زم، کھجوریں،

مسواک کے علاوہ سرمے کی ڈلیاں بھی سعودی عرب سے لا کر تبرک کی طرح تقسیم کرتے ہیں۔ کہتے ہیں ایک عورت کو اپنی زندگی میں سوا من سرمہ استعمال کر کے سنت پوری کرنی چاہیے۔ سنت پوری ہوئی کہ نہیں لیکن آج کی عورت اپنے بیگ میں ایک آئی پنسل ضرور فرض کی طرح رکھتی ہے۔

سُرمہ اور کاجل میں اتنا ہی فرق ہے جتنا لوز پاؤڈر اور کمپیکٹ پاؤڈر میں!

کاجل ایک چھوٹی ڈبیا میں سما جاتا ہے۔ پاندان کی طرح کوئی لمبا چوڑا تام جھام نہیں اٹھانا پڑتا۔ کچھ عورتیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی کی مدد سے بڑی نفاست سے اسے آنکھوں میں سمو لیتی ہیں۔ طریقہ جاننا ہے تو فلم صاحب بی بی اور غلام ملاحظہ فرمائیے۔۔ جس میں مینا کماری نے گیت

پیا ایسو جیا میں سمائے گیو رے
کہ میں تن من کی سدھ بدھ گنوا بیٹھی

گاتے ہوئے جھٹ کاجل کی ڈبیہ کھولی اور پٹ دائیں ہاتھ کی چھنگلی سے اسے آنکھوں میں لگا لیا۔۔ البتہ سرمہ رکھنے کے لیے سرمے دانی کی ضرورت ہمیشہ رہی ہے جہیز میں سوئی سلائی کے ساتھ اس کی بھی جگہ قائم ہے ورنہ ایک طعنہ اس پہ بھی مل سکتا ہے۔ سرمہ دانی کی بڑی ورائیٹی ہے چھوٹے بڑے سائز میں چاندی کی سرمہ دانی، گولڈن سرمہ دانی اور اسے لگانے والی سلائی (سُر مچو) اس میں فری فٹ ہو جاتی ہے۔ تو ہے نا ٹو ان ون چیز۔

ویسے سرمے دانی سے تو اور بھی بہتیرے کام لیے گئے۔ ایک بزرگ نے بچوں کو نئے سال پر پٹاخے چلانے کا مسالا تیار کر کے دیا۔ نیا سال آیا۔ سب رات کے انتظار میں رہے تا کہ جلدی سے پٹاخے وغیرہ چلائے جائیں۔ رات آئی تو بچوں نے سوچا خود ہی یہ مسالا استعمال کر کے پٹاخے چلانے کی کوشش کی جائے۔ پر کیسے؟ ایک عقلِ کل کا مشورہ آیا کہ اسے کسی خالی سرمہ دانی میں ڈال کر آگ دکھائی جائے تو یہ سرمہ دانی سے نکل کر آہستہ آہستہ انار اور پھلجھڑی کی طرح چلے گا۔ چنانچہ سرمہ دانی میں مسالا بھر کر اسے آدھا زمین میں گاڑ دیا گیا۔ اِرد گرد اہلِ محلہ کے قریبی لوگوں کو انار چھوٹتا دیکھنے کی دعوت دی گئی۔ سب آ کر تماشائی بن کر ایک دائرے میں کھڑے ہو گئے۔ شائقین میں سے ایک نے آگے بڑھ کر سرمے دانی کو ماچس کی تیلی جلا کر دکھائی۔۔ بس پھر کیا تھا، ایک دل دہلا دینے والا بم جیسا دھماکہ ہوا۔ سب اپنے کانوں پہ ہاتھ رکھتے ہوئے پیچھے گرنے لگے کیونکہ سرمے دانی درمیان سے پھٹ کر دو حصوں میں تقسیم ہو چکی تھی۔ ایک حصہ زمین میں پیوست رہا اور دوسرا دیکھتے ہی دیکھتے سب کی نظروں کے سامنے ”شرل“ کر کے آسمان کی بلندیوں میں کہیں کھو گیا۔ جو اگلے روز پڑوس کے چوتھے گھر سے برآمد ہوا۔ سو مہربانو! سرمہ دانی میں صرف سرمہ ہی ڈالیے گا اگر آپ اس کے شائق ہیں تو، ورنہ پاندان، اگالدان کی طرح اب یہ بھی عنقا ہوتی جا رہی ہے اور سرمہ میڈیکل، تبرک کی کوئی چیز بنتا جا رہا ہے جسے رات کو لگا لیا جاتا ہے اور دن کو چھپا لیا جاتا ہے۔

رسم و رواج میں اس نے خوب جگہ بنائی۔ گھوڑی چڑھتے دلہا سے بہن اگر باگ پھڑائی لیتی تھی تو بھاوج دیور کی آنکھوں میں سرمہ ڈال کر اپنا نیگ وصول کرتی رہی۔ اس کا وافر استعمال عامل لوگوں نے بھی کر کے محبوب قدموں میں ہونے کا دعویٰ کیا۔۔ (وئی، محبوب صرف ایک سرمے کی مار تھا، ئی) ہاشمی سرمہ والوں نے خوب نام، شہرت اور پیسہ کمایا۔ سرمہ بیچنے والوں نے ببانگِ دہل دعوے کیے کہ آنکھ میں صرف ایک سلائی لگائیے اور جیون کا مزہ پائیے۔ یہ آپ کی جاتی ہوئی نظر کو واپس لے آئے گا۔ اب نظر آئے گی کہ جائے گی اس کے لیے آنکھوں میں سرمہ تو لگانا پڑے گا نا۔ ورنہ جس طرح ماموں کو ٹوپی پہنائی جاتی ہے سیاستدان عوام کی آنکھوں میں بیوقوفی کا سرمہ تو لگا ہی رہے ہیں۔

قصہ کوتاہ۔۔ انگلینڈ میں ایک سُرمہ نامی ریسٹورنٹ موجود ہے۔ اللہ جانے یہاں کے بٹلر سرمہ لگاتے ہیں یا آنے والے گاہکوں کو سرمہ لگایا جاتا ہے۔

بوائز کالج کے پرنسپل نے گرلز کالج کی پرنسپل کو لکھا کہ جلدی کالج لگایا کریں، ہمارے لڑکے لیٹ ہو جاتے ہیں۔

قلم آرائیاں از خادم حسین مجاہد

خادم حسین مجاہد

لافانی جذبہ

گرائینڈر (Grinder) چلنے کی آواز سے چونک کر میں نے چائے نوشی کے نقصانات پر غور کرنا بند کر کے چائے کا کپ میز پر سے اٹھا کے دیکھا تو کرم داد عرف قمار ثانو کو کوئی گانا پیٹتے ہوئے پایا۔ اس کا یہ نام اس کی انہی عادتوں کی وجہ سے رکھا گیا تھا۔ وہ اس سرِ راہ ہوٹل کا ہیڈ ویٹر تھا اور بدقسمتی سے میرا محلے دار چنانچہ وہ میری محویت کو نیم رضا سمجھ کر نہ صرف میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ چکا تھا بلکہ مزید بے تکلفی کا ثبوت دیتے ہوئے میرے سامنے رکھے ہوئے سینڈوچ بھی چکھ رہا تھا جہاں میں بدقسمتی سے ریفریشمنٹ کے لئے آیا تھا۔

"جب کوئی۔۔۔" قمار ثانو نے پھر اسٹارٹ ہونے کی کوشش کی۔

"باپ بگڑ جائے۔۔۔" میں نے فوراً لقمہ دے کر اسے ناک آؤٹ کیا۔

قمار ثانو شاعر کم گلوکار تھا اور عشق اس کا خاندانی مشغلہ تھا محلے کی گھاک مائیوں کی آؤٹ کردہ روایات کے مطابق اس کے خاندان میں شادیاں پشت در پشت براہِ راست قانون کی مدد سے یا بزرگوں کو کوئی زحمت دئے بغیر کرنے کا رواج تھا۔ قمار ثانو اپنا شجرہ کوئی پچاسویں پشت میں مستند و قدیم عاشق مجنوں علیہ ما علیہ سے ملا دیتا تھا اور عوام روکتے رہ جاتے تھے حتیٰ کہ وہ مجنوں کے کنوارا مرنے کو بھی دلیل نہ مانتا تھا۔

''محبت کے دم سے یہ دنیا۔۔۔'' قمار ثانو نے میری خاموشی کا ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہوئے ایک پاکستانی گانے پر حملے کی کوشش کی۔

''حزیں ہے'' میں نے اسے پھر بریک لگاتے ہوئے کہا۔ ''لگتا ہے آج پھر دورہ پڑا ہے پچھلے سینڈلوں کے زخم مندمل ہو گئے ہیں کیا؟'' میں نے اسے پچھلے ہفتے پیش آنے والا جوتوں تھپڑوں اور گالیوں سے بھرپور واقعہ یاد دلا کر پرانے زخم ہرے کرنے کی ناکام کوشش کی۔

''تم اسے دورہ کہتے ہو؟'' اس نے اصلی خفگی سے کہا ''میری جان، خلیل جبران نے کہا ہے کہ محبت انسان کے اندر ایک شریف جذبے کا نام ہے جسے اگر نکال دیا جائے تو انسان اور حیوان میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔''

''لیکن اس کی موجودگی میں بھی تمھاری انسانیت تمھارے کردار کی طرح مشکوک رہے گی۔'' میں نے اس کے حالات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کہا ''تمھاری اطلاع کے لئے عرض ہے کہ محبت کرنے کے بعد عقلمند اور بیوقوف میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔''

''جیسے اب میرے محبت کرنے کے بعد ہم دونوں میں کوئی فرق باقی نہیں رہا تو یہ مساوات ہوئی ناں!'' قمار ثانو ہنسا ''میری جان محبت تو شعور ہے، شراب ہے ریشم ہے، خیاباں ہے، ابال ہے، لوری ہے، تھپکی ہے، نشہ ہے، ہنگامہ ہے۔۔۔''

''شور ہے جلسہ ہے، جلوس ہے، دھماکہ ہے یہی کہنا چاہتے ہو ناں تم!'' میں نے اُس نے بات کاٹتے ہوئے کہا ''تمھارے حالات اتنے ہی بچگانہ ہیں جتنے ٹی وی کے ٹاک شوز، محبت تو بڑی نازک، بڑی شریر، بڑی حاسد ہوتی ہے تنہائی مانگتی ہے، آنسو درد آہیں، رسوائیاں، زخم، ہسپتال کے بل، راہگیروں کے جوتے اور عدالت کی تاریخیں دیا کرتی ہے۔''

''محبت کے غم دنیا بھر کی خوشیوں سے زیادہ اہم ہوتے ہیں'' قمار ثانو نے محفوظ حد سے زیادہ سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

''سچی محبت اپنا اجر آپ ہوتی ہے وہ کوئی صلہ نہیں مانگتی اور ہمیشہ ایثار پر آمادہ رہتی ہے''

پلٹ تیرا دھیان کدھر ہے

آج موسم بڑا خوشگوار تھا، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی، آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ ہلکی ہلکی بونداباندی بھی ہو رہی تھی۔ میں پارک میں بیٹھا یہ خوبصورت موسم انجوائے کر رہا تھا۔ گرما گرم پکوڑے مزے دار چٹنی کے ساتھ، جو کھائے گا، انگلیاں چاٹتا رہ جائے گا۔ ایک پکوڑے والا میرے پاس سے یہ آواز لگاتے گزرا۔ میں نے اُس کو آواز دی اور اس سے ایک پاؤ پکوڑے لے لئے۔ پکوڑے والے نے مجھے پکوڑے ایک نہائت ہی خوبصورت کاغذ میں لپیٹ کر دیئے تھے۔ پکوڑے کھا کر میں کاغذ پر لکھی تحریر پڑھنے لگا تو مجھے پتہ چلا وہ سپریم کورٹ میں پیش کیا جانے والا قطری خط تھا۔

رانا زاہد حسین

''اچھا لیکن کیا تم جانتے ہو کہ یہ دنیا کا وہ خطرناک ترین مرض ہے جس کا علاج عاملِ کامل سنیاسی باوے بھی نہیں کر سکتے؟''

''کون پاگل اس کا علاج کرانا چاہتا ہے'' اس نے استہزائیہ انداز میں کہا ''یہ تو وہ واحد مرض ہے جو مریض کو بے حد پسند ہوتا ہے اور اس کا حملہ ہوتا ہی مریض کا جی چاہتا ہے کہ دنیا بھر کو اس کی اطلاع کر دے۔''

''لیکن مائی ڈیئر بابائے رومانیات حضرت خلیل جبران کا فتویٰ تو یہ ہے کہ محبت کا اعلیٰ ترین اظہار خاموشی سے ہی ممکن ہے'' میں نے اسے مطلع کیا۔

''خاموشی سے کوئی فرق پڑتا'' اس نے خلیل جبران کی بھی نفی کر دی ''ہاجرہ مسرور صاحبہ اعلان کر چکی ہیں کہ محبت جامن کی طرح ہے، چھپا کر بھی کھائی جائے تو منہ کی اوداہٹ چغلی کھا دیتی ہے''

''یار آج کل تو بہار بھی نہیں پھر کیوں بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو؟''

''تم کیا جانو کہ صرف محبت ہی وہ پھول ہے جو ارضِ بہار کا محتاج نہیں اور پتا ہے کنول کہاں کھلتے ہیں؟''

''میٹرنٹی ہوم میں'' میں فوراً بولا۔

''استغفراللہ'' اس کا چہرہ یک دم بجھ گیا ''ارے گھامڑ آنکھ میں کھلتے ہیں۔''

''ابھی تم نے آنکھ میں کنول کھلائے ہیں جیسے کہ وہ کوئی جھیل ہے تھوڑی دیر بعد تم اس میں مچھلیاں پکڑو گے یا اس کے پانی سے بجلی بنا کر کمزور دلوں پر گراؤ گے مگر کان کھول کے سن لو میں ایسا ہرگز نہ ہونے دوں گا۔''

''مچھلیاں تو میں پکڑ ہی چکا ہوں اور وہ بھی پیار کی'' وہ فخریہ انداز میں بولا ''شاعری بھی شروع کر دی ہے تمھیں سناؤں۔۔۔؟''

''ٹھہرو میں پہلے گندے انڈے ٹماٹر اور پرانے جوتے وغیرہ اکٹھے کر لوں'' میں نے پیش بندی کرتے ہوئے کہا۔

''تم ہر ہفتے ایک نئے عشق کی داغ بیل ڈالتے ہو، یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ ایک ایسا جوا ہے، جس میں آدمی سب کچھ ہار جاتا ہے۔''

''ارے'' یہ تو وہ واحد کھیل ہے، جس میں دونوں کھلاڑی بیک وقت جیت جاتے ہیں'' اس نے میری لاعلمی پر اظہار افسوس کیا۔

''تم عوام کی طرح بھول رہے ہو کہ دونوں کھلاڑیوں کے ہارنے کے برائٹ چانسز اس میں کہیں زیادہ ہوتے ہیں۔'' میں نے اسے راہ راست پہ لانے کی آخری کوشش کی ''محبت بغیر آستین کی وہ بنیان ہے، جس پی سر اکثر بازوؤں والی جگہ پہ جا گھستا ہے۔''

''تم شاید اتنی دیر سے مجھے کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہے ہو!'' وہ یوں ہنسا جیسے بچے کی حرکتوں پر خوش ہو رہا ہو۔

''تم جانتے نہیں محبت تو وہ لافانی جذبہ ہے جس کے سامنے دنیا کے سارے علوم، نصیحتیں، مذہب اور فلسفہ بے کار ہے یہ تو مکڑی کا ایسا جالا ہے جو ایک بار لپٹ جائے تو چھڑکانے کے باوجود کہیں نہ کہیں کچھ نہ کچھ چپکا رہ جاتا ہے۔''

ابھی وہ اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ میں نے اس کے چہرے پر زبردست بلیک آؤٹ ہوتے دیکھا، اس کی وحشت زدہ نظر کے تعاقب میں مڑ کر دروازے کی طرف دیکھنے پر قمار ثانو کی ایک ایکس (سابقہ) محبوبہ کے پہلوان بھائی جان کو اپنی میز کی طرف بڑھتے پایا۔ اس کی آنکھوں سے شعلے اور ناک سے دھواں نکلنے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ موصوف کسی خیر سگالی مشن پر ہرگز ہرگز نہیں آئے۔ عین اسی وقت مجھے گیہوں کے ساتھ گھن پسنے کا محاورہ یاد آیا۔ اس سے قبل کہ میں سینڈ وچ بنتا، میں یہ سوچتا ہوا عقبی دروازے کی طرف ''پرواز'' کر گیا کہ کیا قمار ثانو پہلوان کو قائل کر سکے گا کہ محبت ایک لافانی، مقدس اور بے اختیار جذبہ ہے۔

ڈاکٹر عارفہ صبح خان

لپ سروس

دنیا میں ہر کام کی قیمت مقرر ہے۔ اِس دنیا کا اصول ایک ہاتھ دے ایک ہاتھ لے پر چل رہا ہے لیکن ہماری دنیا میں ہر جگہ ''لپ سروس'' فری ہے۔ زبان ہلانے اور چلانے میں کسی کا کچھ نہیں جاتا البتہ کچھ نہ کچھ ہاتھ آجاتا ہے۔ بعض لوگ تو لپ سروس کی بنیاد پر اپنے پلازے کھڑے کر لیتے ہیں، جائدادیں بنالیتے ہیں اور بینک بیلنس ہیوی کر لیتے ہیں۔ دنیا میں جو کچھ نہیں کرتا، وہ لپ سروس کرتا ہے۔ لپ سروس کے لئے کسی اکیڈمی یا یونیورسٹی جانے کی ضرورت ہوتی ہے نہ کسی ڈگری کی۔ یہ خداداد صلاحیت ہے یا پھر جیسے خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے بالکل اُسی طرح ایک آدمی دوسرے کو دیکھ کر لپ سروس کے اسرار و رموز سیکھ لیتا ہے۔ دنیا مین یہ سب منفعت بخش کاروبار ہے۔

ہمارے ہاں اکثر لوگ اس قدر عمدہ لپ سروس دیتے ہیں کہ مغربی خواتین یاد آجاتی ہیں، جہاں خواتین ہر وقت اور ہر گھڑی لپ سروس کے لئے تیار رہتی ہیں۔ شائد یہی وجہ ہے کہ وہاں کے مرد ہر دم ہشاش بشاش رہتے ہیں بلکہ ہر سال خواتین کی اس پُر کشش فری لپ سروس سے مرد تقریباً چار ٹن لپ سٹک کھا جاتے ہیں۔ شکر ہے کہ لپ سٹک میں صرف خوشبو ہوتی ہے، اگر وہ بھی میٹھی ہوتی تو لپ سروس کے اوقات بڑھ جاتے اور ہر سال سوٹن لپ سٹک مردوں کی خوراک بنتی۔ لپ سروس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں سوائے خوبیوں کے کوئی برائی نہیں ہوتی۔ لپ سروس دینے والے مین زبردست کوالٹی ہوتی ہے۔ اگر لپ سروس دینے والی ہو تو مقابل کا بچنا مشکل ہے۔ لپ سروس میں کسی بھی طرح کا خرچہ نہیں آتا۔ یہ بالکل مفت کا نسخہ ہے۔ جو بھی

استعمال کرے مزے میں رہتا ہے۔ آزمائش شرط نہیں مگر بطور خواہش یا ضرورت آزمایا جا سکتا ہے لیکن ابتدا میں صرف قریبی لوگوں میں بہتر رہتا ہے۔

پاکستان میں بھی قیامِ پاکستان سے لپ سروس چلی آ رہی ہے۔ پہلے یہ خال خال تھی، اب جال کی طرح پھیل گئی ہے۔ اکیسویں صدی میں تو لپ سروس نے سائنس سے زیادہ ترقی کر لی ہے۔ آپ کسی محکمے میں چلے جائیں، جونہی کوئی واقف کار ملے گا، آپ کی عالیشان کار دیکھتے ہی آپ کو لپ سروس دینے لگے گا۔ خود آپ کو مطلوبہ جگہ پر چھوڑ کر آئے گا۔ پروٹوکول اس کی لپ سروس کا خاص حصہ ہے۔ وہ آپ کو محکمے اور افسران کے حوالے سے تمام معلومات فراہم کرے گا اور آپ کی پریشانی کو اپنی پریشانی سمجھ کر چہرے پر تفکرات لے آئے گا۔ آپ کو خاطر خواہ تسلی وعدے، عہد دے گا۔ اپنی خدمات پیش کرے گا اور ناممکن کام کو بھی ممکن بنانے کا عندیہ ظاہر کرے گا۔ لپ سروس دینے والا آپ کو اتنا مطمئن کر دے گا کہ آپ آدھے راستے سے لوٹ جائیں گے۔ آپ اپنی عالیشان کار میں بیٹھنے سے پہلے اپنا وزیٹنگ کارڈ لپ سروس دینے والے کو دیں گے اور ساتھ ہی اپنے گھر یا آفس آنے کی دعوت بھی دیں گے۔ کار والوں کو ہمیشہ ہی اچھی لپ سروس ملتی ہے لیکن جو بے کار ہوتے ہیں، ہمارے ہاں اُنہیں بھی لپ سروس مہیا کر دی جاتی ہے کیونکہ ابھی ہمارے ہاں اخلاق کو دیمک لگی ہوئی ہے، اس کا جنازہ نہیں نکلا۔ جب بے کار لوگوں کو اچھی لپ سروس فراہم کی جاتی ہے تو بیکار افراد میں بھی کار آمد بننے کا جذبہ بیدار ہو جاتا ہے اور کبھی کبھی تو یہ لپ سروس اتنی جاندار ہوتی ہے کہ ایک دن بے کار صاحبِ کار ہو جاتا ہے۔

لپ سروس ہمیں ہر سٹاپ، ہر محلے، ہر گاؤں، قصبے، شہر، ملک میں مل جاتی ہے۔ لپ سروس پر کوئی چارجز نہیں لگتے، کوئی بل نہیں آتا، کوئی رقم ادا نہیں کرنی پڑتی۔ لپ سروس نے ترقی پذیر ملکوں میں زیادہ ترقی کی ہے۔ ترقی یافتہ ملکوں میں لپ سروس ابھی تک ترقی پذیر ہے۔ اکثر لوگوں کا کاروبار ہی لپ سروس پر چلتا ہے بلکہ بعض ممالک کی دوستی بھی لپ سروس پر چل رہی ہے وگرنہ ان کے درمیان کسی قسم کی کوئی سروس نہیں کی جاتی۔ لپ سروس کے لئے بندے کا خوش مزاج اور کوش اخلاق ہونا شرط ہے۔ کڑوے کسیلے لوگوں میں لپ سروس نہیں ہوتی۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ان کے پاس لپ (Lips) نہیں ہوتے یا ان کی سروس کمزور ہے۔ ان کے پاس لپ بھی ہوتے ہیں اور سروس بھی۔۔۔ لیکن دونوں الگ الگ کام سرانجام دیتے ہیں مثلاً لپ سے وہ وہی کام کرتے ہیں جن کے لئے لپ بنائے گئے ہیں وہ اپنے لپ (Lips) پر اضافی بوجھ کو گناہِ کبیرہ سمجھتے ہیں۔ سروس وہ صرف وہی کرتے ہیں جو اُن کے دائرۂ اختیار میں ہوتی ہے۔ فالتو سروس کو وہ ذہنی اور جسمانی توانائی کا ضیاع خیال کرتے ہیں اور فاضل سروس ایسے لوگوں کے نزدیک گناہِ صغیرہ ہے۔

لیکن آج کی دنیا لپ سروس پر چل رہی ہے۔ لپ سروس اتنی ترقی کر چکی ہے کہ خط و کتابت کے بعد ٹیلیگرام اور ٹیلیفون سے چلتی ہوئی کمپیوٹر میں داخل ہو گئی ہے۔ جدید طریقۂ کار میں اب لپ سروس بذریعہ چیٹنگ (Chating) کی جا رہی ہے۔ انٹرنیٹ پر جتنی بیسٹ اور فاسٹ (Best & Fast) لپ سروس فراہم کی جا رہی ہے، اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ لپ سروس نے زندگی کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ سب سے اچھی ''لپ سروس'' کون دیتا ہے؟ یہ ایک مشکل سوال ہی جس کو ہر ایک نے مخمصے میں ڈال دیا ہے۔ کبھی کبھی لگتا ہے جیسے ٹیلیفون آپریٹر سے زیادہ لپ سروس کوئی فراہم نہیں کر سکتا۔ آپریٹر اپنی لپ سروس کی وجہ سے اس قدر بدنام ہو چکے ہیں کہ لوگ اُنہیں رشتہ دینے اور لینے سے کتراتے ہیں حالانکہ ٹیلیفون آپریٹرز کا موقف ہے کہ گھر گھر ٹیلیفون کا ہونا ان کی لپ سروس کا مرہون ہے۔ اکثر ٹیلیفون آپریٹرز جو مڈل، میٹرک یا انٹر ہوتے ہیں، ان کی شادیاں بڑے بڑے گھروں میں ہو جاتی ہیں۔ ٹیلیفون آپریٹرز اپنی لپ سروس کی بدولت بڑے لوگوں کو شیشے میں اُتار کر اپنے کام کروا لیتے ہیں۔ قدرت نے ٹیلیفون آپریٹرز کو بڑی میٹھی زبان دی ہوتی ہے جو کسی بھی وقت تالو سے نہیں چپکتی بلکہ ہر وقت تال پر تھرکتی رہتی ہے۔ ٹیلیفون آپریٹروں میں سے کئی نان میٹرک ہونے کے باوجود بڑے عہدوں تک

رسائی حاصل کرلیتے ہیں۔ٹیلیفون آپریٹر ہمیشہ خوشحال زندگی بسر کرتے ہیں کیونکہ اپنی لپ سروس یونی چرب زبانی سے اپنا اُلو سیدھا کرتے ہیں۔ یہ ہر قسم کے لوگوں کو آسانی سے بیوقوف بنا لیتے ہیں۔اُلو بنانا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ یہ ہر سائز اور ہر نسل کے اُلو کو شیشے میں اُتارنا اور اپنا مائی باپ بنانا جانتے ہیں۔ اُلو تو اُلو، یہ لومڑی صفت آدمی کو بھی اُلو بنانے سے دریغ نہیں کرتے۔ٹیلیفون آپریٹروں نے لپ سروس سے جن کہانیوں کو جنم دیا ہے، اگر ان کا پردہ فاش کر دیا جائے تو لوگ دانتوں میں انگلیاں دبانے کے بجائے چبالیں۔ٹیلیفون آپریٹروں سے زیادہ اچھی لپ سروس دکاندار اور سیلز مین دیتے ہیں۔ان کی لپ سروس میں اس قدر مٹھاس، نرمی، گداز، شوخی اور کشش ہوتی ہے کہ جنھوں نے کچھ نہیں خریدنا ہوتا، وہ سب کچھ خرید لیتی ہیں۔جن کے ہاتھوں میں چوڑیاں ہوتی ہیں وہ بھی بے اختیار ہاتھ آگے کر کے چوڑیاں پہننے لگتی ہیں۔عورتوں پر ایکسٹرا شاپنگ کا الزام لگایا جاتا ہے کیونکہ وہ دوستہ وٹ اور ایک جوتا خریدنے جاتی ہیں مگر جب واپس آتی ہیں تو اس قدر لدی پھندی ہوتی ہیں کہ ان کا بھاری بھرکم وجود بھی چیزوں میں چھپ جاتا ہے اور چیزوں کی گنتی مشکل ہوجاتی ہے۔دکاندار اپنی لپ سروس سے عورتوں کے پرس خالی نہیں کرواتے، جھڑوا لیتے ہیں اور پھر گھر جا کر اُنہیں جو جھڑکیاں پڑتی ہیں اُن کا تو کوئی حساب نہیں ہوتا لیکن دکاندار اپنا مال بیچ کر مزے سے اپنی جورو کو بیگمات کی حماقتوں کی دلچسپ کہانیاں سنا کر ہنساتے ہیں۔ دکاندار کی جورو آنکھ مار کر کہتی ہے ''ہائے کیسے پٹا لیتے ہو تم ان چالاک عورتوں کو، جو اپنے شوہروں کو بیوقوف بنا کر ان کی جیبوں سے بڑی رقمیں نکلواتی ہیں اور بڑا اِتراتی پھرتی ہیں۔۔۔اِنہیں کیا معلوم کہ تم کیا شے ہو، ہائے قسم سے بڑے وہ ہو تم۔۔۔ایسا کیا کرتے ہو تم کہ وہ پرس خالی کر دیتی ہیں؟؟؟''

''لپ سروس اور کیا!'' دکاندار ہنس کر کہتا ہے ''عورتیں میٹھی میٹھی باتوں سے رام ہو جاتی ہیں۔ دو چار تعریفیں چیزوں کی اور ایک تعریف اُن کی کہ میڈم آپ پر تو یہ کلر بڑا خوبصورت لگ رہا ہے، یہ پرنٹ تو صرف آپ کے لئے بنا ہے، ذرا آئینہ دیکھیں آپ کتنی جچ رہی ہیں، ایک دم سمارٹ۔۔۔آپ کے شوہر تو خوش ہو جائیں گے۔''

غرضیکہ دکاندار اپنی چرب زبانی سے جس قدر کام لیتے ہیں۔۔۔اگر وہ ایسا نہ کریں تو سارا دن صرف مکھیاں ماریں اور رات کو اپنے گھر میں مچھر ماریں۔دکاندار اپنی لپ سروس کے بل بوتے پر گھٹیا، غیر معیاری، جعلی، معمولی اور دو نمبر اشیاء مہنگی بیچ کر خوب کماتے ہیں۔دکانداروں کی بیویاں ہی نہیں، مائیں بھی خوش رہتی ہیں۔ بہنیں بھی، بیٹیاں بھی اور سہیلیاں بھی۔۔۔ کیونکہ دکاندار لپ سروس میں ماہر ہوتے ہیں اور جو لوگ اچھی لپ سروس دینا جانتے ہیں، وہ کبھی غریب نہیں رہتے، ہمیشہ خوش اور خوشحال رہتے ہیں اور جو لوگ اچھی لپ سروس لینا جانتے ہیں ان کے حالات کبھی ایک سے نہیں رہتے بلکہ دیکھنے میں آیا ہے کہ ان کے حالات پتلے رہتے ہیں بلکہ کبھی کبھی تو ناگفتہ بہ ہو جاتے ہیں۔ دکاندار اللہ کے ہاں سے لپ سروس سیکھے سکھائے بلکہ سدھائے آتے ہیں اور کامیاب زندگی بسر کرتے ہیں۔ان سے ان کا اللہ خوش رہتا ہے کیونکہ وہ اللہ کی راہ میں دل کھول کر خرچ کرتے ہیں۔ ان کی مائیں راضی کہ اُنہیں کھلا خرچہ ملتا ہے۔ بیوی شاد کیونکہ لپ سروس کا سب سے زیادہ فائدہ بیوی اُٹھاتی ہے۔غرض ہر آدمی لپ سروس والوں کو عزت، محبت اور قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ سچ اور حق بات کرنے والا اسی قدر ذلیل و خوار ہوتا ہے۔ سچ بولنے والے کو اوپر سے نیچے اور اندر سے باہر تک کوئی پسند نہیں کرتا۔ایک سچے آدمی نے ایک دن اللہ میاں سے ناراض ہو کر کہا کہ اے اللہ!! تو خود انصاف نہیں کرتا۔۔۔ جتنے جھوٹے، مکار، راشی، بے ایمان، منافق، دھوکے باز ہیں، تو نے اُنہیں خوشیاں اور خوشحالی دے رکھی ہے لیکن جو تیرے نام لیوا ہیں، دُکھی اور قلاش ہیں، تیرے پاس خود انصاف نہیں، بھلا تجھ سے کیا مانگنا۔۔۔ ویسے بھی پہلے کون سا تو نے کچھ دیا ہے۔تیرے پاس مصیبتوں، تکلیفوں، بیماریوں، غموں اور غربت دینے کے سوا ہے ہی کیا۔۔۔ عبادت کرنے سے تو نے کیا دیا؟ نہیں مانگوں گا اب تجھ سے

کبھی۔۔۔ہونہہ وقت ضائع کرنے کا فائدہ، جب تو سنتا ہی نہیں۔'' سچا آدمی بڑبڑاتا ہوا اُٹھ گیا۔ اللہ میاں کو سچے آدمی کی باتیں اتنی بُری لگیں کہ اللہ نے سزا کے طور پر مزید کنگلا کر دیا اور اس گستاخی پر اُسے مرنے کے بعد جہنم رسید کیا، سچے آدمی کے ساتھ ہی ایک لپ سروس والا بھی نماز پڑھ رہا تھا۔ سچے آدمی کو بُڑبُڑاتا دیکھ کر اس نے اللہ میاں سے دعا مانگی ''اے خدا! تو کتنا رحیم، کریم اور عظیم ہے۔ میں تیرے صدقے جاؤں جس نے مجھ جیسے نالائق اور نااہل کو اپنی محبتوں اور رحمتوں سے نوازا، یہ صرف تیری مہربانی ہے جو مجھ جیسا نکما اور مفلس آدمی کروڑ پتی بنا۔ میں نے جب بھی مانگا، تونے بے دریغ دیا اور نہیں مانگا، تب بھی دیا۔۔۔اے میرے پیارے اللہ! تو واقعی داتا ہے، سخی ہے، عظمت والا ہے۔ مجھے امید ہے تو ہمیشہ رحمتوں کی بارش کرے گا اور میرے گھر دولت کا مینہ برستا رہے گا کیونکہ تو مالک ہے، آقا ہے، تیرا کام دینا ہے، تو دیتا ہے۔۔۔تو نہیں دے گا تو اور کون دے گا۔۔۔تیرے سوا اور کون ہے جو دے۔۔۔مجھے اور دے میرے پیارے اللہ میاں۔''

اللہ تعالیٰ نے لپ سروس والے کی دعائیں اور فوراً قبول کر لی۔ اللہ میاں نے خوش ہو کر اُسے اِتنا دیا کہ لوگوں نے کہنا شروع کر دیا ''یہ اللہ والا آدمی ہے، یہ خدا کو اور خدا کی مخلوق کو خوش رکھتا ہے۔ اسی لئے اللہ اس سے راضی رہتا ہے۔ جب لپ سروس والا مرا تو اس کے چہرے پر بلا کا نور تھا کیونکہ اُس نے ہمیشہ خوشیاں اور خوشحالی دیکھی تھی جس کی چمک مرنے کے بعد بھی باقی تھی۔ اس کے جنازے میں ہزاروں لوگ شریک ہوئے۔ ہر کوئی اس دولتمند اللہ والے کے جنازے کو کندھا دینا چاہتا تھا۔ اس کا عالیشان مقبرہ بنوایا گیا اور ہر سال دھوم دھام سے اس کی برسی منائی جانے لگی۔ دوسری طرف وہ سچا کھرا آدمی تھا جس نے اللہ میاں سے پنگا لیا تھا۔ وہ غریب سے غریب تر ہوتا گیا اور اتنا قلاش ہو گیا کہ تین دن گھر میں بھوکا پڑا رہا۔ بیوی بچے تنگ آ کر اسے چھوڑ گئے۔ رشتہ دار پہلے ہی منہ موڑ چکے تھے۔ جب وہ بھوک اور سردی سے مرا تو اس کے چہرے پر مکھیاں بھنک رہی تھیں۔ جب لاش سڑنے لگی تو چار دن بعد پتہ چلا کہ کوئی جھونپڑے میں مرا پڑا ہے۔ کارپوریشن سے تین آدمی آئے اور بدبو سے ناک بند کرتے ہوئے بولے ''توبہ کتنی سرانڈ ہے، منہ پر پھٹکار برس رہی ہے کمبخت کے، مردود نے مرنا تھا تو کسی قبرستان میں جا کر مرتا، ہمیں یہ متعفن لاش تو نہ اُٹھا نہ پڑتی۔'' یہ کہہ کر اُنہوں نے لاش کو بوری میں ڈالا اور قبرستان میں ایک ٹوٹی پھوٹی قبر میں پھینک آئے۔ دو دن بعد لاش کتے بلیوں اور حشرات الارض کے پیٹوں میں غائب ہو گئی۔ کسی کو یاد بھی نہ رہا کہ دنیا میں کوئی سچا، کھرا، حق پرست، ایماندار آدمی بھی تھا جو حق بات کہتا اور بُرا بن جاتا تھا۔

دنیا میں اچھے طریقے سے رہنے کے لئے لپ سروس بہت ضروری ہے۔ خدا نے لپ سروس کی بہترین کوالٹی کچھ خاص لوگوں کو اتنی فیاضی سے عطا کی ہوتی ہے کہ رشک آتا ہے۔ مثلاً سیاستدانوں پر تو لپ سروس ختم ہے۔ عوام کو سبز باغ وہ لپ سروس کی بنیاد پر ہی دکھاتے ہیں۔ ہر الیکشن لپ سروس پر جیت جاتے ہیں۔ اپنے حلقے کے لوگوں کو صاف پانی، تعلیم، صحت، نوکری دینے کی باتیں کرتے ہیں۔ کچی سڑکوں کو پکی بنانے کے وعدے کرتے ہیں۔ غربت مٹانے کی باتیں کرتے ہیں۔ ان کے دکھ درد دور کرنے کا عہد کرتے ہیں۔ روٹی کپڑا اور مکان کا نعرہ لگاتے ہیں۔ اپنے ساتھ لے کر چلنے کا حسین وعدہ کرتے ہیں۔ اُنہیں باپ، بھائی، بہن، بیٹی کہتے ہیں، خود کو عوام کا خادم ظاہر کرتے ہیں اور خدمتیں کراتے ہیں۔۔۔ پھر الیکشن جیت کر چمپت ہو جاتے ہیں، مال بناتے ہیں، خزانے لوٹتے ہیں، بنک بیلنس بڑھاتے ہیں، کوٹھیوں، بنگلوں، گاڑیوں میں عیش کرتے ہیں، ہوٹلوں اوت کلبوں میں دعوت اُڑاتے ہیں، اسمبلیوں میں لطیفہ بازیاں کرتے ہیں، غیر ملکی دوروں پر سیر سپاٹے کرتے ہیں۔ جب کوئی غریب، ضرورتمند، بیروزگار ان سے ملنا چاہے تو کہلوا دیتے ہیں کہ صاحب بہت مصروف ہیں، ان کے پاس رش لگا ہوا ہے، میٹنگ میں ہیں، ڈیلی گیشن آیا ہوا ہے، انٹرویو دے رہے ہیں۔ غریب آدمی کہتا ہے کہ ''اُنہوں نے تو کہا تھا کہ جب بھی میری ضرورت پڑے، میرے گھر کے دروازے کھلے ہوں گے، میرے پاس واپسی کا

کرایہ نہیں، مجھے آج ہر صورت ان سے ملنا ہے، آخر وہ ہمارے ہی ووٹوں سے وزیر بنے ہیں، پھر ہم سے کیوں نہیں ملتے ؟؟؟''

سیکیورٹی گارڈ رائفل غریب کی پسلی میں چبھوتے ہوئے کہتا ہے''ابے اندھا ہے کیا؟ دیکھتا نہیں دروازے کھلے ہوئے ہیں، ارے تم نے ایک ہی ووٹ تو دیا ہے اور صاحب اندر کیا کر رہے ہیں، قوم کی خدمت، عوام کی بہبود کے منصوبے۔۔۔ ارے تمھارے لئے ہی تو اپنی جان کھپا رہے ہیں اور تم بک بک کرتے ہو، جاتے ہو یا ٹرائیگر دباؤں؟ بیچارہ غریب بیروزگار نوجوان لاجواب ہو کر لوٹ جاتا ہے کیونکہ صاحب اندر واقعی ضروری کام کر رہے ہیں، خدمت کر رہے ہیں اور جان کھپا رہے ہیں مگر کس کے ساتھ۔۔۔؟ اس بارے میں لب کشائی کی اجازت نہیں، جب نئے الیکشن آئیں گے، تب بھی یہی موصوف سیاستدان عوامی جلسہ گاہوں میں رونق افروز ہوں گے اور اپنی لن ترانیوں سے پھر لاکھوں کا مجمع لگائیں گے، اپنی میٹھی دلفریب دلگداز باتوں سے سب کو بیوقوف بنائیں گے۔لپ سروس کے بل بوتے پر پھر الیکشن جیت جائیں گے، پھر وہی مصروفیات اور میٹنگز، وہی حسین شب و روز۔

ہمارے ہاں مولوی صاحبان بھیپڑی عمدہ لپ سروس فراہم کرتے ہیں۔ یہ نیکی بدی اور جنت جہنم کی باتیں کرتے ہیں۔ جنت اور جہنم کا نقشہ اس طرح پیش کرتے ہیں جیسے آسمان کا دورہ کر کے آئے ہوں اور جنت جہنم کا انہیں ذاتی تجربہ ہو۔ نیکی کی طرف راغب کرنے کے لئے''چندے'' پر خصوصی زور ہوتا ہے، اسی

طرح زکوٰۃ، خیرات اور عطیات کے ذریعے جنت کا ٹکٹ خریدنے پر اُکساتے ہیں۔ مرغی بکرے، بکریاں، بھیڑیں، گائیں، اونٹ، اونٹنیاں اور ان کی کھالیں بطورِ قربانی یا ہدیہ و نذرانہ دینے کو کارِ خیر قرار دیتے ہیں۔ مولوی صاحبان کی خوش الحانیوں کی وجہ سے آج مساجد نہایت دیدہ زیب اور آرام دہ ہو چکی ہیں۔ ان مساجد میں عموماً چٹائیوں کی جگہ قالین، کولر، اے سی، ہیٹر، گیزرز موجود ہیں۔ اس کے علاوہ ہر مسجد پر سپیکر نصب ہیں، جن کی تعداد میں اضافہ ہوتا ہے، کمی کبھی نہیں ہوتی۔ ہمارے مولوی صاحبان کا خیال ہے کہ عوام شائد بہری ہے یا اونچا سنتی ہے، اس لئے ہر مسجد میں تین سے زائد سپیکر نصب ہوتے ہیں۔ بعض مساجد میں سپیکروں کی تعداد مقرر نہیں ہے تاکہ مولوی صاحبان پورے جوش وخروش سے لپ سروس دے سکیں۔ یہ خطبے جوشِ خطابت کا ایسا نمونہ ہوتے ہیں کہ دل دہل جاتا ہے۔ زبان گنگ ہو جاتی ہے۔ ذہن ساکت ہو جاتا ہے اور کان واقعی بہرے ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ ایک تو سپیکروں کی تعداد، اوپر سے مولوی صاحب کا ولولہ انگیز خطبہ اور ساتھ والی مسجد کے مولانا سے سبقت لے جانے کی طلب میں کئی فرلانگ تک آواز اس قدر گونجتی ہے کہ لگتا ہے کہ جیسے ہم عالمِ برزخ میں کھڑے ہوں اور ہمارے ایک طرف جنت اور دوسری طرف جہنم ہے۔ خطبے اور دعا میں سارا زور لینے اور دینے پر ہوتا ہے۔ مولوی صاحبان کی لپ سروس کا ابھی تک کوئی نعم البدل پیدا نہیں ہوا۔

پراپرٹی ڈیلر اور ایجنٹس بھی لپ سروس کے ماہرین میں شمار ہوتے ہیں۔ پراپرٹی ڈیلروں کا بس چلے تو وہ بیعانے کی رقم کے علاوہ پراپرٹی کی رقم بھی خود ہی ٹیفے میں اڑس لیں۔ ایک بوتل کوکا کولا کی پلا کر یہ پارٹی کا سارا جوس نچوڑ لیتے ہیں۔ پراپرٹی ڈیلر نے آج تک جو بھی کھایا اور کھا رہے ہیں، وہ سب لپ سروس کے سر پر کھا رہے ہیں۔ یہ دن کو رات اور رات کو دن، ستارہ کو چاند اور چاند کو سورج بنا کر پیش کرتے ہیں۔ تین مرلہ گھر کو کوٹھی اور بنگلے کو پلازہ اور پلازے کو مارکیٹ بنا کر پیش کرتے ہیں۔ اسی طرح اُجاڑ، سنسان ویران جگہ کو پرسکون، وسیع، کشادہ، جنت نظیر اور مستقبل کا مہنگا ترین علاقہ قرار دے کر پلاٹ ہزاروں کی جگہ لاکھوں میں بیچتے ہیں پراپرٹی ڈیلر ٹھیکیداروں کی طرح لپ سروس سے آنکھوں میں دھول جھونک کر آسمان پر بھی پلاٹ بیچ دیتے ہیں۔ بعض ترقی یافتہ ملکوں کے پراپرٹی ڈیلروں نے تو سیاروں اور سورج، چاند، ستاروں پر بھی پلاٹ الاٹ کئے ہیں۔ ٹھیکیداروں اور پٹواریوں کی لپ سروس سے تو اللہ بچائے۔ کئی ٹھیکیداروں نے تو قبرستانوں پر پلازے بنا کر کروڑوں، اربوں روپے میں بیچ دیے۔ ٹھیکیداروں کی لپ سروس لاجواب اور تعمیراتی کام انڈہ۔۔۔ ان ٹھیکیداروں سے مکان یا دکان تعمیر کروانے سے پہلے اپنا بیمہ ضرور کروالینا چاہیئے اور اگر مکان یا دکان کا بھی بیمہ بھی کرالیا جائے تو خسارہ پورا ہو سکتا ہے لیکن نہ کرانے کی صورت میں دیوالیہ ہونے کے سو فیصدی امکانات ہیں۔ ویسے تو وکیل بھی لپ سروس کے اُستاد مانے جاتے ہیں۔ وکیل کے پاس جانے کے بعد آدمی کا خوامخواہ دل چاہتا ہے کہ کوئی پھڈا ہونا چاہیئے، اسی لئے دانا کہتے ہیں کہ وکیل اور ڈاکٹروں سے حتی الوسیع دور رہنا چاہیئے۔ وکیل سے دوستی میں آدمی مقدمے میں پھنستا ہے اور ڈاکٹر سے دوستی بیماری لاتی ہے۔ اس لئے دونوں کی دوستی خطرناک، مضر اور سراسر تکلیف دہ ہے۔ ان سے فائدہ نہیں پہنچتا، نقصان ہی پہنچتا ہے۔

صحافیوں کی لپ سروس بے مثال ہوتی ہے۔ وہ اپنی لپ سروس سے ورکر کو لیڈر اور گیدڑ کو چمگادڑ بنا دیتے ہیں۔ زیرو کو ہیرو اور لکھ پتی کو ککھ پتی بنا دیتے ہیں۔ وہ اپنی لپ سروس سے سارا منظر بدل کر رکھ دیتے ہیں۔ وہ جسے چاہیں کرسی پر بٹھا سکتے ہیں۔ یہ کرسی موت کی کرسی بھی ہو سکتی ہے اور اقتدار کی بھی۔ لپ سروس کے اصل خالق پی آر اور ہوتے ہیں۔ پی آر او لپ سروس سے جو کرشمے اور معجزے سرانجام دیتے ہیں، وہ معجز بیان ہیں۔ پی آر او لپ سروس سے جسے چاہیں انگلیوں پر نچا سکتے ہیں اور لپ سروس کے نئے پھندے ایجاد کرتے ہیں۔ جانتے ہیں کہ لپ سروس ہی ان کے پیشے کی جان ہے اور لپ سروس سے انسان کو کبھی زوال نہیں آتا، ہمیشہ کمال آتا ہے اور لپ سروس باعثِ خیر و برکت ہے۔

سیّد ممتاز علی بخاری

عقل کے شہزادے

یوں تو خان اور سردار حضرات پر لکھنے کے لئے بہت زیادہ ہمت اور جرأت کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ اول تو یہ دونوں حضرات بہت ذہین اور عقل مند واقع ہوئے ہیں۔ جس بناء پر وہ اپنے اوپر لکھنے کے مواقع بہت کم دیتے ہیں۔ بغرض محال و مروت کے باعث آپ کو لکھنے سے باز نہ رکھ سکیں تو ان کی ''کھال'' ایسی سخت بن جاتی ہے کہ لکھنے سے توبہ بھلی۔۔۔ بات چل رہی تھی عقل و دانش کی۔۔۔ انسان کی تخلیق سے پہلے روئے ارضی پر جانوروں میں بے شمار ''عاقل'' اور ''دانشور'' پائے جاتے تھے لیکن ان میں سے تین اقسام نے اپنی عقل کے بل بوتے پر ایسے ایسے کارنامے سرانجام دے رکھے تھے کہ عقل و دانش کی بادشاہت میں تین ناموں کا ہی ڈنکا بجتا تھا اور وہ ملکۂ دانش ام العقل المعروف بھینس اور شہنشاہ ذہانت فاضل العقل صاحب المعروف گدھا، کھوتا! عقل و فہم کی بادشاہت میں الو بھی کسی سے کم نہیں۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنا کر تمام مخلوق کے لئے خلیفہ بنا کر زمین پر بھیجا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ وہ یہاں آ کر امن و سکون سے حکمرانی کے لطف اُٹھاتا اور ساتھ ساتھ اپنی ذمہ داریاں بھی نبھاتا رہتا لیکن شومئ قسمت اس نے ایسا نہ کیا۔۔۔! یہ ایک طے شدہ اصول ہے کہ جب بھی کوئی عیش و عشرت میں پڑھ کر اپنی ذمہ داریاں بھول جاتا ہے تو وہ اپنی حیثیت کھو دیتا ہے۔ بالکل اسی طرح انسان نے جب اپنی ذمہ داریاں بھلانی شروع کر دیں اور اپنی حیثیت کو فراموش کرتے ہوئے اپنے خالق و مالک کی ہمسری کرنے کی کوششیں شروع کر دیں تو بقول چپ شاہ اللہ تعالیٰ نے ''انعام'' کے طور پر انسانوں میں دو فاتر العقل اقسام پیدا فرما دیں تا کہ تمام انسان ان کی عقل و ذہانت سے مستفید ہو سکیں۔ ان میں سے ایک خان کہلائے اور دوسرے سردار!!!

خان صاحبان کو سردار صاحبان اور دوسرے ذی شعور ''جانوروں'' پر ایک وجہ سے خاص فوقیت حاصل ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہر انسان ''خان'' کا حامل ہوتا ہے اب آپ ہی بتلائیے کہ آپ کے پاس کوئی ''خان'' نہیں ہے؟ خان۔ دان تو ہوگا ناں۔۔۔ اور خان دان تو خان ولی جگہ ہی کو کہتے ہیں جیسے نمک دانی، سائنس دان اور روشن دان وغیرہ لہٰذا ثابت ہو گیا کہ ہر انسان کے پاس

ایک ''خان'' یا ''خان دان'' ہوتا ہے جبکہ سرداروں کو رکھنے کا تادم تحریر پاکستان میں کوئی بندوبست نہیں ۔ ہاں البتہ اگر وہ ایوان صدر میں رہنا چاہیں تو جنابِ صدران کی درخواست قبول کرتے ہوئے انہیں اپنی اور قوم کی خدمت کے لئے ایوان صدر بلالیں جیسا کہ کشمیری عوام نے کئی مرتبہ کیا ہے۔

کسی نے ہمارے مشہور مفکر چپ شاہ سے پوچھا کہ جناب! خاندان میں مرد اور عورت کے اختیارات کی نسبت کیا ہوتی ہے؟ یعنی جمہوریت کی رو سے کون صدر اور کون وزیر اعظم ؟؟؟ بجائے سوال کا جواب دینے کے وہ پوچھنے لگے: کونسا خاندان ۔۔۔؟؟؟ ''جوائنٹ فیملی سسٹم والا یا چھوٹا خاندان زندگی آسان والا''۔ جواب ملا ''چھوٹا خاندان زندگی آسان والا''۔

چپ شاہ کہنے لگے: ''یہ اُس پر منحصر ہے کہ وہ کس ملک میں رہتے ہیں؟

پوچھا گیا: ''بھلا کیسے؟''

کہنے لگے : اگر ہندوستان میں رہتے ہوں تو عورت وزیر اعظم اور مرد صدر جبکہ پاکستان میں رہنے کی صورت میں کرسی صدارت پر عورت اور وزارت عظمیٰ پر مرد ہی فائز ہوگا۔

کچھ لوگ سردار کو ''سر۔ دار'' سمجھتے ہیں اور ہم اس بات پر سوائے افسوس کے کچھ بھی نہیں کر سکتے کیونکہ ہمارے ملک عزیز میں اظہار رائے کی آزادی تو بہر حال ہے ہی۔۔۔ ویسے آپس کی بات ہے کہ ان کے سر، دار یعنی سولی پر لٹکائے جانے کی وجہ ہی سے ان کی ابادی روز بروز بڑھ رہی ہے ۔الغرض نوع انسانی کی ترقی اور بہتری کے لئے گوناگوں مصروف رہنے کے باعث اب یہ انسانوں کے لئے ''کمبل'' ہی بن گئے ۔ان کی بستیوں میں انہی جیسے لوگ رہتے ہیں۔ کسی زمانے میں ''خان'' کا لقب بہت اہمیت کا حامل تھا لوگ اپنے ناموں کے آگے ''خان'' کا اضافہ کرنا باعث فخر سمجھتے تھے۔ اکثر اوقات ریاستوں کے راجے، مہاراجے بھی کسی کو خطاب دینا چاہتے تو خطاب میں ''خان'' ضرور شامل کرتے ۔ سونے پر سہاگا کچھ لوگ دوسری اقوام سے تعلق رکھنے کے باوجود ''خان'' کہلانے جانے پر فخر محسوس کرتے تھے ۔جیسے مغل بادشاہوں کے دور میں دو سید زادے تھے جنہوں نے بادشاہوں سے ''حسین علی خان'' اور ''عبداللہ خان'' جیسے نام پا کر خوش وخرم اپنی زندگی بسر کی اور پھر چل بسے۔

اُنہی دنوں ایک آدمی بہ موسوم ''خلیل خان'' فاختہ اُڑایا کرتا تھا۔اس شوق کے باعث پورے ہندوستان میں مشہور ومعروف تھا۔ جب مغل بادشاہت روبہ زوال ہوئی تو ''خانوں'' کے ہاتھوں کے بھی ''طوطے اور طوطیاں'' اُڑ گئے۔ غدر کے بعد جب خلیل خان لوگوں کو اپنے گزرے وقت کے واقعات سنا کر رُعب جمانے کی کوشش کرتا تو لوگ کہتے ''وہ دن گئے جب خلیل خان فاختہ اُڑایا کرتے تھے۔''

محبت کا دشمن ہے سارا زمانہ

کتا پھر کتا ہے

پروفیسر مجیب ظفر انوار حمیدی

یہ کتے میرے ہیں، آپ ان کتوں کو پطرس کے کتوں کے ساتھ مکس نہ کیجیے گا کیونکہ میرے کتے زیادہ کتے نہیں ہیں اور یہ وہ کتے ہیں جو گھروں میں باعزت زندگی گزارتے ہیں پطرس کے کتے تو باہر گلی محلوں میں چرسیوں کے ساتھ گھومتے پھرتے ہیں اور رات کو مشاعرہ کرتے ہیں راتوں کو مشاعرہ کرنا یہ بتاتا ہے کہ یقیناً یہ لوگ سوٹا بھی لگاتے ہوں گے ورنہ اتنی اچھی شاعری تو مشکل ہے۔ فارسی میں کتوں کو سگ کہتے ہیں مگر پاکستان میں کچھ بہت زیادہ عقیدت مند لوگ اپنے آپ کو کسی نہ کسی بزرگ شخصیت کا سگ کہتے رہتے ہیں اگرچہ اس شخصیت نے ایسا کوئی تقاضا نہیں کیا ہوتا۔ ہمارے ہاں ماں باپ بچوں کو غصے میں آکر کتا یا کسی اور جانور کا نام لے دیتے ہیں سب جانوروں کے نام نہیں لکھے جاسکتے ممکن ہے میرا قلم چالیس دن کے لیے ناپاک ہوجائے مگر مجھے سمجھ نہیں آئی کہ کتا تو کافی وفادار جانور ہے اور اس میں کوئی بڑی خرابی بھی نہیں خرابی تو انسان میں ہے میرے خیال میں بچے کے لیے سب سے بڑی گالی یہی ہے کہ آپ اسے انسان کہہ دیں۔ کہا جاتا ہے کہ بھونکنے والے کتے کاٹتے نہیں مگر واللہ میں نے کوئی ایسا کتا نہیں دیکھا جو بھونکا اور کاٹنے کو نہ دوڑا ہو یہ تو انسان کی چالاکی ہے کہ اس کے پالان کو فیل کردیتا ہے ورنہ وہ تو خلوص نیت کے ساتھ آشیرباد دینے آرہا ہوتا ہے۔ ان کتوں کو گھر کا ایک فرد سمجھا جاتا ہے ہمارے ہاں تو اکثر ایسے کتے مالک کی رکھوالی کے لیے رکھے جاتے ہیں مگر ترقی یافتہ ممالک کے کتوں کی خود مالکوں کو رکھوالی کرنی پڑتی ہے۔ ہمارے ہاں بھی کچھ لوگ کتوں کا بہت خیال کرتے ہیں اور ان کو وہ غذائیں دیتے ہیں جو راقم اور ملک کی بڑی آبادی نے دیکھی بھی نہیں ہیں۔ گھریلو کتے بھی اچھی خاصی غذا کھا کر بھی رات کو جاگتے ہیں الو بارڈر پہ فوجی اور کتے ان کے نصیب میں رات کو سونا نہیں لکھا ہم تیسری دنیا کے لوگ مغرب سے بہت پیچھے ہیں اور ہمارے کتے بھی۔ وہاں کتوں کو خصوصی حقوق ملتے ہیں ایک دوست بتا رہے تھے کہ مغرب میں اکثر وہ لوگ کتا نہلاتے ہیں جن کے اپنے دیس کے کتے غربت اور کسمپرسی کی زندگی گزار رہے ہوتے ہیں۔

ایک زمانہ تھا جب مغرب میں انسانی حقوق کی باتیں ہوا کرتی تھیں اب وہ لوگ اس سے آگے جانوروں کے حقوق کی بات کر رہے ہیں اور ہمیں انسانی حقوق میں الجھا دیا ہے مغربی کتے اور پاکستانی کتے میں کچھ چیزیں مشترک ہیں مثلاً دونوں کی چار چار ٹانگیں ہوتی ہیں دونوں غراتے ہیں دونوں کی شادیاں نہیں ہوسکتیں ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ ہمارے ہاں کا کتا ڈپریشن کے

ماحول کی وجہ سے زیادہ سخت مزاج ہو گھروں میں پالے جانے والے کتے مختلف انواع واقسام کے ہیں کچھ کے ہمیں نام آتے ہیں جن میں پستہ، بولی، جرمن شیفرڈ، السشن وغیرہ ہیں ان کی اور بھی بہت سی اقسام ہیں جن کا ہمیں علم نہیں شاید اس لیے مرحوم پطرس نے ایسے کتوں کا انتخاب کیا جن کو چرسی اور گھر سے عاق کیا ہوا کہا جا سکتا ہے۔ انگریز مردوں کی توجہ عورتوں پہ اور انگریز عورتوں کی توجہ کتوں بلیوں پہ ہوتی ہے۔ وہاں کے کتے بھی سلجھے ہوئے لائق اِتنے کہ انگریزی بھی سمجھتے ہیں اور مجال ہے جو راستے میں کسی انسان کو تکلیف دیں مگر ہماری بد قسمتی دیکھیں کہ کتے بھی ملے تو وہ جن کو گھر سے باہر لے کر جایا جائے تو بدنامی کا باعث بنتے ہیں اور نالائق اِتنے کہ انہیں انگریزی کی اے بی سی نہیں آتی۔ لیکن ہمارے کتوں میں اچھی بات ہے کہ انہیں جو دو اس پہ قانع ہو جاتے ہیں سردی ہو یا گرمی کسی اور کوٹ کی لیے نہیں غراتے مگر مغربی کتے موسم کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ لباس بھی تبدیل کرتے ہیں۔ پاکستان کے کچھ علاقوں میں انسانوں کی پر زور حمایت اور زور پہ کتے آپس میں لڑنے پہ مجبور ہوتے ہیں اگرچہ لڑائی میں ایک نے جیتنا ہوتا ہے اور دوسرے نے ہارنا ایک کتا جیتتا ہے اور ایک ہارتا ہے یہاں کتوں اور انسانوں میں ایک باریک فرق یہ ہے کہ کتے اپنی ہار کو مان کر میدان سے کھسک لیتے ہیں مگر اشرف المخلوقات انسان اپنے کتے کی ہار کو اپنی ہار مانتے ہوئے بھی تسلیم نہیں کرتا اور جیتنے کے لیے پھر کتے کو تیار کرتا ہے اور کتا مالک کی اطاعت میں تیار بھی ہو جاتا ہے کیونکہ کہا جاتا ہے کہ کتا سب سے وفادار جانور ہے مگر یہ انسان کو متاثر نہیں کر سکا ہم اس کی وفاداری تب مانتے جب یہ اپنے مالک کو بھی وفادار بنا دیتا۔

مضامین پطرس سب سے پہلے ۱۹۳۰ء میں شائع ہوئے۔ مضامین پطرس گیارہ مزاحیہ مضامین پر مشتمل ہے۔ پطرس نے کتاب کے ابتداء میں اپنے استاد پروفیسر محمد سعید کے نام انتساب کیا ہے۔ جنہوں نے اس کتاب پر نظر ثانی کی اور اسے غلطیوں سے پاک کیا۔ ایک سچے عالم اور تخلیق کار کی پہلی نشانی ہی یہی ہے کہ وہ انکسار اور عاجزی کو اپنا وطیرا بنائے رکھتا ہے پطرس بڑی فراخ دلی سے اپنی کمزریوں کا اعتراف کر کے ایک عظیم انسان ہونے کا ثبوت دیتا ہے۔ انتساب کے بعد دیباچے سے مزاح کا باقاعدہ آغاز ہو جاتا ہے۔ اپنے دلچسپ دیباچے میں انھوں نے اختصار، حقیقت اور طنز و مزاح سبھی کچھ سمو دیا ہے دیباچے میں پطرس کڑوی گولی شکر میں لپیٹ کر پیش کرتے دکھائی دیتے ہیں اور دیباچے میں ہی خود اپنی کتاب اور اپنی ذات کو مزاح کے لئے پیش کر دیتے ہیں:

''اگر یہ کتاب آپ کو کسی نے مفت بھیجی ہے تو مجھ پر احسان کیا ہے اگر آپ نے کہیں سے چرائی ہے تو میں آپ کے ذوق کی داد دیتا ہوں۔ اپنے پیسوں سے خریدی ہے تو مجھے آپ سے ہمدردی ہے اب بہتر یہ ہے کہ آپ اسے اچھا سمجھ کر اپنی حماقت کو حق بجانب ثابت کریں۔''

کتاب کے تقریباً سارے مضامین میں انھوں نے اسی روش کو برقرار رکھا ہے اور کہیں بھی کسی اور کو طنز کا نشانہ نہیں بنایا اس لئے وہ اُردو ادب میں خالص مزاح نگاری کے علمبردار دکھائی دیتے ہیں۔ مجموعی طور پر مضامین پطرس میں، پطرس نے انگریزی مزاح کے تقریباً سبھی حربوں سے فائدہ اُٹھایا ہے۔ لیکن اُن کا پسندیدہ حربہ صورت واقعہ ہے۔ ہر مضمون اس حربے سے مزین نظر آتا ہے مزاح میں صورت واقعہ ایک مشکل حربہ سمجھا جاتا ہے کیونکہ فنکار کی ذرا سی شعوری کوشش بنا بنایا کھیل بگاڑ سکتی ہے۔ اس لحاظ سے پطرس نہایت کامیاب مزاح نگار کہے جاسکتے ہیں کہ وہ کہیں بھی اپنا رشتہ قاری سے نہیں توڑتے اور ہر حربے کا استعمال خوبی اور غیر شعوری طور پر کر جاتے ہیں۔

پطرس خالص مزاح نگار ہونے کے ساتھ ساتھ فنکار بھی نظر آتے ہیں ایک خالص مزاح نگار کی حیثیت سے ہر مضمون میں مزاح کے لئے اپنی ذات کو پیش کرتے ہیں اور ایک متوازن فنکار کے لحاظ سے ہم دیکھتے ہیں کہ چاہے کتوں کا خوف ہو، ہاسٹل میں داخلہ ہو، سحر خیزی ہو، لیڈری میں انڈے کھانے ہوں، سینما کا عشق ہو، بیوی سے وفاداری والا معاملہ ہو، میبل سے کتاب بینی کا مقابلہ ہو یا سائیکل پر سوار ہو کر گر پڑنا ہو وہ کہیں بھی اپنی ذات کو یوں پیش

کرتے ہیں کہ قاری اسے مسخرہ یا بانڈھ سمجھے۔ وہ زندگی کی ناہمواریوں کو یوں سامنے لاتے ہیں کہ قاری بھی اُسے ہمدردی سے دیکھنے لگتا ہے اوراس خوبی نے ان کی مزاح کو اعلیٰ درجے کی ظرافت کا درجہ دیا ہے۔

پطرس کا شاہکار مضمون ''کتے'' اردو مزاح نگاری کی روایت میں اہم سنگ میل ہے اس موضوع پر ایسا بہترین مضمون صرف پطرس ہی لکھ سکتے ہیں:

''علم الحیوانات کے پروفیسروں سے پوچھا سلوتریوں سے دریافت کیا۔خود سر کھپاتے رہے لیکن کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ آخر کتوں کا کیا فائدہ ہے۔۔۔ کہنے لگے وفادار جانور ہے اب جناب اگر وفاداری اگر اِسی کا نام ہے کہ شام کے سات بجے جو بھونکنا شروع کیا تو لگا تار بغیر دم لئے صبح کے چھ بجے تک بھونکتے ہی چلے گئے تو ہم لنڈورے ہی بھلے۔'' اِس مضمون میں مزاح کے حربے موازنہ سے پطرس نے مزاحیہ صورت حال پیدا کی ہے۔ کتے پطرس کا شاہکار مضمون ہے اس کو پڑھ کر ان کے گہرے مشاہدے اور انداز بیان کے ساتھ ساتھ باریک بینی کی داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ کتوں اور پھر سڑک کے کتوں سے کون نالاں نہیں ان کے بھونکنے کی آوازیں کس کے ہوش نہیں اُڑا دیتی مگر ان کے بھونکنے اور ایک دوسرے سے سُر ملانے کو مشاعرے سے تشبیہ دینا ہر شخص کے بس کا روگ نہیں یہ کام صرف پطرس ہی کر سکتا ہے۔ چند ناقدین نے یہ تک کہہ دیا کہ، ''کتوں کو اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ پطرس اُن پر ایک شاہکار مضمون لکھ سکے۔''

کتوں سے ڈرنے کا حال بھی کسی سے پوشیدہ نہیں یہ ہم میں سے اکثر کی آپ بیتی ہے لیکن پطرس نے سیدھے سادھے انداز میں ایسی تصویر کشی کی ہے کہ مبالغہ آمیزی کا شائبہ تک نہیں ملتا وہ لکھتے ہیں،

''اگر آپ نے ہم جیسی طبیعت پائی ہو تو آپ دیکھیں گے کہ ایسے موقعوں پر آیۃ الکرسی آپ کے ذہن سے اتر جائے گی اور اس کی جگہ شائد آپ دعا قنوط پڑھنے لگ جائیں۔''

اس مضمون میں رعایت لفظی، موازنہ اور صورت واقعہ کے حربے آزمائے گئے ہیں جبکہ پیروڈی بھی موجود ہے۔

کہو کس سے میں کہ کیا ہے سگِ راہ بری بھلا ہے
مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

پھر سعادت حسن منٹو کا ٹیٹوال کا کتا بھی تو یاد کیجئے نا

''کئی دن سے طرفین اپنے اپنے مورچے پر جمے ہوئے تھے۔ دن میں ادھر اور ادھر سے دس بارہ فائر کیے جاتے جن کی آواز کے ساتھ کوئی انسانی چیخ بلند نہیں ہوتی تھی۔ موسم بہت خوشگوار تھا۔ ہوا خودرو پھولوں کی مہک میں بسی ہوئی تھی۔ پہاڑیوں کی اونچائیوں اور ڈھلوانوں پر جنگ سے بے خبر قدرت اپنے مقررہ اشغال میں مصروف تھی۔ پرندے اسی طرح چہچہاتے تھے۔ پھول اسی طرح کھل رہے تھے اور شہد کی سست رو کھیاں اسی پرانے ڈھنگ سے ان پر اونگھ اونگھ کر رس چوستی تھیں۔

جب پہاڑیوں میں کسی فائر کی آواز گونجتی تو چہچہاتے ہوئے پرندے چونک کر اڑنے لگتے، جیسے کسی کا ہاتھ ساز کے غلط تار سے جا ٹکرایا ہے۔ اور ان کی سماعت کو صدمہ پہنچانے کا موجب ہوا ہے۔ ستمبر کا انجام اکتوبر کے آغاز سے بڑے گلابی انداز میں بغل گیر ہو رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ موسمِ سرما اور گرما میں صلح صفائی ہو رہی ہے۔ نیلے نیلے آسمان پر دھنکی ہوئی روئی ایسے پتلے پتلے اور ہلکے ہلکے بادل یوں تیرتے تھے جیسے اپنے سفید بجروں میں تفریح کر رہے ہیں۔

پہاڑی مورچوں میں دونوں طرف کے سپاہی کئی دن سے بڑی کوفت محسوس کر رہے تھے کہ کوئی فیصلہ کن بات کیوں وقوع پذیر نہیں ہوتی۔ اکتا کر ان کا جی چاہتا تھا کہ موقع بے موقع ایک دوسرے کو شعر سنائیں۔ کوئی نہ سنے تو ایسے ہی گنگناتے رہیں۔ پتھریلی زمین پر اوندھے یا سیدھے لیٹے رہتے تھے۔ اور جب حکم ملتا تھا ایک دو فائر کر دیتے تھے۔

دونوں کے مورچے بڑی محفوظ جگہ تھے۔ گولیاں پوری رفتار سے آتی تھیں اور پتھروں کی ڈھال کے ساتھ ٹکرا کر وہیں چت ہو جاتی تھیں۔ دونوں پہاڑیاں جن پر یہ مورچے تھے۔ قریب قریب ایک قد کی تھیں۔ درمیان میں چھوٹی سی سبز پوش وادی تھی جس کے

سینے پر ایک نالہ موٹے سانپ کی طرح لوٹتا رہتا تھا۔

ہوائی جہازوں کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ توپیں ان کے پاس تھیں نہ ان کے پاس، اس لیے دونوں طرف بے خوف وخطر آگ جلائی جاتی تھیں۔ ان سے دھوئیں اٹھتے اور ہواؤں میں گھل مل جاتے۔ رات کو چونکہ بالکل خاموشی ہوتی تھی، اس لیے کبھی کبھی دونوں مورچوں کے سپاہیوں کو ایک دوسرے کے کسی بات پر لگائے ہوئے قہقہے سنائی دے جاتے تھے۔ کبھی کوئی لہر میں آ کے گانے لگتا تو اس کی آواز رات کے سناٹے کو جگا دیتی۔ ایک کے پیچھے ایک بازگشت صدائیں گونجتیں تو ایسا لگتا کہ پہاڑیاں آموختہ دہرا رہی ہیں۔

چائے کا دور ختم ہو چکا تھا۔ پتھروں کے چولھے میں چیڑ کے ہلکے پھلکے کوئلے قریب قریب سرد ہو چکے تھے۔ ا؟ سمان صاف تھا۔ موسم میں خنکی تھی۔ ہوا میں پھولوں کی مہک نہیں تھی جیسے رات کو انھوں نے اپنے عطردان بند کر لیے تھے، البتہ چیڑ کے پسینے یعنی بروزے کی بو تھی مگر یہ بھی کچھ ایسی ناگوار نہیں تھی۔ سب کمبل اوڑھے سو رہے تھے، مگر کچھ اس طرح کہ ہلکے سے اشارے پر اٹھ کر لڑنے مرنے کے لیے تیار ہو سکتے تھے۔ جمعدار ہرنام سنگھ خود پہرے پر تھا۔ اس کی راسکوپ گھڑی میں دو بجے تو اس نے گنڈا سنگھ کو جگایا اور پہرے پر متعین کر دیا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ سو جائے، پر جب لیٹا تو آنکھوں سے نیند کو اتنا دور پایا جتنے کہ آسمان کے ستارے تھے۔ جمعدار ہرنام سنگھ چت لیٹا ان کی طرف دیکھتا رہا۔۔۔۔۔۔ اور گنگنانے لگا۔

جتی لینی آں ستاریاں والی۔۔۔۔۔۔ ستاریاں والی۔۔۔ وے ہرنام سنگھا

ہو یارا، بھاویں تیری مہیں وک جائے

اور ہرنام سنگھ کو آسمان ہر طرف ستاروں والے جوتے بکھرے نظر آئے۔ جو جھلمل جھلمل کر رہے تھے

جتی لے دوں ستاریاں والی۔۔۔۔۔ ستاریاں والی۔۔۔۔۔ نی ہرنام کورے

ہو نارے، بھاویں میری مہیں وک جائے

یہ گا کر وہ مسکرایا، پھر یہ سوچ کر کہ نیند نہیں آئے گی، اس نے اٹھ کر سب کو جگا دیا۔ نار کے ذکر نے اس کے دماغ میں ہلچل پیدا کر دی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ اوٹ پٹانگ گفتگو ہو، جس سے اس بولی کی ہرنام کوری کیفیت پیدا ہو جائے۔ چنانچہ باتیں شروع ہوئیں مگر اُکھڑی اُکھڑی رہیں۔ بنتا سنگھ جوان سب میں کم عمر اور خوش ا؟ واز تھا، ایک طرف ہٹ کر بیٹھ گیا۔ باقی اپنی بظاہر پر لطف باتیں کرتے اور جمائیاں لیتے رہے۔ تھوڑی دیر کے بعد بنتا سنگھ نے ایک دم اپنی پرسوز آواز میں ہیر گانا شروع کر دی۔

ہیر آکھیا جوگیا جھوٹھ بولیں، کون روٹھڑے یار مناؤندائی

ایسا کوئی نہ ملیا میں ڈھونڈ تھکی جیہڑا گیاں نوں موڑ لیاؤندائی

اک باز تو کانگ نے کونج کھوئی دیکھاں چپ ہے کہ کرلاؤندائی

دکھاں والیاں نوں گلاں سُکھدیاں نی قصے جوڑ جہان سناؤندائی

پھر تھوڑے وقفے کے بعد اس نے ہیر کی ان باتوں کا جواب رانجھے کی زبان میں گایا

جیہڑے بازتوں کانگ نے کونج کھوئی صبر شکر کر بازفناہ ہویا

اینویں حال ہے اس فقیر دانی دھن مال گیا تے تباہ ہویا

کریں صدق تے کم معلوم ہووے تیرا رب رسول گواہ ہویا

دنیا چھڈ اداسیاں پہن لیاں سید وارثوں ہن وارث شاہ ہویا

بنتا سنگھ نے جس طرح ایک دم گانا شروع کیا تھا، اسی طرح وہ ایک دم خاموش ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خاکستری پہاڑیوں نے بھی اداسیاں پہن لی ہیں۔ جمعدار ہرنام سنگھ نے تھوڑی دیر کے بعد کسی غیر مرئی چیز کو موٹی سی گالی دی اور لیٹ گیا۔ دفعتہً رات کے آخری پہر کی اس اداس فضا میں کتے کے بھونکنے کی آواز آئی۔ سب چونک پڑے۔ آواز قریب سے آئی تھی۔ صوبیدار ہرنام سنگھ نے بیٹھ کر کہا۔ ’’یہ کہاں سے آ گیا بھونکو؟‘‘

کتا پھر بھونکا۔ اب اس کی آواز اور بھی نزدیک سے آئی تھی۔ چند لمحات کے بعد دور جھاڑیوں میں آہٹ ہوئی۔ بنتا سنگھ اٹھا اور اس کی طرف بڑھا۔ جب واپس آیا تو اس کے ساتھ ایک آوارہ سا

کتا تھا جس کی دم ہل رہی تھی۔ وہ مسکرایا۔ ''جمعدار صاحب۔ میں ہو کر ادھر بولا تو کہنے لگا، میں ہوں چپڑ جھن جھن!''

سب ہنسنے لگے۔ جمعدار ہرنام سنگھ نے کتے کو پچکارا۔ ''ادھر آ چپڑ جھن جھن۔''

کتا دم ہلاتا ہرنام سنگھ کے پاس چلا گیا اور یہ سمجھ کر کہ شاید کوئی کھانے کی چیز پھینکی گئی ہے، زمین کے پتھر سونگھنے لگا۔ جمعدار ہرنام سنگھ نے تھیلا کھول کر ایک بسکٹ نکالا اور اس کی طرف پھینکا۔ کتے نے اسے سونگھ کر منہ کھولا، لیکن ہرنام سنگھ نے لپک کر اسے اٹھالیا۔ ''ٹھہر۔ کہیں پاکستانی تو نہیں!''

سب ہنسنے لگے۔ سردار بنتا سنگھ نے آگے بڑھ کر کتے کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا اور جمعدار ہرنام سنگھ سے کہا۔ ''نہیں جمعدار صاحب، چپڑ جھن جھن ہندوستانی ہے۔''

جمعدار ہرنام سنگھ ہنسا اور کتے سے مخاطب ہوا۔ ''نشانی دکھا اوئے؟''

کتا دم ہلانے لگا۔

ہرنام سنگھ ذرا کھل کے ہنسا۔ ''یہ کوئی نشانی نہیں۔ دم تو سارے کتے ہلاتے ہیں۔''

بنتا سنگھ نے کتے کی لرزاں دم پکڑلی۔ ''شرنارتھی ہے بے چارہ!''

جمعدار ہرنام سنگھ نے بسکٹ پھینکا جو کتے نے فوراً دبوچ لیا۔ ایک جوان نے اپنے بوٹ کی ایڑھی سے زمین کھودتے ہوئے کہا۔ ''اب کتوں کو بھی یا تو ہندوستانی ہونا پڑے گا یا پاکستانی!''

جمعدار نے اپنے تھیلے سے ایک بسکٹ نکالا اور پھینکا۔ ''پاکستانیوں کی طرح پاکستانی کتے بھی گولی سے اڑا دیے جائیں گے!''

ایک نے زور سے نعرہ بلند کیا۔ ''ہندوستان زندہ باد!''

کتا جو بسکٹ اٹھانے کے لیے آگے بڑھا تھا ڈر کے پیچھے ہٹ گیا۔ اس کی دم ٹانگوں کے اندر گھس گئی۔ جمعدار ہرنام سنگھ ہنسا۔ ''اپنے نعرے سے کیوں ڈرتا ہے چپڑ جھن جھن۔۔۔۔۔۔ کھا۔۔۔۔۔۔ لے ایک اور لے۔'' اس نے تھیلے سے ایک اور بسکٹ نکال کر اسے دیا۔

باتوں باتوں میں صبح ہوگئی۔ سورج ابھی نکلنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ چار سو اجالا ہوگیا۔ جس طرح بٹن دبانے سے ایک دم بجلی کی روشنی ہوتی ہے۔ اسی طرح سورج کی شعاعیں دیکھتے ہی دیکھتے ہی اس پہاڑی علاقے میں پھیل گئی جس کا نام ٹیٹوال تھا۔

اس علاقے میں کافی دیر سے لڑائی جاری تھی۔ ایک ایک پہاڑی کے لیے درجنوں جوانوں کی جان جاتی تھی، پھر بھی قبضہ غیر یقینی ہوتا تھا۔ آج یہ پہاڑی ان کے پاس ہے، کل دشمن کے پاس، پرسوں پھر ان کے قبضے میں اس سے دوسرے روز وہ پھر دوسروں کے پاس چلی جاتی تھی۔

صوبیدار ہرنام سنگھ نے دوربین لگا کر آس پاس کا جائزہ لیا۔ سامنے پہاڑی سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ اس کا یہ مطلب تھا کہ چائے وغیرہ تیار ہو رہی ہے ادھر بھی ناشتے کی فکر ہو رہی تھی۔ آگ سلگائی جارہی تھی۔ ادھر والوں کو بھی یقیناً ادھر سے دھواں اٹھتا دکھائی دے رہا تھا۔

ناشتے پر سب جوانوں نے تھوڑا تھوڑا کتے کو دیا جس کو اس نے خوب پیٹ بھر کے کھایا۔ سب اس سے دلچسپی لے رہے تھے جیسے وہ اس کو اپنا دوست بنانا چاہتے ہیں۔ اس کے آنے سے کافی چہل پہل ہوگئی تھی۔ ہر ایک اس کو تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد پچکار کر ''چپڑ جھن جھن'' کے نام سے پکارتا اور اسے پیار کرتا۔

شام کے قریب دوسری طرف پاکستانی مورچے میں صوبیدار ہمت خان اپنی بڑی بڑی مونچھوں کو جن سے بے شمار کہانیاں وابستہ تھیں، مروڑے دے کر ٹیٹوال کے نقشے کا بغور مطالعہ کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وائرلیس آپریٹر بیٹھا تھا اور صوبیدار ہمت خاں کے لیے پلاٹون کمانڈر سے ہدایات وصول کر رہا تھا۔ کچھ دور ایک پتھر سے ٹیک لگائے اور اپنی بندوق لیے بشیر ہولے ہولے گنگنا رہا تھا۔

چن کتھے گوائی آئی رات وے۔۔۔ چن کتھے گوائی آئی

بشیر نے مزے میں آکر ذرا اونچی آواز کی تو صوبیدار ہمت خان کی کڑک بلند ہوئی۔ ''اوئے کہاں رہا ہے تو رات بھر؟''

بشیر نے سوالیہ نظروں سے ہمت خان کو دیکھنا شروع کیا۔ جو بشیر کے بجائے کسی اور سے مخاطب تھا۔ ''بتا اوئے۔''

بشیر نے دیکھا۔ کچھ فاصلے پر وہ آوارہ کتا بیٹھا تھا جو کچھ دن ہوئے ان کے مورچے میں بن بلائے مہمان کی طرح آیا تھا اور وہیں ٹک گیا تھا۔ بشیر مسکرایا اور کتے سے مخاطب ہو کر بولا۔

''چن کتھے گوائی آئی رات وے۔۔۔ چن کتھے گوائی آئی؟

کتے نے زور سے دم ہلانا شروع کردی جس سے پتھریلی زمین پر جھاڑو سی پھرنے لگی۔

صوبیدار ہمت خاں نے ایک کنکر اٹھا کر کتے کی طرف پھینکا۔ ''سالے کو دم ہلانے کے سوا اور کچھ نہیں آتا!''

بشیر نے ایک دم کتے کی طرف غور سے دیکھا۔ ''اس کی گردن میں کیا ہے؟'' یہ کہہ کر وہ اٹھا، مگر اس سے پہلے ایک اور جوان نے کتے کو پکڑ کر اس کی گردن میں بندھی ہوئی رسی اتاری۔ اس میں گتے کا ایک ٹکڑا پرویا ہوا تھا۔ جس پر کچھ لکھا تھا۔ صوبیدار ہمت خاں نے یہ ٹکڑا لیا اور اپنے جوانوں سے پوچھا۔ ''لنڈے ہیں۔ جانتا ہے تم میں سے کوئی پڑھنا۔''

بشیر نے آگے بڑھ کر گتے کا ٹکڑا لیا۔ ''ہاں۔۔۔ کچھ کچھ پڑھ لیتا ہوں۔'' اور اس نے بڑی مشکل سے حرف جوڑ جوڑ کر یہ پڑھا۔ ''چپ۔۔۔ چپڑ۔۔۔ جھن۔۔۔ جھن۔۔۔ چپڑ۔۔۔ جھن جھن۔۔۔ یہ کیا ہوا؟''

صوبیدار ہمت خاں نے اپنی بڑی بڑی تاریخی مونچھوں کو زبردست مروڑا دیا۔ ''کوڈ ورڈ ہوگا کوئی۔'' پھر اس نے بشیر سے پوچھا۔ ''کچھ اور لکھا ہے بشیرے۔''

بشیر نے جو حروف شناسی میں مشغول تھا۔ جواب دیا۔ ''جی ہاں۔۔۔۔۔۔ یہ۔۔۔۔۔۔ ہند۔۔۔۔۔۔ ہند۔۔۔۔۔۔ ہندوستانی۔۔۔۔۔۔ یہ ہندوستانی کتا ہے!''

صوبیدار ہمت خاں نے سوچنا شروع کیا۔ ''مطلب کیا ہوا اس کا؟۔۔۔ کیا پڑھا تھا تم نے۔۔۔ چپڑ؟؟؟''

بشیر نے جواب دیا۔ ''چپڑ جھن جھن!''

ایک جوان نے بڑے عاقلانہ انداز میں کہا۔ ''جو بات ہے اسی میں ہے۔''

صوبیدار ہمت خان کو یہ بات معقول معلوم ہوئی۔ ''ہاں کچھ ایسا لگتا ہے۔''

بشیر نے گتے پر لکھی ہوئی عبارت پڑھی۔ ''چپڑ جھن جھن۔۔۔ یہ ہندوستانی کتا ہے!''

صوبیدار ہمت خان نے وائرلیس سیٹ لیا اور کانوں پر ہیڈ فون جما کر پلاٹوں کمانڈر سے خود اس کتے کے بارے میں بات چیت کی۔ وہ کیسے آیا تھا۔ کس طرح ان کے پاس کئی دن پڑا۔ پھر ایکا ایکی غائب ہو گیا اور رات بھر غائب رہا۔ اب آیا ہے تو اس کے گلے میں رسی نظر آئی جس میں گتے کا ایک ٹکڑا تھا۔ اس پر جو عبارت لکھی تھی وہ اس نے تین چار مرتبہ دہرا کر پلاٹون کمانڈر کو سنائی مگر کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔

بشیر الگ کتے کے پاس بیٹھ کر اسے کبھی پچکار کر، کبھی ڈرا دھمکا کر پوچھتا رہا کہ وہ رات کہاں غائب رہا تھا اور اسکے گلے میں وہ رسی اور گتے کا ٹکڑا کس نے باندھا تھا مگر کوئی خاطر خواہ جواب نہ ملا۔ وہ جو سوال کرتا، اس کے جواب میں کتا اپنی دم ہلا دیتا۔ آخر غصے میں آکر بشیر نے اسے پکڑ لیا اور زور سے جھٹکا دیا۔ کتا تکلیف کے باعث چاؤں چاؤں کرنے لگا۔

وائرلیس سے فارغ ہو کر صوبیدار ہمت خان نے کچھ دیر نقشے کا بغور مطالعہ کیا پھر فیصلہ کن انداز میں اٹھا اور سگریٹ کی ڈبیا کا ڈھکنا کھول کر بشیر کو دیا۔ ''بشیرے، لکھ اس پر گورمکھی میں۔۔۔ ان کیڑے مکوڑوں میں۔۔۔''

بشیر نے سگرٹ کی ڈبیا کا گتا لیا اور پوچھا۔ ''کیا لکھوں صوبیدار صاحب۔''

صوبیدار ہمت خاں نے مونچھوں کو مروڑے دے کر سوچنا شروع کیا۔ ''لکھ دے۔۔۔ بس لکھ دے!'' یہ کہہ اس نے جیب سے پنسل نکال کر بشیر کو دی ''کیا لکھنا چاہیے؟''

بشیر پنسل کے منہ کو لب لگا کر سوچنے لگا! پھر ایک دم سوالیہ انداز میں بولا ''سپڑ سُن سُن؟۔۔۔'' لیکن فوراً ہی مطمئن ہو کر اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا ''ٹھیک ہے۔۔۔ چپڑ جُھن جُھن کا جواب

سپڑسُن سُن ہی ہو سکتا ہے۔۔۔ کیا یاد رکھیں گے اپنی ماں کے سکھڑے۔''

بشیر نے پنسل سگرٹ کی ڈبیا پر جمائی۔ ''سپر سن سن؟''

''سولہ آنے۔۔۔ لکھ۔۔۔ سب۔۔۔ سپر۔۔۔ سن سن!'' یہ کہہ کر صوبیدار ہمت خاں نے زور کا قہقہہ لگایا۔'' اور آگے لکھ۔۔۔ یہ پاکستانی کتا ہے!''

صوبیدار ہمت خاں نے کتا بشیر کے ہاتھ سے لیا۔ پنسل سے اس میں ایک طرف چھید کیا اور رسی میں پرو کر کتے کی طرف بڑھا ''لے جا، یہ اپنی اولاد کے پاس!''

یہ سن کر سب خوب ہنسے۔ صوبیدار ہمت خاں نے کتے کے گلے میں رسی باندھ دی۔ وہ اس دوران میں اپنی دم ہلاتا رہا۔ اس کے بعد صوبیدار نے اسے کچھ کھانے کو دیا اور بڑے ناصحانہ انداز میں کہا۔ ''دیکھو دوست غداری مت کرنا۔۔۔ یاد رکھو غدار کی سزا موت ہوتی ہے!''

کتا دم ہلاتا رہا۔ جب وہ اچھی طرح کھا چکا تو صوبیدار ہمت خاں نے رسی سے پکڑ کر اس کا رخ پہاڑی کی اکلوتی پگڈنڈی کی طرف پھیرا اور کہا۔ ''جاؤ۔۔۔ ہمارا خط دشمنوں تک پہنچا دو۔۔۔ مگر دیکھو واپس آ جانا۔۔۔ یہ تمہارے افسر کا حکم ہے سمجھے؟''

کتے نے اپنی دم ہلائی اور آہستہ آہستہ پگڈنڈی پر جو بل کھاتی ہوئی نیچے پہاڑی کے دامن میں جاتی تھی چلنے لگا۔ صوبیدار ہمت خاں نے اپنی بندوق اٹھائی اور ہوا میں ایک فائر کیا۔

فائر اور اس کی بازگشت دوسری طرف ہندوستانیوں کے مورچے میں سنی گئی۔ اس کا مطلب اُن کی سمجھ میں نہ آیا۔ جمعدار ہرنام سنگھ معلوم نہیں کس بات پر چڑچڑا ہو رہا تھا، یہ آواز سن کر اور بھی چڑچڑا ہو گیا۔ اس نے فائر کا حکم دے دیا۔ آدھے گھنٹے تک چنانچہ دونوں مورچوں سے گولیوں کی بیکار بارش ہوتی رہی۔ جب اس شغل سے اکتا گیا تو جمعدار ہرنام سنگھ نے فائر بند کرا دیا اور داڑھی میں کنگھا کرنا شروع کر دیا۔ اس سے فارغ ہو کر اس نے جالی کے اندر سارے بال بڑے سلیقے سے جمائے اور بنتا سنگھ سے پوچھا۔ ''اوئے بنتاں سیاں! چپڑ جھن جھن کہاں گیا؟''

بنتا سنگھ نے چیڑ کی خشک لکڑی سے بروزہ اپنے ناخنوں سے جدا کرتے ہوئے کہا۔ ''کتے کو گھی ہضم نہیں ہوا؟''

بنتا سنگھ اس محاورے کا مطلب نہ سمجھا۔ ''ہم نے تو اسے گھی کی کوئی چیز نہیں کھلائی تھی۔''

یہ سن کر جمعدار ہرنام سنگھ بڑے زور سے ہنسا۔ ''اوئے ان پڑھ۔ تیرے ساتھ تو بات کرنا پچانویں کا گھاٹا ہے!''

اتنے میں وہ سپاہی جو پہرے پر تھا اور دوربین لگائے اِدھر سے اُدھر دیکھ رہا تھا۔ ایک دم چلایا۔ ''وہ۔۔۔ وہ آ رہا ہے!''

سب چونک پڑے۔ جمعدار ہرنام سنگھ نے پوچھا۔ ''کون؟''

پہرے کے سپاہی نے کہا۔ ''کیا نام تھا اس کا؟۔۔۔ چپڑ جُھن جُھن!''

''چپڑ جُھن جُھن؟'' یہ کہہ کر جمعدار ہرنام سنگھ اٹھا۔ ''کیا کر رہا ہے۔''

پہرے کے سپاہی نے جواب دیا۔ ''آ رہا ہے۔''

جمعدار ہرنام سنگھ نے دوربین اس کے ہاتھ میں لی اور دیکھنا شروع کیا۔۔۔ ''اِدھر ہی آ رہا ہے۔۔۔ رسی بندھی ہوئی ہے گلے میں۔۔۔ لیکن۔۔۔ یہ تو اُدھر سے آ رہا ہے دشمن کے مورچے سے۔'' یہ کہہ کر اس نے کتے کی ماں کو بہت بڑی گالی دی۔ اس کے بعد اس نے بندوق اٹھائی اور شست باندھ کر فائر کیا۔ نشانہ چوک گیا۔ گولی کتے سے کچھ فاصلے پر پتھروں کی کرچیں اڑاتی زمین میں دفن ہو گئی۔ وہ سہم کر رک گیا۔

دوسرے مورچے میں صوبیدار ہمت خاں نے دوربین میں سے دیکھا کہ کتا پگڈنڈی پر کھڑا ہے۔ ایک اور فائر ہوا تو وہ دم دبا کر الٹی طرف بھاگا۔ صوبیدار ہمت خاں کے مورچے کی طرف۔ وہ زور سے پکارا۔ ''بہادر ڈرا نہیں کرتے۔۔۔ چل واپس'' اور اس نے ڈرانے کے لیے ایک فائر کیا۔ کتا رک گیا۔ اُدھر سے جمعدار ہرنام سنگھ نے بندوق چلائی۔ گولی کتے کے کان سے سنساتی ہوئی گزر گئی۔ اس نے اچھل کر زور زور سے دونوں کان پھڑ پھڑانے شروع کیے۔ اُدھر سے صوبیدار ہمت خاں نے دوسرا فائر کیا جو اس کے اگلے پنجوں کے پاس پتھروں میں پیوست ہو گیا۔ بوکھلا کر کبھی

وہ ادھر دوڑا، کبھی ادھر۔ اس کی اس بوکھلاہٹ سے ہمت خاں اور ہرنام دونوں مسرور ہوئے اور خوب قہقہے لگاتے رہے۔ کتے نے جمعدار ہرنام سنگھ کے مورچے کی طرف بھاگنا شروع کیا۔ اس نے یہ دیکھا تو بڑے تاؤ میں آ کر موٹی سی گالی دی اور اچھی طرح شست باندھ کر فائر کیا۔ گولی کتے کی ٹانگ میں لگی۔ ایک فلک شگاف چیخ بلند ہوئی۔ اس نے اپنا رخ بدلا۔ لنگڑا لنگڑا کر صوبیدار ہمت خاں کے مورچے کی طرف دوڑنے لگا تو اُدھر سے بھی فائر ہوا، مگر وہ صرف ڈرانے کے لیے کیا گیا تھا۔ ہمت خاں فائر کرنے ہی چلایا۔ ''بہادر پروا نہیں کیا کرتے زخموں کی۔۔۔ کھیل جاؤ اپنی جان پر۔۔۔ جاؤ۔۔۔ جاؤ!''

کتا فائر سے گھبرا کر مڑا۔ ایک ٹانگ اس کی بالکل بیکار ہو گئی تھی۔ باقی تین ٹانگوں کی مدد سے اس نے خود کو چند قدم دوسری جانب گھسیٹا کہ جمعدار ہرنام سنگھ نے نشانہ تاک کر گولی چلائی جس نے اسے وہیں ڈھیر کر دیا۔

صوبیدار ہمت خاں نے افسوس کے ساتھ کہا۔ ''چچ چچ۔۔۔ شہید ہو گیا بے چارہ!''

جمعدار ہرنام سنگھ نے بندوق کی گرم گرم نالی اپنے ہاتھ میں لی اور کہا۔ ''وہی موت مرا جو کتے کی ہوتی ہے!''

۱۰۔۱۱ اکتوبر ۱۹۵۱ء

ملاحظہ فرمائیے آپ قارئین نے کتا گیری !!

اب سورۂ الکہف کا ''قطمیر'' کا احوال بھی بیاں ہو جائے، ہماری بیگم فرماتی ہیں یہ جنتی کتا ہے۔

(الکہف۔۱۸:۹-۲۲)

ترجمہ: کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ غار والوں اور کتبہ والوں کا معاملہ ہماری نشانیوں میں سے کوئی بڑی عجیب نشانی تھا؟ جب ان نوجوانوں نے غار میں پناہ لی تو کہنے لگے! اے ہمارے پروردگار! اپنی جناب سے ہمیں رحمت عطا فرما اور اس معاملہ میں ہماری رہنمائی فرما۔ تو ہم نے انھیں اس غار میں تھپکی دے کر کئی سال تک کے لئے سلا دیا، پھر ہم نے انھیں اٹھایا تاکہ معلوم کریں کہ ہر دو فریق میں سے کون اپنی مدت قیام کا ٹھیک حساب رکھتا ہے۔ ہم آپ کو ان کا بالکل سچا واقعہ بتاتے ہیں۔ وہ چند نوجوان تھے جو اپنے پروردگار پر ایمان لے آئے اور ہم نے انھیں مزید رہنمائی بخشی۔ اور ہم نے ان کے دلوں کو اس وقت مضبوط کر دیا جب انہوں نے کھڑا ہو کر اعلان کیا کہ: ہمارا رب تو وہی ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے۔ ہم اس کے سوا کسی اور الٰہ کو نہیں پکاریں گے۔ اگر ہم ایسا کریں تو یہ ایک بعید از عقل بات ہوگی''۔ (پھر آپس میں کہنے لگے) ''یہ ہماری قوم کے لوگ جنہوں نے اللہ کے سوا دوسروں کو الٰہ بنا رکھا ہے تو پھر یہ ان کے الٰہ ہونے پر کوئی واضح دلیل کیوں نہیں لاتے؟ بھلا اس شخص سے بڑا ظالم اور کون ہو سکتا ہے جو اللہ پر تہمت لگائے۔ اور اب جبکہ تم لوگوں نے اپنی قوم کے لوگوں سے اور ان کے معبودوں سے جنہیں یہ لوگ پوجتے ہیں، کنارہ کر ہی لیا ہے تو آؤ اس غار میں پناہ لے لو، تمہارا پروردگار تم پر اپنی رحمت وسیع کر دے گا اور تمہارے معاملہ میں آسانی پیدا کر دے گا۔ آپ دیکھیں گے کہ جب سورج نکلتا ہے تو ان کی غار سے دائیں طرف سے ہٹا رہتا ہے اور جب غروب ہوتا ہے تو بائیں طرف کترا کر غروب ہوتا ہے اور وہ نوجوان اس غار کی وسیع جگہ میں لیٹے ہیں۔ یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ جسے اللہ ہدایت دے وہی ہدایت پا سکتا ہے اور جسے وہ بھٹکا دے تو آپ اس کے لئے ایسا کوئی مددگار نہ پائیں گے جو اسے راہ راست پر لا سکے۔ (اے مخاطب تو انھیں دیکھے تو) سمجھے کہ وہ جاگ رہے ہیں حالانکہ وہ سوئے ہوئے ہیں۔ ہم ان کی دائیں اور بائیں کروٹ بدلتے رہتے ہیں اور ان کا کتا اس غار کے دہانے پر اپنے بازو پھیلائے ہوئے ہے۔ اگر تو انھیں جھانک کر دیکھے تو دہشت کے مارے بھاگ نکلے۔ اسی طرح ہم نے انھیں اٹھایا تاکہ وہ آپس میں کچھ سوال جواب کریں۔ ان میں سے ایک نے کہا ''بھلا تم کتنی مدت اس حال میں پڑے رہے؟'' ان میں سے کچھ نوجوانوں نے کہا ''یہی کوئی ایک دن یا دن کا کچھ حصہ'' اور بعض نے کہا: ''یہ تو اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ تم کتنی مدت اس حال میں پڑے رہے۔ اب یوں کرو کہ اپنا چاندی کا روپیہ (سکہ) دے کر کسی ایک کو شہر بھیجو کہ وہ

دیکھے کہ صاف ستھرا کھانا کہاں ملتا ہے۔ وہاں سے وہ آپ کے لئے کچھ کھانے کو لائے اور اسے نرم رویہ اختیار کرنا چاہئے۔ ایسا نہ ہو کہ کسی کو آپ لوگوں کا پتہ چل جائے۔ کیونکہ اگر ان لوگوں کا تم پر بس چل گیا تو یا تو تمہیں سنگسار کردیں گے یا پھر اپنے دین میں لوٹا لے جائیں گے۔ اندریں صورت تم کبھی فلاح نہ پاسکو گے۔ اس طرح ہم نے لوگوں کو اُن نوجوانوں پر مطلع کردیا تا کہ وہ جان لیں کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے اور قیامت بپا ہونے میں کوئی شک نہیں جبکہ وہ آپس میں ان نوجوانوں کے معاملہ میں جھگڑا کر رہے تھے۔ آخر ان میں سے کچھ لوگ کہنے لگے کہ یہاں ان پر ایک عمارت بنادو۔ ان کا معاملہ ان کا پروردگار ہی خوب جانتا ہے۔ مگر جو لوگ اس جھگڑے میں غالب رہے انہوں نے کہا کہ ہم تو یہاں ان پر مسجد بنائیں گے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہ نوجوان تین تھے، چوتھا ان کا کتا تھا، اور کچھ یہ کہتے ہیں کہ وہ پانچ تھے، چھٹا ان کا کتا تھا۔ یہ سب بے تکی ہانکتے ہیں۔ اور کچھ کہتے ہیں کہ وہ سات تھے اور آٹھواں ان کا کتا تھا۔ آپ ان سے کہئے کہ میرا پروردگار ہی ان کی ٹھیک تعداد جانتا ہے جسے چند لوگوں کے سوا دوسرے نہیں جانتے۔ لہذا آپ سرسری سی بات کے علاوہ ان سے بحث میں نہ پڑیئے اور ان کے بارے میں کسی سے کچھ پوچھئے نہیں۔ نیز کسی چیز کے متعلق یہ کبھی نہ کہئے کہ میں کل یہ ضرور کردوں گا۔ اِلا یہ کہ اللہ چاہے۔ اور اگر آپ بھول کر ایسی بات کہہ دیں تو فوراً اپنے پروردگار کو یاد کیجئے اور کہئے کہ: امید ہے کہ میرا پروردگار اس معاملہ میں صحیح طرزِ عمل کی طرف میری رہنمائی فرمادے گا۔ وہ نوجوان اپنے غار میں تین سو سال ٹھہرے رہے اور (کچھ لوگوں نے) نو سال زیادہ شمار کئے۔ آپ ان سے کہئے کہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے جتنی مدت وہ ٹھہرے رہے، اسی کو آسمانوں اور زمین کی پوشیدہ باتیں معلوم ہیں۔ وہ کیا ہی خوب دیکھنے والا اور سننے والا ہے۔ ان چیزوں کا اللہ کے سوا کوئی کارساز اور منتظم نہیں اور وہ اپنی حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔''

لیجئے اب کچھ ''قطمیر'' (جنتی کتے) کا بایوڈیٹا بھی نظر نواز ہو!

قطمیر اصحاب کہف کے کتے کا نام ہے جسے عبرانی میں (Caleb) اور انگریزی میں (Dog) کہتے ہیں۔

قرآن مجید سورۃ الکہف کی آیت ۲۲ میں اس کا ذکر ہے:

وَكَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيدِ

''اور ان کا کتا غار کے دہانے کے اندر اپنے دونوں اگلے ہاتھ پھیلائے پڑا ہے۔''

اکثر اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ اصحاب کہف کا کتا واقعی کتا ہی تھا، بعض علماء نے کہا کتا نہ تھا ''شیر'' تھا۔ کلب ہر درندہ کو کہتے ہیں؛ رسول اللہ ﷺ نے عتبہ بن ابی لہب کو بددعا دی تھی اور فرمایا تھا ''الٰہی اپنے کسی کلب کو اس پر مسلط کردے'' (بددعا قبول ہوئی) عتبہ کو شیر نے پھاڑ کھایا۔ اوّل قول معروف ہے اور دوسرا قول ابن جریج کا ہے۔ ابن عباس نے فرمایا وہ چت کبرا کتا تھا۔ ایک اور روایت میں آیا'' قبطی سے بڑا اور کردی (کتے) سے چھوٹا'' مقاتل نے کہا ''اس کا رنگ زرد تھا۔'' قرطبی نے کہا ''گہرا زرد مائل بسرخی تھا۔'' کلبی نے کہا ''اس کا رنگ دُھنی ہوئی اون (یا روئی) کی طرح تھا۔'' بعض نے کہا ''حجری رنگ تھا''۔ ابن عباس کے قول پر اس کا نام قطمیر اور علی المرتضی کے قول پر اس کا نام ریان تھا اوزاعی نے کہا تقور تھا سدی نے کہا ثور تھا اور کعب نے کہا صہبا تھا۔ خالد بن معدان نے کہا سوائے اصحاب کے کتے اور بلعم (بن باعورا) کے گدھے کے اور کوئی چوپایہ جنت میں نہیں جائے گا۔ سدی کا قول ہے اصحاب کہف کروٹ لیتے تھے تو کتا بھی ان کے ساتھ کروٹ لیتا تھا۔ اصحاب کہف دائیں طرف کروٹ لیتے تھے تو کتا اپنا دایاں کان موڑ کر (دائیں) بل پر ہوجاتا تھا اور اصحاب کہف بائیں کروٹ لیتے تھے تو کتا اپنا بایاں کان توڑ کر (بائیں) بل پر ہوجاتا تھا۔

علی المرتضی اصحاب کہف کے یہ نام بتلاتے تھے۔ یملیخا، مکشلمینا، مشلینیا، بادشاہ کے دائیں طرف والوں میں سے تھے اور مرنوش، برنوش، شاذنوش بائیں طرف والوں میں سے اور ساتواں ایک چرواہا تھا جو راستہ میں ان کے ساتھ ہولیا تھا اور ان کے کتے کا نام قطمیر تھا اور شہر کا افسوس۔ (بیضاوی)۔ جبکہ "معجم الاوسط" میں ابن عباس کا قول نقل ہے:

أَنَا مِنْ أُولٰئِكَ الْقَلِيل مكسمليثا، وَتمليخا وَهُوَالْمَبْعُوثُ بِالْوَرَق إِلى الْمَدِينَةِ،وَمرطولس، وَيثبونس،وَذرتونس،وَكفاشطيطوس، وَمنطنو اسيسوس وَهُوَ الرَّاعِي وَالْكَلْبُ اسْمُهٗ قِطْمِيرُہ

انسانوں میں سے اسے جاننے والے چند لوگ ہیں اور اس سے مراد اہل کتاب کا گروہ ہے؛ اور ابن عباس کہتے ہیں: ان چند آدمیوں میں سے میں بھی ہوں، وہ سات آدمی تھے اور ان میں ا؟ ٹھواں ان کا کتا تھا، پھر آپ نے ان سات کے ناموں سمیت ذکر کیا۔ اور رہا کتا تو اس کا نام قطمیر ہے،

ابن عباس نے کہا ہے۔ اور کتے کا نام حمران تھا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا نام قطمیر تھا۔ ابن ابی حاتم نے مجاہد سے روایت کیا کہ (آیت) ''وکلبھم ''یعنی ان کے کتے کا نام طمور رتھا۔ ابن منذر نے ابنِ جریج سے روایت کیا کہ میں نے ایک عالم آدمی سے پوچھا کہ وہ لوگ گمان کرتے ہیں کہ اصحاب کہف کا کتا شیر تھا تو انہوں نے فرمایا اللہ کی قسم وہ شیر نہیں تھا لیکن وہ سرخ کتا تھا ان کے ساتھ انکے گھروں سے نکلا تھا اس کو قطمور کہا جاتا تھا۔

اصحاب کہف کے کتے " قطمیر " کا تذکرہ:

ابن ابی حاتم نے کثیر النواء سے روایت کیا کہ اصحاب کہف کا کتا زرد رنگ کا تھا۔ ابن ابی حاتم نے سفیان کے طریق سے سفیان سے روایت کیا کہ کوفہ میں ایک آدمی کو عبید کہا جاتا تھا اور وہ جھوٹ کے ساتھ متہم نہ تھا اس نے کہا میں نے اصحاب کہف کے کتے کو دیکھا ہے گویا کہ وہ موٹی چادر کی طرح سرخ تھا۔ ابن ابی حاتم نے جویبر کے طریق سے عبید السواق سے روایت کیا کہ میں نے اصحاب کہف کے کتے کو چھوٹا دیکھا ہے جو اپنے بازوؤں کو پھیلائے ہوئے تھا غار کے دروازہ کی کھلی جگہ میں عبید السواق اشارہ کر کے بتاتے تھے کہ وہ اس طرح کانوں کو حرکت دیتا تھا۔

راجندر سنگھ بیدی نے لکھا ''جو لوگ کتے کی نفسیات سے واقف ہیں جانتے ہیں کہ آپ تھم جائیں تو کتا بھی تھم جاتا ہے اور مشکوک انداز سے دیکھتا ہوا کچھ دور کھڑا بھونکتا رہتا ہے۔ وہ کبھی تو ایک ٹک نووارد کی طرف دیکھتا ہے اور کبھی پیچھے کی طرف منہ کر کے مالکوں کو کچھ کہتا ہوا معلوم دیتا ہے۔ بیچ میں وہ اگلے پنجوں کے بل نیچا ہو ہو کر زمین کھدیڑتا، چھوٹی سی جست لیتا، آگے بڑھتا، پیچھے ہٹتا، سر کو چھوٹے بڑے جھٹکے دیتا ہوا مسلسل بھونکتا چلا جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہہ رہا ہے: " آبیٹا، ماں کا دودھ پیا ہے تو آ مقابلے پہ۔" وہ شہ دیتا ہے اور مات کھاتا ہے، لیکن یہ سب برابر والے کی اپنی ہمت پر منحصر ہے۔ اگر اس کی گلٹی جلدی جلدی اور تیز تیز ڈر کے لعاب کو خارج کرنے لگے تو کتا، جس کی سونگھنے کی قوت بے پناہ ہوتی ہے، پہلے معاملے کی تہہ پہ پہنچ جاتا ہے اور آخر آدمی کی تہہ پہ۔

(اقتباس: راجندر سنگھ بیدی کے افسانے "سونفیا" سے)

آوارہ کتے:

جی ہاں! ہماری تحقیق کے مطابق "کتے" بھی آوارہ ہو جایا کرتے ہیں، زیادہ آوارہ کتے ''پسند کی شادی'' کو ترجیح دیتے ہیں، گلیوں میں آوارہ پھرنے والے کتوں کی مجھے سمجھ نہیں آتی، جو کار بھی پاس سے گزرتی ہے اس کے ساتھ ساتھ دوڑنا شروع کر دیتے ہیں اور بھونکتے بھی چلے جاتے ہیں، انہیں اچھی طرح علم ہے کہ وہ کار میں بیٹھے ہوئے شخص کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے بلکہ اگر کار والا چاہے تو ان آوارہ کتوں کو بآسانی نیچے دے سکتا ہے مگر یہ باز نہیں آتے، شروع شروع میں میں سمجھتا تھا کہ شاید یہ اہلِ ثروت کے خلاف ہیں لیکن میں نے دیکھا کہ یہ تو ان موٹر سائیکل سواروں کا بھی پیچھا کرتے ہیں جنہوں نے یہ موٹر سائیکل قسطوں پر خریدی ہوتی ہے اور وہ بے چارے اتنے مجبور ہیں کہ کبھی غصے میں آ کر ان کتوں پر موٹر سائیکل چڑھانے کی کوشش کرتے ہیں تو کتا نیچے سے پھسل جاتا ہے اور وہ موٹر سائیکل سمیت لڑھکنیاں کھانے لگتے ہیں بلکہ گلیوں میں آوارہ پھرنے والے یہ کتے بے چارے سائیکل سواروں کو بھی نہیں بخشتے جو خالص ''پرولتاریوں'' کی ذیل میں آتے ہیں، چنانچہ وہ ان کا پائنچا پکڑ لیتے ہیں جسے چھڑانے کی کوشش میں ان کا ہینڈل ڈول جاتا ہے اور وہ منہ کے بل سڑک پر آن گرتے ہیں جس پر بچے بڑے سب کھڑ کھڑ ہنستے ہیں۔ کچھ کتوں کے بارے میں گمان یہ تھا کہ وہ ''بنیاد پرستوں'' کے خلاف

اپنے دل میں عناد رکھتے ہیں چنانچہ علی الصبح نماز کے لئے مسجد جانے والے ان ''بنیاد پرستوں'' پر وہ مسلسل بھونکتے ہیں اور ''خوں خوں'' کرتے ہوئے ان کی طرف بڑھنے کی کوشش بھی کرتے ہیں لیکن ان کے ہاتھ میں چھڑی دیکھ کر ادھر ادھر ہو جاتے ہیں، تاہم بعد میں یہ خیال بھی صحیح ثابت نہیں ہوا کیونکہ میں نے انہیں علی الصبح ان لوگوں پر بھی بھونکتے دیکھا جو محض سیر کے لئے گھروں سے نکلتے ہیں۔ ان آوارہ کتوں کی دستبرد سے میں نے اگر کسی کو محفوظ دیکھا ہے تو وہ میرے ایک ہمسائے ہیں جو بے چارے لنگڑا کر چلتے ہیں، کتے ان سے خوف زدہ رہتے ہیں، وہ ان کے لنگڑا کر چلنے سے یہ سمجھتے ہیں کہ شاید موصوف پتھر اٹھانے کے لئے نیچے کو جھکے ہیں، یہ اللہ کے کام ہیں کہ بسا اوقات کسی شخص کی معذوری کو اس کی دلیری سمجھ لیا جاتا ہے۔

میرے ایک دوست کتوں کی نفسیات کے ماہر ہیں اور وہ اس طرح کہ مختلف کتے، مختلف اوقات میں، انہیں مختلف مقامات پر آٹھ دس دفعہ کاٹ چکے ہیں، ان مسلسل حادثات کے نتیجے میں کتے ان کے حواس خمسہ پر چھا گئے ہیں چنانچہ ان کی کیفیت:

گفتگو کسی سے ہو ترا دھیان رہتا ہے
ٹوٹ ٹوٹ جاتا ہے سلسلہ تکلم کا

کی آئینہ دار ہو کر رہ گئی ہے یعنی گفتگو کوئی بھی ہو رہی ہو، وہ گھما پھرا کر اسے کتوں کے موضوع پر لے آتے ہیں، میں نے ان سے اپنے اس خلجان کا ذکر کیا کہ آوارہ کتوں کی آنکھوں میں کسی کا لحاظ کیوں نہیں ہے؟ میرا یہ سوال سن کر وہ کھل اٹھے اور ایک ہلکے سے تبسم کے ساتھ فرمایا ''بھائی! تم یہ کیوں بھولتے ہو کہ گلیوں میں آوارہ پھرنے والے کتوں کی نفسیات بنگلوں میں پرورش پانے والے کتوں سے مختلف ہوتی ہے۔ تمہیں پتہ ہے بنگلوں میں پرورش پانے والے کتے گرمیوں میں ائر کنڈیشنڈ کمروں میں رہتے ہیں اور سردیوں میں انہیں امپورٹڈ وول کی پوشاکیں پہنائی جاتی ہیں، ان کتوں کو جو خوراک ملتی ہے اس کے بچے کھچے کھانے سے کچھ گھروں میں چولہا جلتا ہے۔ اس کے برعکس گلی کے کتوں کو کیا ملتا ہے۔ بے چارے قصائی کی دکان کے سامنے تھوتھنی اٹھائے بیٹھے رہتے ہیں کہ وہ کوئی ہڈی ادھر پھینکے تو اسے گھٹنوں چوڑتے رہیں، گرمی کی شدت سے بچنے کے لئے وہ دکان کے چھجے کے نیچے پناہ لیتے ہیں تو انہیں روڑے مار کر وہاں سے بھگا دیا جاتا ہے، سردیوں کی طویل راتوں میں وہ باہر سڑک پر ٹھٹھرتے رہتے ہیں اور پھر آسمان کی طرف منہ اٹھا کر رونا شروع کر دیتے ہیں۔ آپ بڑ بڑ کرتے ہیں کہ انہوں نے شہریوں کا سکون تباہ کیا ہوا ہے؟ میں خود بھی سگ گزیدہ ہوں اور ایک آدھ دفعہ نہیں آٹھ دس دفعہ اس مرحلے سے گزرا ہوں مگر مجھے ان سے کوئی گلہ نہیں کہ اپنی محرومیوں کی وجہ سے یہ تو آپس میں بھی خون خرابہ کرتے رہتے ہیں، ایک گلی کا کتا دوسری گلی میں آ جائے تو مرنے مارنے پر تل جاتے ہیں کہ شاید یہ ان کے تھوڑے، بہت رزق میں بھی حصہ دار بن جائے گا۔ سو میرے بھائی نفرت تو ہم نے بہت کر کے دیکھ لی ہے، اب محبت کر کے بھی دیکھ لیں، ان پر الزامات بھی ہم بہت دھر چکے ہیں، اب ان کی محرومیاں بھی دور کر کے دیکھ لیں۔۔۔ کیا خیال ہے؟''

مجھے اپنے اس دوست سے گلی کے ان کتوں کے بارے میں اس لیکچر کی توقع نہیں تھی، میں نے تو ان کے سامنے یہ موضوع اس لئے چھیڑا تھا کہ وہ زخم خوردہ ہونے کی وجہ سے چار گالیاں اپنی طرف سے بھی اس ناکارہ نالائق مخلوق کو دیں گے مگر مجھے لگتا ہے جن آٹھ دس کتوں نے انہیں کاٹا تھا ان میں سے ایک پاگل کتا بھی تھا اور میرے یہ دوست پیٹ میں ٹیکے لگوانا بھول گئے چنانچہ اب میرا ارادہ کسی روز انہیں ذہنی امراض کے کسی ڈاکٹر کے پاس لے جانے کا ہے۔۔۔ مگر ایک مسئلہ تو اور بھی ہے، کچھ کھاتے پیتے کتے بھی تو بہت بھونکتے ہیں ان کا تقاضا ''ہل من مزید'' کا ہوتا ہے، مگر ''مزید'' مل بھی جائے تو ان کا پیٹ نہیں بھرتا۔ میں ذاتی طور پر ان کی بہت قدر کرتا ہوں کیونکہ یہ فطرت کے بہت قریب ہے۔ کتے کی فطرت ہر وقت بھونکتے رہنا ہی تو ہے!

اب کچھ " کتا، کتا پن اور ہماری نفسیات " پر بات کر لوں، ہماری خواہشیں گلی میں پھرنے والے کتوں کی طرح ہیں کہ جن سے ڈر کر بھاگو تو پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ بھونک بھونک کے ساری دُنیا کو مڑ مڑ کر دیکھنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ ہمارا تماشا بنواتے ہیں۔

کوئی ہنستا ہے تو کوئی تمسخر اُڑاتا ہے۔ اِن کے پاس سے جی کڑا کر چُپ چاپ گزر جاؤ تو کچھ بھی نہیں کہتے۔ کتا ہمیشہ کتا ہی رہتا ہے چاہے وہ گلی کا آوارہ کتا ہو یا گھر میں بڑی چاہ سے رکھا گیا پالتو کتا۔ اُس کی خصلت کبھی نہیں بدلتی۔ فرق صرف حسب نسب کا ہے۔ اُس سے لگاؤ کا ہے۔ کبھی گلی میں پھرنے والا کتا بھی آڑے وقت پر کام آ سکتا ہے، اگر چہ رہتا وہ ''دھوبی کا کتا ہی ہے جو گھر کا ہوتا ہے نہ گھاٹ کا''۔ کہا گیا کہ ''دل کو خواہش میں نہ مرنے دو بلکہ خواہش کو دل میں دفن کر دو''۔ لیکن اگر خواہش کو کتے کے مماثل جانا جائے تو کتا کتنا ہی اعلٰی نسل کا ہو، کتنا ہی پیارا ہو، مالک کا وفادار ہو اور اُس کی خاطر جان کی بازی لگا کر امر ہی کیوں نہ ہو جائے، اُس کی لاش کے پاس بیٹھ کر آنسو تو بہائے جا سکتے ہیں، اُس کا سوگ تو منایا جا سکتا ہے، ایک دلگداز یاد کی صورت اُسے اپنے گھر کے باغیچے میں دفن تو کیا جا سکتا ہے لیکن کبھی بھی اُس کی قبر گھر کے اندر نہیں بنائی جاتی۔ ہر وہ پاکیزہ جگہ ہے جہاں دُنیا کی اونچی نیچی غلاظت بھری شاہراہ پر ساتھ دینے والے جوتوں کے داخلے کی بھی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ اور انسان کا دل بھی ایسی ہی اِک جگہ ہے جہاں اُن محبتوں اور خواہشات کے لیے بھی کوئی جگہ نہیں جو ہمارے لیے بڑی کیف آور اور زندگی بخش ہوتی ہیں۔ اس کی مثال ایسے ہے جیسے گھر میں چاہے جتنے بھی پسندیدہ مہمان آ جائیں، مہینوں بلکہ سالوں بھی رہ جائیں، خوب ہلہ گلہ کریں، لیکن اُن کو جانا ہی پڑتا ہے۔ آخر میں گھر اور اُس کے مکین ہی رہ جاتے ہیں، رہے نام اللہ کا۔ رنگ نسل اور حسب نسب کو بالائے طاق رکھتے ہوئے دیکھا جائے تو کتے بہت ہی کتے ہوتے ہیں۔ قصور اُن کا نہیں، مسئلہ انسان کا ہے۔ انسان بھی عجیب ہے۔ کتوں سے پیار کی خاطر انسانوں کی پروا نہیں کرتا۔ انسان کو کتوں سے کم تر سمجھتا ہے لیکن خود اسے کتا کہہ دیا جائے تو مرنے مارنے پر تُل جاتا ہے۔ ''کتے'' کا لفظ اور اس کا نام ذہن میں آتے ہی بھوک اور بھونکنے کا تصور آتا ہے جو انسان اور اس کے رویوں کا استعارہ بھی ہے۔ انسان کی پیٹ گھڑی اسے بھوک سے بےحال کرتی ہے تو وہ کتوں کی طرح کھانے پر ٹوٹ پڑتا ہے۔ اور بھرے پیٹ کے

لوگوں کے لیے کتے پالنا، اُن کی سیوا کرنا، اپنے ہاتھ سے کھلا کر ان کی بھوک مٹانا اُن کی اپنی دُنیا کا سب سے بڑا لذت بخش مشغلہ ہے چاہے اس شغل سے دوسروں کو کتنی ہی اذیت کیوں نہ اُٹھانا پڑے۔ ''اذیت''۔ انسان کی بھوک نظر انداز کر کے حیوان کو فوقیت دینے کی نہیں۔ اذیت کا سبب کتوں کا وہ کتا پنا ہے جو وہ بھوک مٹا کر بھی نہیں چھوڑتے یا شاید انسان ان کی اصل بھوک سے لاعلم رہتا ہے۔ جسم اور جنس کے درمیان سر اٹھاتی بھوک چاہے کتوں کی ہو یا انسان کی، بہت بھیانک ہوتی ہے، اپنے نفع نقصان کی غرض سے آزاد، انتہائی قابلِ نفرین اور قابلِ رحم بھی۔ یہی بھوک انسان کو کتوں کے مقابل لا کھڑا کرتی ہے تو کبھی اپنے شرف کی پہچان بھی بھلا دیتی ہے۔ ابراہام لنکن کا کہنا تھا ''تمہاری آزادی وہاں ختم ہو جاتی ہے جہاں دوسرے کی ناک شروع ہوتی ہے''۔ کتوں کا بھونکنا اُن کا وہ ''کتا پن'' ہے جو اُن کے چہیتے کے لیے اگر محض ادا ہے تو سزا ہے ان کے لیے جن کا ان کتوں سے براہ راست تعلق نہیں ہوتا، پھر بھی انہیں ان کتوں کو نہ چاہتے ہوئے بھگتنا پڑتا ہے۔ پڑوسیوں کے لیے ایک ایسا عذاب جو راتوں کی نیندیں اُڑا کر رکھ دیتا ہے۔ بے حسی کا یہ عذاب بھی ہمارے جیسے ملک میں ہی سر اٹھاتا ہے، باہر کے ممالک میں بھی کتے بہت ہی کتے تو ہوتے ہیں لیکن وہاں انسان ان کتوں کی نفسیات سمجھ کر اس کا حل تلاش کرتے ہیں۔ ایسی دوائیں دیتے ہیں کہ کتے بلاوجہ اپنا کتا پن نہ دکھائیں۔ وہ اپنے پالتو کی ہر ضرورت کا خیال رکھتے ہیں اس کے باوجود بھی اگر کبھی انجانے میں ان کے کتے کی وجہ سے کسی کو ذہنی اذیت ہو تو نہ صرف سزا کے لیے تیار ہو جاتے ہیں بلکہ آئندہ محتاط بھی رہتے ہیں۔ ہمارے ہاں اس کے بالکل الٹ ہوتا ہے۔ سب سے پہلے تو زیادتی چاہے کسی بھی سطح پر ہو، شکایت کرنے والا اپنوں کی حمایت کھو بیٹھتا ہے۔ اصل میں ہمارے ہاں اپنے حق کے لیے آواز اٹھانے کا رواج نہیں۔ ہم تو بڑی بڑی زیادتیوں پر خود ساختہ ''صبر'' کی خاموشی اختیار کر لیتے ہیں کہ کیچڑ کی شکایت کرنے سے بلاوجہ چھینٹے ہی اُڑیں گے۔ بڑے گھروں میں رہنے والے تو ویسے ہی بہت تمیز دار ہوتے ہیں۔ اُن کے نزدیک لڑائی جھگڑے اور چھوٹی

چھوٹی باتوں کا ایشو بنانا انتہائی بیوقوفی اور وقت کا زیاں ہے۔
آخری بات ''کتے کتے ہی رہتے ہیں اور ہمیشہ کتے ہی رہیں گے کہ یہ ان کی جبلت اور فطرت ہے، اور ان کی حیوانیت کی دلیل بھی، جس پر یقین رکھنا ہماری عقل کی سلامتی کا امتحان ہے لیکن انسان جو اشرف المخلوقات کا درجہ رکھتا ہے، اس کے رویوں کا کتا پن برداشت کرنا ہی اصل آزمائش ہے۔''

لیجئے جناب!

اب سب مل جل کر جناب نُور خان صاحب کو دعائیں دیجئے جن کی ایک "سکیانہ پوسٹ" نے ہماری رات کالی کر دی اور اب ہمارا بھونکنے کو تو دل نھیں چاہ رہا، البتہ ٹانگ دبوچنے، چبانے، نگلنے، چھوڑنے، پھولنے کو جی چاہ رہا ہے جیسا مرحوم مہدی حسن صاحب غزل کے مصرعوں کے ساتھ کیا کرتے تھے۔

سلام علیکَ یاحبیبی!!

اللہ ہم سب کو کتوں سے پناہ دے اور ایسے کُتے نما انسانوں سے بھی جن سے کُتے بھی شرماتے ہیں۔

ابھی، کیا سمجھے بھائی جان!! مہربان!! قدردان!

خوش، سلامت، مالامال رہیۓ! آمین!!

نوٹ: قارئین کا لہواگر زیادہ جوش مارے تو وہ جناب نُور محمد خان سے اجازت لے کر " کتیات " پر پی ایچ ڈی کا مقالہ ہمارے مختصر لیکن جامع ترین، مضمون کی مدد سے باندھ سکتے ہیں، کوئی نہ کوئی سگ گزیدہ جامعہ پی ایچ ڈی کی ڈگری دے ہی دے گی، بلکہ ہم تو کہیں گی ایک جامعہ " جامعۂ سکیانہ " ہونا چاہئے، جہاں محض کتوں پر تحقیق ہو، اس کے اعزازی پروفیسروں میں ہم اور نُور خان تو اعزازی اراکین بھی ہوں، لیکن ہمارا راتب انسانی ہونا شرط ہے ہاہاہا،

وہ جون ایلیا والا حال نہ ہو کہ:

چبالیں کیوں نہ خود ہی اپنا ڈھانچا
تمھیں راتب مہیا کیوں کریں ہم

اگرچہ میں دماغی طور پر فعال ہو چکا ہوں، عقل مندی کی باتیں بھی کرنے لگا ہوں، پھر بھی لوگ مجھے ''پروفیسر'' کہتے ہیں اور ڈاکٹر کی گالی اَلگ نتھی کر دیتے ہیں ہاہاہاہا!!!!

حرلین زارا

سمجھ کا پھیر

آج تک کبھی میں نے اپنی کارستائیوں کا ماجرا قیس بکیوں کے گوش گزار نہیں کیا۔ عموماً یہ جو صنفِ کرخت سے متعلقین مخلوق ہے، یہ بی جمالو سے ہرگز ہرگز کم نہیں، کسی لڑکی کی کوئی بات ہاتھ لگ جائے تو ہر موقع پر سوکنوں کی طرح طعنہ زنی کرنا ان کی عادتِ ثانیہ ہے، تاہم یہ واقعہ چونکہ براہِ راست مجھ سے تعلق نہیں رکھتا، اس لئے میں اس کا اشتراک آپ لوگوں سے کرنا ناموزوں نہیں سمجھتی۔ یہ میری ایک نہایت عزیز سہیلی کی عموی نوعیت کی کہانی ہے، دلچسپ ہے یا نہیں، اس کا فیصلہ میں آپ لوگوں پر چھوڑتی ہوں۔

یہ قصہ ہے تب کا جب آتش ابھی جوان نہیں تھا، یعنی یہی کوئی میری جماعت نہم کی کہانی ہے۔ میں محلے بھر میں بقول چند ایک بزرگوں / بزرگنیوں کے، ''باندری'' کی طرح کودتی پھرتی تھی۔ اگرچہ ہمارے پورے خاندان میں مجھ جیسی کوئی مثال موجود نہیں تھی لیکن مجھے اپنے ماں باپ کا بھرپور لاڈ اور ساتھ میسر تھا اِسی باعث میں اس مثال کی موجد بن گئی، خیر مثالیں تو ہوتی ہی قائم کرنے کے لئے ہیں۔ محلے میں ہماری ایک کرکٹ کی ٹیم ہوا کرتی تھی جس کی قیادتِ باسعادت کا شرف میرے نحیف کاندھوں پر تھا۔ اس کرکٹ ٹیم میں مجھ سے کم عمر لڑکے اور لڑکیاں شامل تھیں۔ سب مل کر عموماً شام کے وقت اور جب گرمیوں کی چھٹیاں ہو جاتیں تو دن کے وقت بھی دھما چوکڑی مچایا کرتے تھے۔

یوں تو میری سب لڑکیوں سے ویسی ہی دوستی تھی جیسی پاکستان میں جمہوریت کی باریاں کھیلنے والوں کے درمیان ہوتی ہے، جو ہر نازک موقع پر ایک دوسرے کا سہارا بننے میں شیرِ پنجاب بن جاتے ہیں لیکن ہمارے گھر کے عین سامنے رہائش پذیر لڑکی سے میری دوستی قدرے زیادہ تھی۔۔۔جی کیا کہا؟ نام۔۔۔ چھوڑیئے جی، نام میں کیا دھرا ہے، بس یوں سمجھ لیجئے کہ وہ بھی میرے جیسی لڑکی تھی، آپ اُسے حرلین زارا دوئم بھی سمجھ سکتے ہیں، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔

ہم دونوں میں دن میں کئی کئی بار ٹاکرا رہتا تھا۔ وہ میرے بغیر رہ ہی نہیں پاتی تھی لیکن ایک بار کمال شمال کی ٹانگ ہی ٹوٹ گئی، مطلب یہ کہ وہ مجھ سے ملنے کے لئے پورے دو دنوں تک نہیں آئی۔ کچھ ایسا اتفاق ہو گیا تھا کہ مجھ سے بھی باہر نہ نکلا گیا، آخر دوسرے دن شام کو مجھے خیال آیا تو سوچا کہ چلو میں ہی اُس کی خیریت پوچھ آؤں۔

جب میں اُس کے گھر گئی تو اُس کے تلاشِ گمشدہ کے نوٹس کے بارے میں کسی سے دریافت کرنے کی نوبت نہ آئی، وہ باورچی خانے کے سامنے ہی مجھے نظر آئی، لیکن جن حالوں میں ملی، وہ منظر چونکا دینے والا تھا۔ آنکھ تھوڑی سوجی ہوئی تھی اور چہرے پر بھی سندھ کے میدانی نقشے جیسے کچھ نشانات پڑے ہوئے تھے۔

اُس کی حالت دیکھ کر مجھے دھچکا سا لگا تاہم میں نے اپنے تحیر پر قابو پاتے ہوئے اُس سے دریافت کیا کہ آخر اُس پر ایسی کیا قیامت گزر گئی کہ وہ وصی شاہ کے کسی ڈرامے کا دُکھیارا سا کردار بن کر رہ گئی ہے۔ اُس نے تیوریاں چڑھاتے ہوئے مجھے گھورا اور بولی ''میرے بوتھے پر سجے تمغوں سے پتہ نہیں چلتا کہ کیا ہوا ہے جو مجھ سے اس قسم کے دردناک سوالات کیے جا رہی ہو؟''

میں بولی ''ارے بھئی، تمھارا چہرہ تو کھلی کتاب ہے لیکن یہ کتاب اس قدر کیوں کھلی ہوئی ہے، اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آ رہی، کیا انکل کو تمھارے ماہانہ ٹسٹوں کے رزلٹ کا پتہ چل گئے ہے؟''

''نہیں پپا کا بھلا اس سے کیا لینا دینا، تمھیں پتہ نہیں کہ وہ تو پچھلے تین دنوں سے گھر میں نہیں ہیں؟''

واقعی یہ تو میں جانتی تھی کہ اُس کے پپا پچھلے کچھ دنوں سے مع اپنی بیگم کے کہیں گئے ہوئے تھے۔ وہ اور اس کا بڑا بھائی اور چھوٹے بہن بھائی گھر پر تھے۔ مجھے اس بات کا بھی اندازہ ہو رہا تھا کہ اُس اتھری محترمہ کا کسی سے کچھ جھگڑا وغیرہ ہو گیا ہوگا مگر اس ضمن میں تکے لگانا مناسب نہیں تھا۔ بات وہی ٹھیک ہوتی ہے جو روزِ روشن کی طرح واضح ہو، اس میں کوئی ابہام نہ ہو، چنانچہ میں نے کہا ''ارے بھئی! پتہ تو چلے کہ آخر ہوا کیا ہے، اس قدر سسپنس کیوں پیدا کر رہی ہو؟؟''

اُس نے برا سا منہ بنا کے اپنی کتھا شروع کر دی "یار بات صرف اِتنی سی ہے کہ امی لوگوں کے جانے کے بعد ہمارے برادِر بزرگ بھی غائب ہو گئے۔ محترم کوئی ڈیڑھ گھنٹے کے بعد تشریف لائے اور آتے ہی ایک آئی ڈراپ مجھے دکھائی جو بقول اُن کے، وہ اپنی آنکھوں میں ڈالنے کے لئے لائے تھے۔ میرے پوچھنے پر کہنے لگے کہ انہیں آنکھوں میں کچھ چبھن سی محسوس ہو رہی تھی، چنانچہ وہ آئی سپیشلسٹ کے پاس چلے گئے تھے، جس نے انہیں وہ والا آئی ڈراپ دیا تھا۔ ابھی وہ بات کر ہی رہے تھے کہ اُن کا ایک عزیز دوست انہیں بلانے آ گیا، غالباً بھائی نے اپنے دوست کے ساتھ کہیں جانے کا پروگرام بنا رکھا تھا۔ عجلت میں انہوں نے آئی ڈراپس میرے ہاتھ میں تھما دئے اور کسی نیوز چینل کی طرح تڑ تڑ بولے "ڈاکٹر نے کہا تھا کہ اِن آئی ڈراپس کو روشنی سے دُور کسی ٹھنڈی جگہ پر رکھنا ہے۔"

وہ تو ڈراپس کی ننھی منی سی شیشی مجھے تھما کر چلے گئے لیکن مجھے ایک بڑے پھواڑے میں مبتلا کر دیا۔۔۔ بھلا اس مصیبت خانہ کو کہاں رکھا جائے؟ پلنگ کے نیچے؟؟ پلنگ پر دبیز چادروں کے باعث روشنی تو نہیں ہو گی ہاں البتہ وہ جگہ ٹھنڈی بھی نہیں ہو گی۔ اب ہمارے گھر کی سرد ترین جگہ صرف اور صرف ریفریجریٹر تھا۔۔۔ بالکل، وہی موزوں ترین جگہ ہے اس کام کے لئے۔ میں ڈراپس کو لے کر فرج کی طرف گئی۔ فرج کا دروازہ کھولا تو فرج کی بتی جل گئی۔۔۔ کیا مصیبت ہے، جگہ ٹھنڈی بھی ہو اور روشنی والی بھی نہ ہو، کیسے ممکن تھا۔ ایک بات تو طے تھی کہ فرج سے زیادہ سرد مقام تو ہمارے گھر میں کوئی اور تھا ہی نہیں۔۔۔ لیکن یہ روشنی۔۔۔ خیر دنیا میں کوئی ایسا مسئلہ نہیں جس کا حل موجود نہ ہو۔۔۔ فرج میں اگر لائٹ ہے تو کیا ہوا، یہ جا بھی تو سکتی ہے۔ بھائی جان کی بتائی ہوئی دونوں شرائط پوری کرنے کے لئے میں نے "جیکی چن" کی طرح ایک زوردار نعرۂ یا ہو بلند کیا اور اچھل کر ایک فلائنگ کک بتی پر رسید کی، بتی جمہوری روایت کی طرح پل میں ٹوٹ پھوٹ گئی، لو جی کام بن گیا، ڈاکٹر اور بھائی جان صاحبان دونوں کی دونوں شرائط پوری ہوئیں، ڈراپس کو فرج کے اندر رکھا اور اطمینان سے لمبی تان کر سو رہی۔ جانے کب تک سوتی رہی، آنکھ بھائی جان کی دہاڑ سے کھلی، وہ غصے میں تھے اور مجھ کو ہی آوازیں دے رہے تھے۔۔۔ الٰہی خیر، کیا ہو گیا۔۔۔ میں دوپٹے کو سنبھالتی ہوئی، دوڑ کر اس کمرے میں پہنچی جہاں سے بھائی جان کی خوفناک آواز آ رہی تھیں۔ بھائی جان فرج کی بتی کے بارے میں استفسار کر رہے تھے۔ میں نے اپنی دانائی کی داستانِ ہوشربا پورے جوش و خروش سے اُن کے گوش گزار کی۔۔۔ اور پھر۔۔۔"

"اور پھر۔۔۔ پھر کیا ہوا؟" اُس کے چُپ ہو جانے پر میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"ہونا کیا تھا" وہ منہ بنا کر بولی "اُس وقت گھر میں کوئی تھا ہی نہیں جو مجھے چھڑاتا۔۔۔ اب دو دِنوں سے وہی آئی ڈراپس اپنی آنکھوں میں ڈال رہی ہوں۔"

دوست احباب ہمیں نئے نئے مشورے دینے لگے۔ کوئی کہتا کہ صبح دفتر جاتے وقت اخبار بیچتے جایا کرو۔ کوئی کہتا کہ اکیلے اخبار سے کیا بنے گا انڈے بھی ساتھ رکھ لیا کرو۔ ہم تو سوچا تھا کہ موٹر سائیکل کا عوام الناس پر رعب پڑے گا۔ بلاشبہ اس کی آواز اور دھوئیں کا تو لوگوں پر رعب پڑ چکا تھا مگر اس سے ہمارا اپنا رعب جاتا رہا تھا۔ اس کے ساز اور آواز سن کر ہم نے یہ اندازہ لگایا کہ اس سے دنیا ہی نہیں اپنی عاقبت بھی سنور سکتی ہے۔ وہ اس طرح کہ رمضان المبارک کے دوران اسے گلی کوچوں، محلوں میں چلا چلا کر سحری کے وقت شہر کے سوتے باآسانی جگائے جا سکتے ہیں۔ شروع شروع میں ہماری موٹر سائیکل فرمانبرداری سے سٹارٹ ہوتی رہی۔ پھر آہستہ آہستہ اس کے انجن سے شرم و حیا اڑتی گئی اور یہ عین مجمعے کے بیچ اڑیل ٹٹو کی طرح پیش رفت سے انکاری ہو جاتی۔ ہم اسے مستریوں اور کباڑیوں کی چیرہ دستیوں سے ڈراتے مگر اس کے گدھے کے کانوں جیسے ہینڈل پر جوں تک نہ رینگتی۔ اسی اثنا میں ہماری شادی خانہ آبادی ہو گئی مگر ہماری بیوی نے اسے ہمیشہ اپنی سوکن ہی سمجھا اور اس وقت تک چین سے نہ بیٹھی جب تک اسے مطلقہ نہ بنا دیا۔

ایوب صابر

لانگ مارچ یا لونگ مارچ

مارچ کئی قسم کے ہیں ان میں لانگ مارچ، شارٹ مارچ، ڈبل مارچ، ٹرین مارچ، روڈ مارچ، پیدل مارچ، مارچ پاسٹ اور ۲۳ مارچ زیادہ مقبول ہیں۔ مارچ کے لغوی معنی مست خرگوش کی طرح دیوانہ وار چھلانگیں مارتے ہوئے چلنا ہے۔ آج کل مارچ کے ساتھ لانگ کا سابقہ اس طرح لگا دیا جاتا ہے جسے طرح لونگ کے ساتھ مرچ کا لاحقہ جوڑ دیا جاتا ہے۔ ذرا غور کریں کہ لانگ مارچ اور لونگ مرچ کا آپس میں کیا رشتہ ہے؟ اس کے لئے اگر کسی احسن سے وکیل سے دریافت کریں تو اُسے دونوں پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ آپ جانتے ہیں ایسے لاینحل مسائل کے لئے حسبِ معمول مجھے خواجہ خوامخواہ کی رائے پر اعتماد کرنا پڑتا ہے لہٰذا مجھے صبح سویرے ''بے دل ناشتہ'' خواجہ خوامخوہ کے سامنے حاضر ہونا پڑا ہے۔ خواجہ خواہ مخواہ نے بھی مجھے ٹرخانے کے انداز میں اگلے ہفتے آنے کی ہدایت کردی۔ میں حیران تھا کہ اتنے معمولی سے مسئلے کے لئے اگلے ہفتے تک کا وقت کیوں دیا گیا ہے بالآخر یہ عقدہ کھلا کہ خواجہ خوامخوہ کی عقل داڑھ نکل رہی ہے۔ وہ بھی اگلے ہفتے تک انشورنس پالیسی کی طرح ''می چور'' ہوجائے گا۔ می چور سے یاد آیا کہ اپنے ہاں ''م چور'' لوگوں کی پہلے کیا ''شارٹ ایج'' ہے۔ ان کے تو پہلے ہی ہاتھ اور عمر دراز ہیں۔ اگلے ہفتے خواجہ مخواہ نے نے عقل کے ناخنوں سے سر کھجاتے ہوئے وضاحت کی کہ لانگ مارچ اور لونگ مرچ میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔

جب لوگوں کے باورچی خانے سے لونگ اور مرچ بھی غائب ہوجائیں تو لوگ مجبوراً لانگ مارچ پر نکل آتے ہیں۔ اس کے لئے مارچ کا بھی انتظار نہیں کیا جاتا۔ اسی لئے ہمارے ۶۵ سالہ کنوارے شیخ صاحب اکثر فرماتے ہیں کہ مارچ کا مہینہ ملک کے لئے بھاری ہوتا ہے۔ ایک زمانے میں لانگ مارچ صرف پیدل کیا جاتا تھا۔ اب تو پراڈو اور پجارو پر سوار ہو کر موٹروے پر جانے کو بھی لانگ مارچ کہا جاتا ہے۔ ایک دفعہ پہلے بھی بڑے میاں جی نے عدلیہ کی آزادی کے لئے لانگ مارچ شروع کیا تھا۔ اس لانگ مارچ نے حکمرانوں کی نیندیں اڑادی تھیں۔ اسی لئے اس وقت کے وزیرِ اعظم نے برضاورغبت رات سونے کے بجائے ۳ بجے ٹی وی پر نمودار ہو کر عدلیہ کی بحالی کا اعلان کردیا تھا۔

آخر کیا وجہ تھی کہ لانگ مارچ جب گوجرانوالہ داخل ہوا تو حکمرانوں کی کرسی کے پائے کانپنے لگے۔ دراصل گوجرانوالہ پہلوانوں کا شہر ہے اور جب میاں صاحب نے وہاں جا کر نعرہ لگایا ''گوجرانوالے دے پہلوان، کھان گریاں تے بادام، مارن مکی تے کڈ دین جان'' یہ سنتے ہی صاحبانِ اختیار کو فکر لاحق ہوگئی تھی اور انہوں کے جلدی سے عدلیہ کی بحالی کا اعلان کردیا تھا۔ اس کے بعد حکمرانوں نے کافی سوچ بچار کر کے ایسا پلان بنایا کہ کہ پہلوان گریاں بادام تو کیا لونگ اور مرچ کے لئے بھی ترس گئے۔

بادام سے یاد آیا کہ جب ہم خود بے دام ہو چکے ہیں تو بادام کھانے سے کیا ہمارے دام بڑھ جائیں گے۔ نجانے یہ بات کس حد تک درست ہے، لوگ کہتے ہیں جب تک ضمیر جعفری زندہ تھے، ہمارے ضمیر بھی زندہ تھے۔ جب ضمیر جعفری مرگئے تو ہمارا ضمیر بھی اُن کے ساتھ دفن ہوگیا۔ مارچ کی ایک قسم ڈبل مارچ ہے۔، جسے عُرف عام میں ڈوبل مارچ بھی کہا جاتا ہے۔ ڈوبل مارچ سابق امریکی صدر بل کلنٹن کے دور میں شروع ہوا تھا۔ اس مارچ میں کسی بل کو ہتھیار بنا کر حملہ کیا جاتا ہے۔ کبھی پریسلر بل کے ذریعے ہماری معیشت کی مشکیں کس دی جاتی ہیں اور کبھی ''کاری لوگر'' بل کو چارہ بنا کر ہمارا شکار کیا جاتا ہے۔ ایسے بلوں میں وضاحت طلب امور کی کے لئے ہمارے صاحبانِ اختیار بار بار اسلام آباد سے واشنگٹن تک ڈبل مارچ کرتے ہیں۔

اب مارچ پاسٹ کا ذکر بھی ہوجائے ۔ جب کوئی غیر ملکی سربراہِ مملکت کسی دوسرے ملک دورے پر آتا ہے تو اسے توپوں کی

گھن گرج کے بعد مارچ پاسٹ کر کے سلامی دی جاتی ہے۔اس کا مقصد غیر ملکی مہمان کی عزت افزائی سے زیادہ اسے ڈرانا، دھمکانا ہوتا ہے۔مہمان پر واضح کر دیا جاتا ہے کہ اگر گھی سیدھی انگلی سے نہ نکلے تو ہم انگلی ٹیڑھی کرنا بھی جانتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ مہمان بلا ضرورت ہنس ہنس کر پہلے سب سے مصافحہ کرتا ہے اور اس کے بعد بلا چون و چرا تمام معاہدوں پر اندھا دھند دستخط کر دیتا ہے۔ اسے علم ہے کہ ایسے معاہدوں پر صرف تصویر بنوانے کے لئے دستخط کئے جاتے ہیں، انہیں پورا کرنا قطعاً ضروری نہیں ہوتا۔

ہماری تاریخ میں ایک مارچ ایسا بھی ہوا جو بالآخر دھرنے میں تبدیل ہوگیا۔اس مارچ کی تیاری کئی مہینے پہلے سے کی گئی تھی اور اس مارچ میں دس لاکھ لوگوں کی شمولیت کا اندازہ لگایا گیا تھا۔ اب جو کام اندازے سے کئے جائیں اُن میں انیس بیس کا فرق تو آ جاتا ہے لیکن یہاں تو نو دو گیارہ کا فرق آ گیا تھا۔مارچ سے پہلے کئی ''مائی کنٹی'' قسم کے سیاستدانوں نے مارچ کرنے والوں کو یقین دلایا تھا کہ جب آپ میاں صاحب کی طرح گوجرانوالہ پہنچو گے تو مارچ کے مطلوبہ مقاصد حاصل ہو جائیں لیکن جب یہ مارچ گوجرانوالہ پہنچا تو اہلِ مارچ پر سنگ باری شروع کی گئی۔ مارچ نے تیز رفتاری سے گوجرانوالہ سے گزر گیا۔ سب سے بڑی ناکامی تو یہیں ہوگئی جہاں پر جا کر اُن کے حق میں فیصلہ آنا تھا وہاں سے عزت بچا کر گزرنا پڑا۔اس کے بعد جب یہ مارچ اسلام آباد پہنچا تو دس لاکھ کے بجائے صرف پچاس ہزار مارچیوں پر مشتمل تھا۔ چونکہ اس مارچ کی قیادت ایک کھلاڑی اور ایک اناڑی کر رہے تھے اس لئے مارچ کو بھی کرکٹ میچ سمجھ کر امپائر کی انگلی کھڑی ہونے کا انتظار کرتے رہے۔امپائر کی انگلی نہ کھڑی ہونی تھی اور نہ ہوئی البتہ دھرنے کے شرکاء کزن برادر میں تبدیل ہوگئے۔ان دونوں مارچوں کی منزل ایک تھی لیکن دونوں کے نام مختلف تھے۔ ایک نے اِسے آزادی مارچ کا نام دیا تو دوسرے نے انقلاب مارچ کا نام دے ڈالا۔ اِس دوران ایک باغی رہنما نے دھرنے کے غبارے میں سوئی مار کر ساری ہوا نکال دی۔ تین ماہ تک صبح شام تقریروں سے دونوں قائدین نے جب حکومت کی کرسی کی ٹانگ توڑنے کے بجائے پہلے سے ٹوٹی ہوئی ٹانگ کو بھی اس طرح مرمت کر دیا کہ حکومت ڈٹ کر کھڑی ہوگئی۔اب دور سے تشریف لائے ہوئے صاحب کو اندازہ ہوگیا کہ انگلی کھڑی نہیں ہوگی اور حکومت کو اپنی انگلی کے اشاروں پر نچانا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے تو انہوں نے اچانک دھرنا ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔ایک کزن کے جانے سے دوسرا کزن اکیلا ہی ۱۲۶ دن تک ڈی چوک میں موج میلہ کرتا رہا۔ بالآخر اس نے بھی دھرنا ختم کرنے اور گھریلو زندگی شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔اس فیصلے سے حکومت نے بھی سکھ کا سانس لیا۔اب ذرا مارچ کے لغوی معنی کی وضاحت ہو جائے کہ آخر خرگوش کی طرح چلنے کو ہی مارچ کیوں کہا جاتا ہے۔ کچھوے نے بھی تو کار ریس جیت لی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ حکومت نے اپوزیشن کو کچھوے کی چال چلنے کا مشورہ دیا ہے لیکن اپوزیشن اب ہرگز فرینڈلی نہیں۔اُس نے بھی خرگوش کی طرح چلنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔آج قوم کو ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء جیسے مارچ کی اشد ضرورت ہے جب ۹ کروڑ ہندوستانی مسلمانوں کے دل ایک ساتھ دھڑکتے تھے۔انہوں نے برسوں کی جدوجہد کے بعد ۲۳ مارچ کے دن چند منٹوں میں منٹو پارک کے اندر ایک قرارداد پاس کر لی تھی۔ آج ہمیں جوؤں کی پروا کئے بغیر سر جوڑ کر بیٹھنے کی ضرورت ہے کیونکہ جوؤں سے زیادہ خطرناک وہ جونکیں ہیں جو قوم کا خون چوس رہیں ہیں۔ نجانے ان جونکوں کے خلاف کب مارچ ہوگا؟ مارچ تو بہار کا موسم ہے لیکن اپنے وطنِ عزیز میں ہر طرف خزاں کا سماں ہے۔ ہمارے قومی وقار پر ایسا پت جھڑ کا موسم آیا ہے کہ ایٹمی طاقت ہونے کے باوجود کشکول ہمارا قومی نشان بن چکا ہے۔ کرپشن کے عفریت نے ہر درخت کی جڑوں سے ترقی کی نمی کھینچ لی ہے۔ایک بلند اقبال نے تو کہا تھا کہ ''ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی'' آج ساقی نے ہی ساری مٹی زہر خیز کر دی ہے۔کیا ہمارے بزرگوں نے ان قومی اداروں کی جڑوں کو اپنا خون اسی لئے پلایا تھا؟ اپنے قومی وقار کی واپسی کیلئے ایک بڑے میاں نہیں بلکہ ہر پیر و جوان کو جاگنے کی ضرورت ہے۔جب قوم بیدار ہوگی تو پھر جون کی گرمی میں بھی مارچ کیا جاسکتا ہے۔

سیّد بدر سعید

۲۰۵۰ء کیسا ہوگا پاکستان؟

ویسے تو ہمارے یہاں ایک عرصہ سے نجومیوں کا کام صحافیوں نے فی سبیل اللہ اپنے ذمہ لے رکھا ہے۔ جس طرح فٹ پاتھ پر بیٹھ کر توتا فال نکالی جاتی ہے اب اسی طرح ٹی وی چینلز پر بعض اینکر اپنی چڑیا کبوتر اڑاتے نظر آتے ہیں اور پھر انتہائی گھمبیر لہجہ میں بتاتے ہیں کہ اگلے 24 گھنٹے میں کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ اس کے بعد جو بھی ہو اسے اپنی کامیاب پیشن گوئی قرار دے دیتے ہیں۔ یہ پیشن گوئیاں اس حد تک بڑھ چکی ہیں کہ ۲۰۴۹ء تک کی بکنگ مکمل ہو چکی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری نظر ۲۰۵۰ء پر ہے۔

ہمارے دوست ب المعروف شاہ صاحب کا کہنا ہے کہ ۲۰۵۰ء تبدیلی کا سال ہوگا۔ جو لوگ ابھی ۲۰ برس کے ہیں وہ ۵۳ برس کے ہو چکے ہوں گے جبکہ ۵۳ برس والوں کی اکثریت اس دنیا میں نہیں ہوگی۔ یہ اتنی بڑی تبدیلی ہے جو واضح طور پر نظر آئے گی۔

۲۰۵۰ء میں پاکستان کے اکثر ادارے، میڈیا ہاؤسز اور ملٹی نیشنل کمپنیوں میں خواتین کی بھرمار ہو چکی ہو گی اور ملازمت کے اشتہارات کے ساتھ نوٹ لکھا ہوگا کہ اس ملازمت کے لئے لڑکوں کی حوصلہ افزائی کی جائے گی۔ نوجوان لڑکیاں ہر محفل میں یہی شکوہ کرتی نظر آئیں گی کہ ہم جتنی مرضی ڈگریاں لے لیں لیکن ان بڈھی کھوسٹ آنٹیوں نے لڑکوں کو ہی رکھنا ہے۔ لڑکوں کے لئے اوپن میرٹ کے ساتھ ساتھ کوٹہ بھی مختص ہوگا۔ اس کے باوجود انہیں ریسپشنسٹ اور پرسنل سیکرٹری کی ملازمت ہی ملا کرے گی اور وہ اسی پوسٹ سے ڈائریکٹ کمپنی کے مالک اور مالک کے دل اور گھر پر قبضے کا خواب دیکھا کریں گے ۔ والدین گھر سے نکلتے وقت لڑکوں پر پھونکیں مارا کریں گے تاکہ کوئی لڑکی انہیں اغوا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ انٹرویوز میں لڑکے مکمل اعتماد سے جائیں گے اور لیڈی باس ان سے ملازمت یا ڈگری کی بجائے نجی نوعیت کے سوال کیا کرے گی۔

۲۰۵۰ء میں حالات یہ ہوں گے کہ لڑکیاں لڑکوں کو ایزی لوڈ بھیجا کریں گی اور ایک ایک لڑکا کئی کئی لڑکیوں کو اپنے جال میں پھنسا کر جینز اور ٹی شرٹس بٹور رہا ہوگا۔ دس دس لڑکیوں کو بے وقوف بنانے والے لڑکے کو بھی یہی شکوہ ہوگا کہ اسے سچی محبت نہیں ملی۔ کو ایجوکیشن میں بی سی ایس اور کیمسٹری کی کلاسوں میں لڑکیاں

ہر دوسری بات کے جواب میں یہی کہیں گی کہ یار یہ اچھا کو ایجوکیشن ہے، سارے خوبصورت لڑکے تو بائیوٹیکنالوجی یا ماس کمیونی کیشن میں ہیں۔ پوری کلاس میں صرف ایک لڑکا ہے اور وہ بھی اتنی بڑی عمر کا، در فٹے منہ ایسی کو ایجوکیشن کا۔ دفاتر میں لڑکے کی موجودگی میں لڑکیاں خوامخواہ مہذب پن کا مظاہرہ کرنے لگیں گی۔ لڑکوں کو گھر سے صرف یونی ورسٹی جانے کے لئے کرایہ کے پیسے ملیں گے لیکن پھر بھی وہ میکڈونلڈ کے برگرز کھاتے ہوئے سیلفیاں اپ لوڈ کرتے نظر آئیں گے۔ زیادہ تر لڑکوں کی سیلفیوں میں باتھ رومز کی ٹائیلیں بھی نظر آیا کریں گی جبکہ لڑکیاں ’’واقعی بڑے شوارمے‘‘ کے سٹال کے باہر بھی سیلفیاں بنایا کریں گی۔

۲۰۵۰ء میں پاکستان کا سیاسی منظر نامہ بہت شاندار ہوگا۔ اس وقت تک پاکستان کی آبادی ۵۰ کروڑ جبکہ سیاسی جماعتوں کی تعداد ۶۰ کروڑ تک پہنچ چکی ہوگی۔ آدھے سے زیادہ سیاست دان اینکر بن چکے ہوں گے تو دوسری جانب آدھے سے زیادہ صحافی بھی وزیر لگ چکے ہوں گے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ تب بھی وزیر لگنے کے لئے ’’تھلے‘‘ لگنا ضروری ہوگا لیکن اس وقت میرٹ کا خاص خیال رکھا جائے گا جو جتنا زیادہ ’’تھلے‘‘ لگے گا اسے اتنا ہی اوپر بٹھایا جائے گا۔ سرکاری نوکریوں پر پابندی ختم کرنے کا فیصلہ ایک بار پھر کیا جائے گا۔ تمام محکموں کی سربراہی کالم نگاروں کو مل چکی ہوگی۔ اکثر ایماندار صحافیوں کے بچے سی ایس ایس کا امتحان پاس کر چکے ہوں گے۔ آج کل غریبوں کے حق میں آواز بلند کرنے والے زیادہ تر لوگ تب تک امیر ہو چکے ہوں گے اور تاریخ کے سبق پر عمل کرتے ہوئے نئے لوگ ان کی جگہ آواز بلند کرنے پہنچ چکے ہوں گے۔ صحافیوں کی ۶۰ تنظیمیں بن چکی ہوں گی جن میں سے ہر تنظیم ہی اصلی ہوگی۔ این ٹی ایس کا امتحان لینے والے ملک ریاض جیسوں کو غریب سمجھا کریں گے۔ لوگ تب بھی دھڑا دھڑ این ٹی ایس اور دیگر امتحانات کے لئے چندہ جمع کروائیں گے لیکن نوکریاں انہیں تب بھی نہیں ملیں گی۔

۲۰۵۰ء کا پاکستان بہت امیر ہوگا لیکن اربوں ڈالر کی یہ ملکی دولت تب بھی سیاست دانوں کے پیٹوں سے باہر نہیں نکل سکے گی۔ سیاسی بیانات تب بھی عروج پر ہوں گے اور ہر سازش کے پیچھے بیرونی ہاتھ ہی ملوث پائے جائیں گے۔ طاہر القادری کے عالمی شہرت یافتہ دھرنے کی ہر سال دھوم دھام سے سالگرہ اور برسی منائی جائے گی۔ الیکشن سے قبل تمام سیاسی لیڈر ایک دوسرے کے جانی دشمن سمجھے جائیں گے اور سیاست کے بعد جمہوریت کی خاطر مل کر ’’ترقی‘‘ کے لئے کام کرنے لگیں گے۔ ۲۰۵۰ء کی سب سے خوفناک بات یہ ہوگی کہ ڈالر گرل ایان علی بوڑھی ہو چکی ہوگی، نرگس کو نئی نسل جانتی تک نہ ہوگی، ریما اپنی پوتی کی پیدائش پر اپنی اٹھارہویں سالگرہ کا کیک کاٹ رہی ہوگی اور وینا ملک مولانا طارق جمیل کے سمجھانے پر ایک بار پھر اپنے ہی شوہر سے صلح کر لے گی۔ اس سال کی سب سے اچھی بات یہ ہوگی کہ پی سی بی کا چیئرمین ایک کرکٹر کو ہی لگا دیا جائے گا لیکن یقین جانئے وہ کرکٹر عمران خان نہیں ہوگا۔ یہ الگ بات ہے کہ چیئرمین بننے والا شخص اس عہدے پر آنے کے بعد کرکٹر بنے گا۔ ۲۰۵۰ء کے حوالے سے سب سے اہم پیشنگوئی امریکا، بھارت اور اسرائیل کے لئے ہے اور وہ یہ کہ تب ہم ہوں یا نہ ہوں لیکن پاکستان ایک حقیقت کے طور پر ضرور ہوگا۔

گیتوں کی افادیت کے ہم اسی دن قائل ہو گئے تھے جب تھل کے ایک زمیندار نے کہا تھا کہ عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی کے گیت سن کر اس کی بھینسیں زیادہ دودھ دینے لگی ہیں۔ سو ہمیں ڈاکٹر قمر آراء کے گیتوں کی کتاب سے یہ توقع تھی کہ اس میں یہ خوبی تو ضرور ہوگی لیکن پریشان خٹک صاحب نے اپنی رائے سے پریشان کر دیا کہ قمر آراء کے گیت انسانی جذبات کے عکاس ہیں۔
ممتاز مفتی نے محترمہ کو گیتوں کی ملکہ قرار دیا ہے۔ ان اہل دانش نے محترمہ کے سر پر گیتوں کی موجد ہونے کا سہرا شاید تا حال اس لئے نہیں باندھا کہ ہمارے ہاں عورتیں سہرا باندھتی نہیں ہیں۔

رائے علی اسجد

رُوداد ایک سفر کی

زندگی حرکت کا نام ہے اور یہ حرکت ہمیں ہر روز کہیں کا نہیں چھوڑتی ہم ٹھہرے سدا کے آلسی اور زندگی تیز تر۔۔۔

ہم ویسے بھی آج کل سانجھے فٹ بال بنے ہوئے ہیں کبھی بھائیوں کے گول پر کبھی درمیان میں لٹک گئے کبھی ابا کے چھتروں کی کشش ثقل ہمیں اوپر نیچے کرتی رہتی ہے، رہی بات اماں کی تو اس کا پوچھنا ہی کیا، ایسی ایسی صلواتیں سننے کو ملتی ہیں کہ بندہ کانوں میں رُوئی ٹھوس لے یا ہینڈفری، مجال ہے آواز رکتی ہو۔

ایسے گھن چکر میں مجھ جیسا آلسی آدمی جس نے شائد ہی کبھی شعوراُمنہ دھونے کی باغیانہ کوشش کی ہو، بلاناغہ پھر بھی ایسے گھن چکر کے ساتھ چکر کاٹتا ہوں۔ بعض اوقات تو اس سارے بکھیڑے میں بہت سے نادر مضمون بھی دریافت ہو جاتے ہیں اور بندہ سر دھننے لگتا ہے۔

گرمیوں کی چھٹیاں عروج پر تھیں۔ ہمیں سوائے سونے اور سونے کے اور کوئی کام نہ تھا اچانک ہمارے اور ہمارے اِس سونے کے بیچ ایک شادی کا دعوت نامہ موصول ہوا۔ ہم نے مرغے کی طرح الٹی سیدھی اذانیں دیں، گردن مروڑی، چھلانگیں لگائیں کہ شادی پر ہم نے نہیں جانا لیکن سب کی باہمی ملی بھگت سے بالآخر قرعۂ فال ہمارے نام کا ہی نکلا۔

خیر، اِس دوران جو کچھ ہوا اُس کا تذکرہ رہنے ہی دیں۔ شادی والے دن ہم بڑی آن بان اور شان سے خوب سج سنور کے نکلے کہ شائد شادی پر ہماری شادی کا بھی چانس بن جائے (یہ الگ بات ہے کہ ابھی تک اس چانس کے منتظر ہیں)

اپنی بستی سے دوسرے سٹاپ پہنچے، جہاں سے اس گاؤں جانا تھا۔ گھڑی نے بارہ بجادیئے کم بخت اتنی تیز چلتی ہے مجال جو اس کی سانس ذرا سی بھی پھولتی ہو۔

جون ایلیا ایسی شخصیت ہیں کہ کوئی بچہ بھی اُنہیں دیکھ کر بتا سکتا ہے کہ وہ شاعر ہیں۔ ٹوک جوک از ڈاکٹر محمد یونس بٹ

سٹاپ پر کافی رش واقع ہوا تھا۔ پتہ چلا کہ مطلوبہ بس ایک بجے آئے گی۔ کھڑے کھڑے دس سگریٹ اور بیس برف کے گولوں سے اپنی تواضع کی اور چہل قدمی جاری رکھی۔

خدا خدا کر کے ایک بجا مگر بس کی دُم بھی نظر نہ آئی۔ سوچا کہ بغیر دُم کے بس ہو گی، چلو منہ ہی نظر آ جائے۔۔۔ خدا کا شکر کہ ایک آڑھی ترچھی بس کم ٹرالی زیادہ نمودار ہوئی۔ ہم نے کمر کس لی بلکہ سب کچھ کس لیا۔ مسافر جو گرمی اور لُو کے ستائے کھڑے تھے ،بس پر ٹوٹ پڑے، دھینگا مشتی جو شروع ہوئی تو نظم و ضبط یتیم ہو گیا۔

ہم بھی جوں توں کر کے بس میں سوار ہو ہی گئے۔ جس بس کو ہم اپنی کم علمی اور کم عقلی کی وجہ سے ٹرالی قرار دے چکے تھے، اندر سے میر و غالب کا دیوان بنی ہوئی تھی اور یوں لگتا تھا بہادر شاہ ظفر ابھی ابھی شیشوں سے دربار برخاست کر کے ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھے ہیں۔ ہر شیشے اور الماری پر اشعار کندہ تھے۔ گھر کے ہر فرد کا نام بڑی باقاعدگی سے لکھا ہوا تھا جیسے دولت مشترکہ میں نام نہ لکھنے سے دولت سے حصہ نہیں ملے گا۔

ہم اشعار سے بدمزہ ہو کر مسافر کھوجنے کا کام کرنے لگے۔ مجال ہے جو کوئی ہمیں ایک آنکھ بھایا ہو۔۔۔ البتہ صنف نازک کی بات اور ہے۔

گرمی شدید حبس اور پسینوں کے درمیان بھی لتا منگیشکر چلا چلا کر ''آج موسم ہے عاشقانہ ایسے میں کہیں سے اے دل انہیں ڈھونڈ لانا'' گا رہی تھی۔

اِتنے میں کنڈیکٹر کرایہ لینے آ گیا۔ وہ کنڈیکٹر کم اور پرانی فلموں کا ولن زیادہ لگتا تھا۔ اس نے بڑے سٹائل سے ہماری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا، گویا کہ کرایہ مانگ رہا ہے۔ ہم اس کی اس گستاخی پر جل ہی تو گئے، دل چاہا ایک دو ٹکا دیں، پر ہاتھ چھوڑنے کا خطرہ مول نہیں لیا جا سکتا تھا چنانچہ کسی ورسٹائل ہیرو کی طرح اپنے سر کو جنبش دی اور لاپرواہی ''سٹوڈنٹ'' کہہ کر اپنے فرضِ منصبی سے سبکدوش ہو گئے۔

ہم تو بس کی رفتار سے حیران تھے جو گدھے گاڑی کی رفتار سے بھی کچھ کم ہی تھی۔ جب کنڈیکٹر واپس آیا تو ہم نے ہمت کر کے پوچھ لیا ''صاحب بس کے گیئر تو سلامت ہیں، بڑی بھاگتی ہے خیر سے؟''

کنڈیکٹر کے جواب نے تو میرے پاؤں تلے بس ہی نکال دی کہنے لگا ''بھائی ایہدیاں بریکاں نئی نے اسیں بس کلچ تو ای کم لیندے آں!''

لتا منگیشکر مسلسل چلا چلا کر اپنے محبوب کو ڈھونڈ رہی تھی۔ پتہ نہیں اب لتا منگیشکر اپنے محبوب کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہوئی کہ نہیں مگر ٹریفک پولیس نے اس بس کو ضرور ڈھونڈ نکالا۔

لو جی کاروائی شروع ہوئی، ''ڈرائیونگ لیسنس دکھاؤ، بس کے کاغذات دکھاؤ۔''

ان بیچاروں کے پاس یہ سب ہوتا تو بھلا انہوں نے ادھر دھکے کھانے تھے، کسی جی ٹی روڑ پر بلو کی ٹور دیکھ کر بریکیں لگاتے۔ یہ معاملہ تو خاصا طول پکڑ گیا اور سلجھنے کا نام ہی نہ لیتا تھا، بالآخر ہم نے ہمت کر کے صاحب بہادر سے پوچھ ہی لیا'' سر آپ نے کیسے پہچان لیا کہ ان کے پاس کاغذات نہیں ہیں'' صاحب بہادر کا جواب سن کر میں تو فوت ہی ہو گیا جب وہ کہنے لگا ''بس ہمیں پتہ چل جاتا ہے جناب کہ یہ دو نمبری ہیں''

یہ حسین و جمیل جواب سن کر ہم برف کے گولے کی طرح ٹھنڈے ٹھار ہو کے واپس بس میں گھس گئے۔

اِتنے میں ڈرائیور نے صاحب بہادر کو علیٰحدہ لے جا کر پتہ نہیں اس کے کان اور ہاتھ میں کیا منتر پڑھا کہ معاملہ اک دم سلجھ گیا۔ جس معاملے کو ہم عالمی سطح پر اٹھانے کا منصوبہ بنا رہے تھے وہ ایک دم حل ہو گیا۔ ہمیں تھوڑا تجسس ہوا کہ پوچھیں تو سہی یہ مسئلۂ فیثا غورث آخر حل ہوا تو کیسے ہوا۔ ابھی ہم پر تول میرا مطلب کھول رہے تھے کہ اچانک صاحب بہادر کی آواز نے مجھے اپنی طرف کھینچا ''اوئے چل جاون دے ساڈی چاہ سکٹ بن گئی اے''

باقی جو سفر رہ گیا تھا وہ ہم نے پسلیاں تڑواتے طے کیا۔

حنیف عابد

اللہ جھوٹ نہ بلوائے تو ہمارے زمانے میں کھانے کے انداز ہی کچھ مختلف تھے۔ آج کل کا تو باوا آدم ہی نرالا ہے۔ سر جھاڑ منہ پھاڑ جسے دیکھو جگہ جگہ ایسا جگالی کرتا دکھائی دیتا ہے جیسے اڑیل بھینسا کام نہ کرنے (یعنی ہل نہ جوتنے) کا تہیہ کر کے کبھی کبھی کھیتوں میں اڑ جاتا ہے۔ لاکھ اُسے پچکارو وہ ٹس سے مس نہیں ہوتا، اگر دو چار بید رسید کر دو تو اپنے کھر زور زور سے زمین پر مارتے ہوئے نتھنوں سے ایسی آوازیں نکالتا ہے کہ ہار ماننے ہی بنتی تھی۔ یہی کچھ آج کل شہروں میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ میں تو کہتی ہوں بہن اسی زمانے کے لئے بڑے بوڑھے کہہ گئے ہیں کہ ایک دور آنے والا ہے جسے ”کلجگ“ کہا جائے گا۔ خالہ چنی بیگم بلا کسی بریک کے مسلسل تقریر کیے جا رہی تھیں۔ ہماری امی حضور خاموشی سے ایک جانب اُن کی تقریر پر کان دھرے ہوئے تھیں تو دوسری جانب اپنے ہاتھوں کو پان بنانے میں مشغول کر رکھا تھا۔ ادھر خالہ چنی بیگم کی زبان کو بریک لگی اور اُدھر ہماری امی نے پان کی گلوری اُن کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا ”ارے چنی بیگم تم پان کی گلوری کھاؤ کیوں اپنا خون کھولا رہی ہو۔“

خالہ نے لپک کر پان کی گلوری لی اور اپنے منہ میں رکھ لی۔ اللہ اللہ کر کے خالہ چنی بیگم کی بے وقت کی راگنی کی مانند جاری تقریر رکتے ہی میری چھوٹی بہن کی جان میں جان آئی اور موقع غنیمت جانتے ہوئے وہ صحن سے سرک لی۔ جاتے ہوئے اُس نے اشارے سے مجھے اپنے پیچھے آنے کا کہا۔

مہک جیسے ہی کمرے میں داخل ہوئی فلذہ نے چیختے ہوئے کہا ”باجی! یہ خالہ چنی بیگم کون ہوتی ہیں مجھے کھانے پینے پر ٹوکنے والی؟“

مہک کو اندازہ تھا کہ کمرے میں داخل ہوتے ہی اُسے کس قسم کے ردِعمل کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے اسی لئے اُس نے کمرے میں داخل ہوتے ہی دروازہ فوری طور پر بند کر دیا تھا۔ اللہ کا شکر کہ کمرے کی آواز صحن میں بیٹھی ہوئی چنی خالہ کے کان میں نہیں پڑی ورنہ ایک اور قیامت برپا ہو جاتی۔ مہک نے پیار سے فلذہ کو سمجھاتے ہوئے کہا ”ارے یار تم تو ذرا سی بات پر کھولتے پانی کی طرح پتیلی سے باہر بھاگنے لگتی ہو، چنی خالہ بزرگ ہیں اگر انہوں نے کچھ کہہ بھی دیا ہے تو اُسے نظر انداز کر دو، اگر تمہارا دل ماننے تو

اُن کی نصیحت پر عمل بھی کر سکتی ہو۔"

فلذہ نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے مہک کی جانب دیکھا۔ مہک نے اپنی نظریں دوسری جانب گھمالیں تو فلذہ کو محسوس ہوا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ اُس نے مہک کا کاندھا پکڑ کر اپنی جانب کرتے ہوئے پوچھا" آپ کہنا کیا چاہ رہی ہیں؟"

مہک نے معصومیت سے کہا" کچھ خاص نہیں! بس میں یہ کہہ رہی تھی کہ چنی خالہ کی بات پر غور ضرور کرنا۔"

فلذہ یہ سنتے ہی ایک مرتبہ پھر بھڑک گئی" غور کرتی ہے میری جوتی! میں کسی کے باپ کا نہیں کھاتی، نہ ہی کسی کے کہنے سے میں اپنی خواہشیں ختم کر سکتی ہوں، آپ کو چنی خالہ اتنی پسند ہیں تو آپ اُن کے مشوروں پر عمل کیا کریں۔" فلذہ یہ کہہ کر پیر پٹختی ہوئی کمرے سے چلی گئی۔

رات کو سب گھر والے ٹی وی کے کمرے میں بیٹھے ہوئے خبریں دیکھ رہے تھے کہ اچانک ایک خبر آئی جس میں نیویارک میں ایک شخص نے محض پانچ منٹ میں ۱۲ برگر کھا کر کم سے کم وقت میں سب سے زیادہ برگر کھانے کا مقابلہ جیتا تھا۔ جیسے ہی وہ خبر چلی مہک نے فلذہ کی جانب دیکھا، فلذہ تو ٹی وی دیکھنے میں منہمک تھی۔ برگر دیکھتے ہی اُس کی رال ٹپکنے لگی تھی۔ اُسے احساس بھی نہیں ہوا کہ مہک اسے دیکھ کر مسکرا رہی ہے۔ مہک نے اچانک پوچھا" فلذہ تم پانچ منٹ میں کتنے برگر کھا سکتی ہو؟"

فلذہ نے کچھ دیر سوچا پھر کہا" میں ۳ برگر تو کھا سکتی ہوں۔"

مہک نے کہا" اگر تم سے نہیں کھائے گئے تو؟"

فلذہ نے بولا" آپ منگوائیں میں ابھی کھا کے دکھاتی ہوں۔"

تھوڑی سی بحث کے بعد یہ طے ہوا کہ ابھی تین برگر منگوائے جائیں، اگر فلذہ نے وہ برگر پانچ منٹ میں ختم نہیں کیے تو اُن کا بل وہ دے گی اگر فلذہ نے برگر پانچ منٹ میں کھا لیے تو بل مہک دے گی۔ اُسی وقت برگر کا آن لائن آرڈر دے دیا گیا۔

گھر کے تمام افراد برگر آنے کا انتظار کرنے لگے۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ فلذہ کے بابا نے کہا کہ بھئی یہ جو شرط ہے آپ لوگوں

امّی اور ابو میں فرق

امّی جی کے قدموں تلے جنت ہوتی ہے جبکہ ابا جی کے قدموں تلے دس نمبر کا لتر ہوتا ہے۔ جو جنت کا راستہ دکھاتا ہے اس پر چلاتا ہے۔ اور اکثر جنت کے اندر تک چھوڑ کے آتا ہے۔

ارسلان بلوچ ارسل

کی، یہ مجھے کچھ مناسب نہیں لگتی ہے۔

بابا کی بات سُن کر سب چونکے۔ خاص طور پر فلذہ نے فوراً بابا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا" آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں بابا یہ لوگ مجھے اسی طرح چونا لگا دیتے ہیں۔"

فلذہ کی بات سنتے ہی مہک کے کان کھڑے ہوئے" کیا کہا! تم نے ہم لوگ تمھیں کونسا چونا لگا دیتے ہیں؟"

بابا دونوں کی نوک جھونک سنتے ہوئے مسکراتے رہے۔ فلذہ لپک کر بابا کے پاس پہنچی اور کہنے لگی" آپ بتائیں شرط کیا ہونی چاہیے؟"

بابا نے کہا" دیکھو اگر آپ برگر نہیں کھا سکیں تو پیسے آپ دیں گی یہ تو جرمانہ ہو گیا، یعنی شرط ہارنے کا جرمانہ، ٹھیک! اگر آپ نے برگر کھا لئے تو یہ پیسے مہک دیں گی، جو انہیں دینے ہی چاہئیں، آپ اگر کھا لیں گی تو آپ کو انعام کہاں ملا؟"

یہ سنتے ہی فلذہ کی آنکھیں چمک گئیں۔ وہ چیختے ہوئے بولی " دیکھا! مہک باجی آپ نے میرے ساتھ چیٹنگ کی ہے ناں؟ بابا ٹھیک بول رہے ہیں، میرا انعام کیا ہوگا؟"

مہک نے جب حالات کو یوں بدلتے ہوئے دیکھا تو فوراً بولی" میں تو صرف برگر کے پیسے دوں گی، آپ کا شرط جیتنے کا انعام تو بابا دیں گے آپ کو۔"

فلذہ نے فوراً بابا کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا جیسے پوچھ رہی ہو کہ کیا وہ بات منظور کر لے یا انکار کرے۔ بابا نے فلذہ کو سر کے اشارے سے اقرار کرنے کا کہا جس پر فلذہ راضی ہو گئی۔

ابھی گھر میں یہ سلسلہ جاری ہی تھا کہ اچانک ڈور بیل بجی، مہک نے جا کر دیکھا تو برگر آ گئے تھے۔ مہک نے برگر کی ڈلیوری

ریسیو کی اور جلدی سے کچن میں گئی اور برگر ٹرے میں رکھ کر لے آئی۔ برگر دیکھتے ہی فلذہ کے منہ میں پانی بھر گیا لیکن ساتھ ہی اُسے اب ڈر بھی لگنے لگا تھا کہ اگر وہ نہیں کھا پائی تو اُسے پیسے دینے پڑیں گے۔ یہ سوچتے ہی فلذہ کے پیٹ میں کچھ دیر کے لیے مروڑ سی اُٹھی لیکن برگرز کی خوشبو نے تمام شکوک وشبہات دور کر دیئے۔ فلذہ کو برگر کھانے کی جلدی تھی اور مہک کسی طرح معاملات طے کرنا چاہتی تھی۔ مہک نے ٹائم واچ نکال کر ٹیبل پر رکھ دی اور کہا ''برگر کے ساتھ ہی ٹائم واچ اسٹارٹ کر دی جائے گی۔''

فلذہ نے آؤ دیکھا نا تاؤ، جلدی سے مہک کے ہاتھ سے برگر لپکا اور منہ میں بڑا سا نوالا لیتے ہوئے ہاتھ سے اشارہ کیا کہ واچ اسٹارٹ کردو۔

جتنی دیر میں مہک واچ اسٹارٹ کرتی فلذہ نے ایک بڑا سا نوالہ برگر کا منہ میں رکھ لیا تھا۔ ڈیڑھ منٹ میں ہی پہلا برگر چٹ کرنے کے بعد فلذہ نے دوسرا برگر کھانا شروع کر دیا۔ تین منٹ میں جب دو برگر ختم ہو گئے تو مہک کو فکر لاحق ہوئی کہ اُس کے پیسے تو گئے۔ مہک نے فوراً کہا ''برگر کے ساتھ فرنچ فرائز اور کولڈ ڈرنک بھی ختم کرنی ہوگی۔''

فلذہ نے برجستہ جواب دیا ''کدو'' ایسی کوئی کہانی نہیں ہے۔''

اس سے پہلے کہ مہک کچھ اور بولتی فلذہ کی حمایت میں اُس کے بابا آگئے اور انہوں نے کہا ''ایسا نہیں ہوگا بھئی یہ تو ''چیٹنگ'' ہے۔''

باتوں میں لگنے کی وجہ سے فلذہ کی توجہ برگر کھانے سے ہٹ گئی تھی جس کی وجہ سے برگر کا ایک بڑا ٹکڑا ابھی اُس کے ہاتھ میں ہی تھا۔ اچانک فلذہ کے بابا کی نظر اسٹاپ واچ پر پڑی تو انہوں نے دیکھا کہ صرف ۱۸ اسیکنڈ رہ گئے ہیں انہوں نے فلذہ کو اشارہ کیا۔ فلذہ اُن کی بات سمجھ گئی اُس نے پورا ٹکڑا منہ میں رکھ لیا ایسے ہی اُس نے برگر کا آخری حصہ منہ میں رکھا بابا نے نعرہ لگایا فلذہ جیت گئی۔ ٹائم ختم ہونے کے باوجود فلذہ منہ چلا رہی تھی، مہک نے جیت ماننے سے انکار کرنا چاہا لیکن گھر کے دیگر لوگوں نے فلذہ کا ساتھ دیا اور وہ جیت گئی۔

فلذہ کی جیت سے مہک کو نقصان ضرور ہوا تھا لیکن دل سے وہ خوش تھی کہ فلذہ کو اُس کی پسند کے برگر پیٹ بھر کر کھانے کو ملے تھے۔ مہک نے بابا کی طرف دیکھتے ہوئے فلذہ سے کہا ''اب تم اپنا انعام تو لے لو بابا سے۔''

بابا نے کہا ''ہاں بھئی انعام تو بنتا ہے۔ اچھا یہ بتاؤ انعام میں کیا چاہیئے۔''

فلذہ بولی جو آپ دیں گے میں لے لوں گی۔ کچھ دیر کی بحث کے بعد یہ طے ہوا کہ انعام کے طور پر تمام لوگ ہفتے کی شب فلذہ کے پسندیدہ ہوٹل جائیں گے اور رات کا ڈنر وہیں کریں گے۔

فلذہ کی مما نے جب یہ دیکھا تو کہنے لگیں ''چنی بیگم ٹھیک ہی کہہ رہی تھیں کہ وہ زمانے لد گئے جب بسیار خوری ایک لعنت سمجھی جاتی تھی آج کل تو موئی یہ وبا عام ہو چکی ہے۔''

مہک نے لقمہ دیا ''ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ امی! کچھ لوگوں کے لئے تو ''بسیار خوری ہزار نعمت ہے۔''

یہ سنتے ہی کمرے میں قہقہے گونجنے لگے۔

تعریف

مرد حضرات کا آپس میں ایک دوسرے کی تعریف کرنے کا انداز تھوڑا مختلف اور مفصل ہوتا ہے ''یار آج تم سمارٹ لگ رہے ہو کپڑے بہت زبردست لگ رہے ہیں بالوں کا سٹائل بڑا اعلیٰ ہے وغیرہ وغیرہ۔''

لیکن خواتین کا آپس میں تعریف کرنے کا انداز کچھ نرالا اور بالکل مختصر ہے۔ ''یار آج تو تم چھوٹی چھوٹی لگ رہی ہو۔''

ارسلان بلوچ ارسل

احمد سعید

ہائر ایجوکیشن

"ایف اے آنرز" کے سالانہ پیپر ختم ہوئے تو میں ہائیر ایجوکیشن کیلئے فرانس جانے کا سوچنے لگا۔ حالانکہ رزلٹ تک صرف مجھے یہ سوچنا چاہیے تھا کہ میں پاس بھی ہوجاؤں گا کہ نہیں۔ اور اگر ہوجاؤں گا تو کیسے؟

"ایف اے آنرز شروع میں اِس لئے لکھا کہ BA بھی جب تین سال کا ہو تو "آنرز" ہوجاتا ہے۔ ویسے تو ایف اے تین سال کا پاکستان میں نہیں تھا لیکن میں نے سپلیاں لے کر اسے تین سال میں کنورٹ (منتقل) کرلیا تھا۔

سب سے پہلے اباجی کو اپنے عزائم سے آگاہ کیا کہ میں ہائر ایجوکیشن کیلئے بھائی کے پاس "فرانس" جانا چاہتا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ بہت خوب تم ایم اے کرلو اور پھر ہائیر ایجوکیشن کیلئے چلے جانا۔ میں نے کہا جی کہ میں ابھی جانا چاہتا ہوں۔ اُنہوں نے کہا کہ انٹرمیڈیٹ کے بعد کونسی ہائر ایجوکیشن؟ میں نے کہا کہ اپنی اپنی سوچ کی بات ہے۔ انہوں نے مجھے ایسے دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں کہ پہلے میں تمہاری سوچیں نہ درست کردوں۔ خیر میں نے کہا، آپ ہائیر کو نکال دیں لیکن ایجوکیشن کے لئے تو جانے دیں۔ کہنے لگے، رزلٹ آنے دو پھر دیکھتے ہیں۔ دِل نے کہا کہ پھر کیا دیکھنا فرانس، آپ نے پاکستان نہیں دیکھنے دینا۔

ایک صبح میں اٹھا تو گھر میں امریکہ کی باتیں کانوں میں پڑیں۔ میں نے امی جان سے جا کر پوچھا کہ امریکہ کہاں سے آگیا بیچ میں؟ میں تو سارا دِن فرانس فرانس کرتا ہوں۔ وہ کہنے لگیں کہ تمہارے چچا اور اُن کی فیملی امریکہ سے آرہے ہیں۔ اور ان کو تمنے لے کر گھومنا پھرنا ہے۔ میں نے کہا کہ جون، جولائی کے مہینوں میں پیدل اُن کو لے کر گھومنا پھرنا ہے؟ کہنے لگیں کہ اباقی باتیں اپنے ابو سے پوچھ لو۔ اباجی کہنے لگے کہ گاڑی کرائے پہ لینی ہے اور تم نے چلانی ہے۔

یہ سن کر کہ میں نے چلانی ہے مجھے لگا کہ میں فرانس ہی پہنچ گیا ہوں۔ بلکہ امریکہ سے گھومتا ہوا فرانس پہنچا۔ گاڑی چلانی تقریباً مجھے اب آگئی تھی۔ بس پیچھے کرنی اور گھر کے گیراج میں کھڑی کرنی نہیں آتی

تھی۔ سیدھی سیدھی میں بہت اچھی چلالیتا تھا، بس ذرا ٹریفک زیادہ نہ ہوتو۔۔۔ بلکہ بالکل ہی نہ ہوتو پھر تو میں کیا ڈرائیونگ کرتا تھا۔ بس میں خود کو دیکھتا جاتا تھا کہ کیا ٹھاٹھ سیٹ بیٹھا ہے گاڑی پر، زیادہ ٹریفک میں بھی میں دیکھتا رہ جاتا تھا کہ یہ ہو کیا رہا ہے۔

گاڑی ''رینٹ'' پہ لینے کی ذمہ داری ایک کزن کو سونپی گئی۔ میں گاڑی لے کر آیا رستے میں دو تین بار بند ہوئی ایک بار خود ہی چل پڑی تو دوسری بار مکینک کے ہاتھوں چلی، یعنی مکینک کو بلانا پڑا۔ کزن کو میں نے فون پر بتایا تو وہ کہنے لگے یار بیٹری ہی صرف خراب ہے نا۔ اگر کبھی کبھار تنگ کی تو دھکا لگا لینا ورنہ جا بجا میکینک تو ہیں ہی۔ ایسے ہی میں نے ابا جی کو بتادیا کہ ایسا کوئی مسئلہ نہیں گاڑی میں، ابا جی کہنے لگے کہ اِس مسئلہ (گاڑی) کو گھر نہ لے کر آنا، فوری واپس کر کے آؤ۔ میں نے کہا کہ رات کو چچا جان آرہے ہیں صبح اِسے واپس کر کے کوئی اور لے لیں گے۔

انھوں نے ایک نہ سنی بلکہ مجھے اچھی خاصی سنادیں۔ میں نے گاڑی واپس کی اور گاڑی خود ڈھونڈنے کا ارادہ کرلیا کیونکہ مجھے نظر آرہا تھا کہ ڈرائیونگ میرے ہاتھ سے جارہی ہے۔

ایک رینٹ اے کار والا کچھ جاننے والا محسوس ہوتا تھا۔ اُس نے چھوٹی سی گاڑی دے دی کہ گیس کم کھائے گی۔ میرے لیے چھوٹی کار زیادہ کارآمد تھی۔ ڈرائیونگ کا ایکسپرٹ جو بہت تھا اپنی نظروں میں۔ انکل اپنی فیملی کیساتھ رات کو آئے۔ رات تک میں نے بھی اُس گاڑی پہ اچھے خاصے ہاتھ صاف (سیدھے) کرلیے تھے۔ انکل گاڑی کو دیکھ کر کہنے لگے کہ اِس سے چھوٹی گاڑی نہیں ملی؟ میں نے کہا انکل اِس سے چھوٹی گاڑی پاکستان میں ابھی آئی نہیں۔

حیرانگی سے مجھے دیکھا اور کہنے لگے کہ یعنی اگر ہوتی تو تم نے لے آنی تھی۔ اِس کی جگہ وہ۔ میں نے کہا کہ انکل یہ گاڑی ''کم خرچ بالانشیں ہے''

ہنس کر کہنے لگے کہ چلو صبح دیکھتے ہیں کیا کرتی ہے یہ گاڑی ہمارے ساتھ۔ یقیناً اُن کا مطلب یہی تھا کہ تم ہمارے ساتھ کیا کرتے ہو۔ جون کا مہینہ تھا۔ اُس سال گرمی نے دس سالہ گرمیوں کا ریکارڈ توڑ دیا تھا۔ صبح ہوتے ہی آنٹی نے مجھ سے پوچھا کہ اِس کا اے سی (ائیر کنڈیشنر) بھی صحیح کام کرتا ہے کہ نہیں؟

میں نے کہا اِس کا ہیٹر بھی چلتا ہے۔

کہنے لگیں کہ ہیٹر کہاں سے آ گیا بیچ میں۔

میں نے کہا کہ ایسے ہی گاڑی کے کارہائے نمایاں بیان کر رہا ہوں۔

کہنے لگیں گاڑی کیا کوئی ریسنگ چیمپئن شپ جیت کے آئی ہے۔

میں نے دِل میں سوچا کہ میں نے کل سارا دِن چلائی ہے اور یہ پوری صحیح سلامت بچ کے آئی ہے، اور کیا چیمپئن شپ جیتے گی؟

خیر انکل آنٹی کو رشتہ داروں کی طرف لے کر نکل پڑا۔ فوری طور پر اے سی چلایا اور بتایا کہ اِس کا اے سی بہت اچھا ہے۔ رات بڑی ٹھنڈی ہوا دے رہا تھا۔

انکل کہنے لگے کہ رات کو چھت پہ پنکھا بھی ٹھنڈی ہوا ہی دیتا ہے۔

میں نے سوچا انکل امریکہ سے محکمہ موسمیات کا کورس کر کے آئیں ہیں۔ آنٹی کہنے لگیں ابھی تک ٹھنڈ نہیں ہوئی گاڑی میں، میں نے کہا کہ بڑی روڈ پر چڑھیں گے تو ٹھنڈ کریگی۔ کہنے لگیں کہ چھوٹی روڈ پہ کیا کِیا کرے گی؟ میں نے کہا جی تھوڑی تھوڑی ٹھنڈ، خیر بڑی روڈ بھی آ گئی پر ٹھنڈ نہیں آئی۔ کہنے لگیں کہ اِس گاڑی کو فوری واپس کرو۔ مجھے تقریباً یقین ہوگیا کہ گاڑی تو گئی سو گئی پر ڈرائیور بھی گیا اب کے۔

آہستہ سے ڈرتے ڈرتے میں نے پوچھا کہ گاڑی میں بڑی والی لے آتا ہوں۔ کہنے لگی کہ ہاں بالکل درست جلدی سے کوئی اچھی گاڑی کا بندوبست کرو۔

میری جان میں جان آئی کے ڈرائیونگ ابھی بھی داؤ پہ ہے پر بچ گئی ہے۔

اب کہ میں نئی اور بڑی گاڑی لانے میں کامیاب ہوگیا تھا پر ابھی صحیح چلانے میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔ میں دو تین دن گاڑی سلو سپیڈ پہ ہی چلاتا رہا، بھئی اپنی عزت اور گاڑی اپنے ہاتھ ہی اچھی لگتی

ہے۔

ایک دِن آنٹی ابو کو کہنے لگیں کہ بھائی جی احمد گاڑی بہت اچھی چلاتا ہے۔

اب میں خوشی کی بجائے پریشان ہوگیا کہ اباجی یہ نہ فرمادیں کہ ابھی تو یہ چلانا سیکھ رہا ہے اور آپ نے بہت اچھی چلانے کا سٹرفکیٹ بھی دے دیا۔ تھوڑا سا مسکرانے کے بعد اباجی خاموش ہی رہے، خیر پندرہ دن اِسی طرح آہستہ آہستہ چلا کر اپنی عزت اور اپنی ڈرائیونگ بچاتا رہا اور وہ واپس امریکہ چلے گئے کہ یہ کہتے ہوئے کہ ایسی ڈرائیونگ میں نے کہیں نہیں دیکھی۔ اور مجھے لگا کہ مجھے پندرہ دِنوں میں امریکہ کا ڈرائیونگ لائسنس مِل گیا ہے۔

فرانس میں ہائیر ایجوکیشن کیلیے میں اِسلام آباد نکل گیا۔ وہاں الیاں دے فانس جا کر اپنا مدعا بیان کیا۔ کہ میں نے تین ماہ کا فرنچ کورس ایگر کلچرز یونیورسٹی سے مکمل طور پہ مکمل کرلیا ہے اور انٹرمیڈیٹ بھی بس تقریباً ہوا سمجھیں۔

وہ کہنے لگے کہ ہمارے لئے کیا حکم ہے؟

میں نے کہا" جی کہ آپ میرا کسی فرنچ یونیورسٹی میں ایڈمیشن کروادیں۔"

"ریسپشن" پہ کھڑی لڑکا نما لڑکی کہنے لگی کہ فرانس میں تو انگلش میں ایجوکیشن نہیں ہوتی۔

میں نے کہا کہ یہ جو تین ماہ کا فرنچ کورس کیا ہے۔ کہنے لگی "اب تین ماہ کی بنیاد پر آپ کو ایڈمیشن نہیں مِل سکتا۔ میرا مشورہ ہے کہ پہلے بی اے، بی ایس سی کریں کم از کم اور ساتھ ایک سال کا فرنچ کورس۔"

میں بس تھوڑی دیر خاموشی سے اُسے تکتا رہا اور پھر ؎

داغؔ وارفتہ کو ہم آج ترے کوچے سے
اِس طرح کھینچ کے لائے ہیں کہ جی جانتا ہے

خیر یہ بات میں نے کسی کو نہیں بتائی۔ وہ کہتے ہیں ناں "بد سے بدنام بُرا"

اب میں نے کہنا شروع کردیا کہ ہائیر ایجوکیشن پاکستان میں رہ کر ہی کرنی ہے۔ لاہور یا اسلام آباد جاؤں گا۔ بلکہ اسلام آباد ہی جاؤں گا، اپنے دوست محمد علی کے پاس جو نمل یونیورسٹی سے ایم اے انگلش کر رہا ہے۔ اس نے مجھے فون پر بتایا کہ "بی اے" ماڈرن لینگوئجز میں ہورہا ہے۔ اس نے کہا، پر ہے چار سال کا۔

میں نے کہا، یار چار سال میں تو بندہ انجینئر یا ڈاکٹر بن جاتا ہے۔ یہ چار سال میں میں صرف بی اے کروں گا۔ کہنے لگا "یار دنیا میں انجینئر اور ڈاکٹری کے شعبے ہی نہیں ہیں صرف، اور باہر کے مما لک کے سٹوڈنٹس تو جانے کس کس شعبے میں کیا کیا کر رہے ہیں۔" میں نے کہا یعنی

"اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا"

مسئلہ چار سال کا نہیں تھا مسئلہ تو یہ تھا کہ میں یعنی چار سال پاکستان ہیر ہوں گا۔ خیر "بی اے" اِن ماڈرن لینگوئجز سننے میں بھی ذرا کمال کا ہی لگتا تھا۔ بس میں نے پکا ارادہ کرلیا کہ کرنا ہے تو" بیچلر اِن ماڈرن لینگوئجز" اور محمد علی کو کہہ دیا کہ داخلہ نہ ہاتھ سے جائے۔ اُس نے کہا کہ مسئلہ ہی کوئی نہیں داخلہ ہاتھ سے نہیں جانے دیں گے۔ داخلہ ہاتھ سے کیا جانا تھا؟ ڈیٹ ہی ہاتھ سے نکل گئی۔ ڈیٹ وہ نہیں جو آپ سمجھ رہے ہیں، میرا مطلب کہ داخلے کی ڈیٹ ہی ہاتھ سے نکل گئی۔ ہوا یوں کہ محمد علی نے کہا کہ بس تو آجا، اگلے ہفتے داخلہ ہوجائے گا۔ میں اپنے سازوسامان سمیت اگلے ہفتے آ گیا۔ یونیورسٹی ہاسٹل کی طرف گیا تو جا بجا چینی دکھائی دیں، میں نے سوچا، کبھی امریکہ اور کبھی چین یہ یورپ کہاں رہ گیا ہے؟ خیر محمد علی کے پاس پہنچا۔ تو وہ اپنے دوست کے ساتھ کمپیوٹر کو خراب کرنے پہ تُلا ہوا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی محمد علی کے دوست نے کہا کہ بھائی آپ یہ کمپیوٹر تو دیکھیں ٹھیک ہی نہیں ہورہا۔ میں نے کہا کہ بھائی میں کمپیوٹروں والا نہیں علی کا دوست ہوں۔ خیر علی نے کہا، اوئے اسے بیٹھنے تو دے پہلے۔

میں نے کہا کہ پہلے سے کیا مطلب آپکا یعنی بعد میں میرے سے کام ہی کروانے ہیں؟ کہنے لگا کہ صفائی نہیں کرانی یار یہ کمپیوٹر تو دیکھو آواز ہی نہیں آرہی۔

میں نے کہا کمپیوٹر تو مسئلہ ہی کوئی نہیں اگر آج کمپیوٹر ایجاد نہ ہوا ہوتا تو میں نے ہی کرنا تھا۔ اُسکا دوست کہنے لگا کہ بس ٹھیک

کر دیں۔ میں نے کہا یار ''بسیں'' میں ٹھیک نہیں کرتا، آپ نے کیا مجھے مکینک سمجھا ہوا ہے۔

محمد علی کے دوست نے محمد علی کو ایسے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو، او بھائی یہ دوست کہاں سے پکڑ کے لائے ہو؟ میں نے بھی کمپیوٹر ٹھیک کرنے کیلئے ہر قسم کے تکے لگائے۔ بقول خالد مسعود

ہم تکا لگاتے ہیں تو تکا نہیں چلتا
اور تیر چلاتے ہیں تو اُکا نہیں چلتا
میرٹ پہ سو بار ٹرائی کیا تو جانا
یہاں میرٹ بھی تو سُکا نہیں چلتا

پر آج ہمارا تکا چل گیا تھا وہ بھی سُکا، وہ مجھے دیکھ کے حیران میں انھیں دیکھ کے پریشان، خیر محمد علی کے دوست نے فٹافٹ کمپیوٹر پہ گانا لگایا کہ ''اِک پھل موتیے دا مار کے جگا سوہنیے'' اور مسلسل دو گھنٹے یہی گانا سنتا رہا اور جبراً سناتا رہا۔ رات کو اس کے ساتھ ٹہلنے باہر نکل پڑے مجھے کہنے لگا کہ اور کیا مصروفیات ہیں پڑھائی کے علاوہ آپکی؟

میں نے کہا ''شاعری کرتا ہوں۔''

چونک کے کہنے لگا ''اوئے یہ کیا کرتے ہیں آپ؟''

میں نے کہا ''شاعری کا کہا ہے، یہ نہیں کہا کہ گندی باتیں کرتا ہوں جو آپ اتنا چونک گئے۔''

کہنے لگا ''بہرحال کوئی اور مناسب سا شغل تلاش کریں۔''

مجھے اب ہلکا سا غصہ چڑھ گیا۔ میں نے کہا ''آپ انگلش میں ایم اے کر رہے ہیں؟''

کہنے لگا ''جی!''

میں نے کہا کہ فیصل آباد گھر بار چھوڑ کر صرف انگلش سیکھنے آ گئے آپ وہیں کوئی پانچ چھ ماہ کا کورس کر لیتے انگلش کا۔ فیس کتنی ہے آپ کی؟

کہنے لگے کہ کوئی ایک سمیسٹر کی آٹھ، نو ہزار۔

میں نے کہا ''اتنے میں تو چائنا کی دو سائیکل آ جاتی ہیں۔ ایک خود چلاتی تھی ایک چھوٹے بھائی کو دیتے۔ پھر بھی جیب میں دو تین ہزار بچ ہی جانے تھے۔ اُن پیسوں کی فیصل آباد میں انگلش کی ٹیوشن رکھتے۔ سائیکل پہ مزے پہ جاتے مزے سے آتے۔ زبان سیکھنے کے چکروں میں اسلام آباد ہی آ گئے۔ اگر زبان سیکھنے کا اتنا شوق تھا تو پھر امریکہ ہی چلے جاتے۔ یہ اسلام آباد ہے لندن شہر نہیں جہاں ہر کوئی انگلش میں بات کر رہا ہوگا اور آپ فرفر انگلش بولنا سیکھ جائیں گے۔''

بس پھر اگلے دو تین دن اُس نے میرے سے کوئی بات نہیں کی۔ میں نے بھی کہا کہ یہ بات ہے تو پھر کوئی بات نہیں۔

تین دن ہو چکے تھے مجھے آئے اور محمد علی مجھے صرف حوصلہ ہی دے رہا تھا کہ فکر نہ کر ہو جائے گا داخلہ، پر مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ مجھے حوصلہ دیتے ہوئے وہ اپنے آپ کو حوصلہ دے رہا تھا کہ ہو ہی جائے گا داخلہ۔ چوتھے دِن میں نے اُسے کہا کہ یار صحیح صحیح بتا دال میں کیا کالا پیلا ہے۔

وہ کہنے لگا ''دال ہی کالی ہو گئی ہے ساری''

میں نے کہا کہ میں سمجھا نہیں۔

کہنے لگا کہ ''اے کیہڑا کوئی نوی گل اے''

میں نے کہا کہ پہلیاں نہ بُجا۔

کہنے لگا کہ داخلے کا ٹائم نکل گیا۔

میں نے کہا تو نے تو کہا تھا کہ آ جا بس ہو جائے گا۔

کہنے لگا ''یار پتہ ہی نہیں چلا تیرے آنے پہ ہی پتہ کیا۔''

میں نے کہا ''تو نے کیا کِیا۔''

ویسے اندر سے میں تھوڑا مطمئن بھی تھا، کیونکہ سارے کا سارا ذمہ محمد علی پہ آ گیا تھا۔ ورنہ فارم جمع ہو جاتے تو اتنے نمبروں پہ داخلہ کہاں سے ہونا تھا؟ محمد علی ایڈمنسٹریشن کو جتنا مرضی چیخ چیخ کے بتاتا کہ یہ بڑا اچھا مقرر ہے، پاکستان لیول کا پر انھوں نے صاف منہ پہ ہی کہہ دینا تھا کہ اتنے نمبروں پہ پاکستان لیول چھوڑ کر چاہے ''ورلڈ لیول'' کا مقرر ہی کیوں نہ آ جاتا ہم نے اُس کو بھی ایڈمیشن نہیں دینا تھا۔ وہ تو میری عزت رہ گئی کہ ''ڈیٹ'' ہی گزر گئی۔ محمد علی میرے سے معذرت کرتا پھرے۔ اور میں بھی تھوڑا بہت موڈ میں پھروں کیونکہ ایسے موقعوں پر موڈ میں رہنا ہی اچھا ہوتا ہے ورنہ اُس نے سمجھنا تھا کہ اِدھر بھی دال میں کچھ کالا ہے۔

میں واپس فیصل آباد آ گیا اور ابا جی کو کہنے لگا کہ اپنا شہر اپنا ہی

ہے۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اپنے عظیم ادارے جی سی یونیورسٹی سے ہی ہائیر ایجوکیشن، میرا مطلب ہے کہ ایجوکیشن پوری کرنی ہے اور پھر ہائیر ایجوکیشن کیلئے یورپ روانہ ہونا ہے؟

اگلے دِن میں جی سی یونیورسٹی اپنی تمام ڈگریوں سمیت یعنی تعلیمی اور تقریری معرکوں کی ڈگریاں لے کر پہنچ گیا۔ تعلیمی ڈگریوں سے تو معمہ حل نہیں ہونے والا تھا۔ اِس لیے سیدھا ڈرامیٹک سوسائٹی کے انچارج علی عثمان صاحب کے پاس پہنچا۔ اُن کو اپنی تمام تقاریری اسناد دکھائیں۔

ساری اسناد دیکھ کر کہنے لگے کہ آپ نے انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کرلیا ہے؟ میں نے ڈرتے ہوئے کہا ''جی ہوگیا۔'' کہنے لگے ''وہ بھی سند اِن کے ساتھ لگا دیں اور سنائیں تقریر۔'' خیر سنادی تقریر، فوری اُٹھے اور مجھے اپنے ڈیپارٹمنٹ سے باہر لے آئے۔ مجھے یقین ہوگیا کہ مجھے یونیورسٹی گیٹ کے باہر چھوڑنے جارہے ہیں۔ اور ''گارڈوں'' کو تاکید مزید بھی کر دیں گے کہ دوبارہ یہ سٹوڈنٹ اندر نہ داخل ہونے پائے لیکن شاید انھیں رحم آ گیا اور انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ مجھے وہ ایک اور ڈیپارٹمنٹ میں لے گئے اور وہاں میرا فارم جمع کروایا، یوں میری ہائیر ایجوکیشن شروع ہوگئی۔

گوہر رحمان گہر مردانوی

واہ واہ خان

کھنے کو تو یہ ہمارے علاقے کے ایک نامی گرامی اور مخیّر شخصیت کا نام ہے اور ہمارے علاقے کے چھوٹے موٹے خان اِن کے پیروں کی گرد بھی نہیں، مگر گردشِ زمانہ کہ اولاد نہ ہونے کی وجہ سے آج ہم واوا خان سے واہ واہ خان بنانے پر مجبور ہوگئے، جو بہ بلحاظ موضوع ان کے بالکل متضاد امر ہے اور یہ والے واہ واہ خان، جیسا کہ نام سے جھلک رہا ہے، وہ خان ہیں جو بونگے اشعار پر بھی داد دینے میں بخل سے کام نہیں لیتے کیونکہ ان کا جاتا کیا ہے زیادہ سے زیادہ گلا بیٹھ جاتا ہے جو نمک اور اسپرین ملے کلی سے دوسرے مشاعرے کے لئے اور بھی لوچدار ہو جاتا ہے۔ تو صاحبو لمبی چھوڑی تمہید باندھنے کی وجہ صرف یہ ہے کہ جن کو آج میں جس مخلوق پر قلم اٹھا رہا ہوں، اُس کے سارے دانے ہم قبیل ہیں اور کل کلاں ہمارا حشر بجو کی شکل میں کتابوں رسالوں اور رسائل میں نشر ہونے والا ہے اور تو اور، یہ موا فیس بک تو سیکنڈوں میں عزت نیلام کر کے رکھ دیتا ہے۔ خبر ہونے سے پہلے پہلے ہی تیا پانچا کر دیتا ہے۔

اچھا تو بات ہو رہی تھی متشاعروں کی تو آیئے پہلے قبیل سے متعارف کراتے چلیں۔

پہلا قبیلہ اُن بلاؤں پر مشتمل ہے جو اپنی ساری عمر میں محض ایک غزل لکھ پاتے ہیں اور پھر ساری زندگی اُسی کا کھاتے ہیں، میرا مطلب ہے کہ ہر مشاعرے میں اُسی غزل کا گولہ داغ دیتے ہیں اور منوں، ٹنوں کے حساب سے داد لپیٹ لیتے ہیں۔۔۔ نہیں بلکہ سمیٹ لیتے ہیں۔ اوّل اوّل چار پانچ مشاعروں میں وہی راگ الاپتے ہیں، اِس انداز سے الاپتے ہیں جیسے اُن کی اس غزل میں کچھ ایسا ہے، جس کو حضرت غالب بھی سُن لیتے تو دل مسوس کر رہ جاتے کہ کیوں اُنہوں نے مومن کو اُن کے ایک شعر کے عیوض اپنا سارا دیوان دے دینے کا کہا تھا، کیوں نہ اِن موصوف شاعر کی اکلوتی غزل سننے کا انتظار کیا تھا جس پر وہ اگر اپنا سارا دیوان قربان کر دینے کا شغل پورا کر بھی دیتے تو ناحق نہ ہوتا۔ اس قبیلے کا ہر متشاعر اپنے اس اکلوتے راگ کو الاپ الاپ کر سامعین کو اس قدر اس کا عادی بنا لیتے ہیں کہ وہ ہر مشاعرے میں بصد اصرار اس غزل کو سننے کا جگر پیدا کر لیتے ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ موصوف اس مقصد کے لئے شاگرد نما شعراء کی ایک ایسی کھیپ بھی تیار کر لیتے

ہیں جو ہر مشاعرے میں اُنہیں یہی غزل سنانے کی فرمائش کرتے ہیں اور بصد اصرار کرتے ہیں، اس ضمن میں موصوف کے اظہارِ انکساری کو بھی خاطر میں نہیں لاتے۔ بھلا اندھا کیا چاہے، دو آنکھیں ۔۔۔اس طرح اِن کی غزل قبولیتِ عامہ کی سند پا کر اِنہیں کم از کم شاعروں کی اوّلین صف میں ضرور شامل کر دیتی ہے اور یوں یہ صاحب اپنا وہی پرانا راگ الاپ کر بزمِ شعری سے بہ حفاظت کھسک لیتا ہے۔

دوسری قسم اُن استاد نما شعراء کی ہے جن کے دائرۂ افکار میں تخیل نام کی کوئی چڑیا پر نہیں مارتی ہاں البتہ یہ صاحبان عروض کے پیمانے پر تول تول کر خیال کی نازکی کا کباڑا کر دیتے ہیں۔ یہ شعراء نہ صرف اپنی غزلیات میں عروضیانہ لغویات کو ٹھونس ٹھونس کر اپنی بیاض کو بھر لیتے ہیں بلکہ ایسے شعراء کے فرائض میں دوسرے شعراء کے کلام میں سومونٹس کی طرح عروض دانی کا پنگا از خود لینے کا کام بھی شامل ہے، چاہے وہ اُن کی اصلاح کے متحمل ہو سکیں یا نہ ہو سکیں۔ اس طرح خود کو استاد ثابت کر کے گویا دوسروں کو سرے سے شاعر ہی ماننے کو تیار نہیں رہتے لیکن جب ان کا سابقہ کسی افلاطون نوع کے شاعر سے پڑ جاتا ہے تو پھر آئیں بائیں شائیں کرنے لگتے ہیں اور بغلیں جھانک کر تپلی گلی سے نکلنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اب آتے ہیں ایک اور فنکار قسم کے شاعر کی طرف جو بظاہر بڑی خطرناک قسم کی توپ شاعری کرتے ہیں مگر ان کا طریقۂ واردات یہ ہے کہ یہ شعراء کسی بھی مستند اور بڑے شاعر کا مطلع معمولی رد و بدل سے اپنے کلام میں گھسیڑ کر شامل کر لیتے ہیں اور کسی ردی والے کی مدد سے کسی گمنام شاعر کا سطحی سا بے جوڑ مصرعہ ملا لیتے ہیں اور یوں شاعر بن کر نہ صرف یہ کہ داد سمیٹ لیتا ہے بلکہ اس عمل سے صیقل ہو کر اپنی عروضی قینچی مزید تیز کر لیتا ہے اور پھر اللہ دے اور بندہ لے۔ کبھی کبھی تو پوری کی پوری غزل ہی ہڑپ کر لیتا ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ ہر چھوٹے بڑے مشاعرے میں سنانا اپنا فرضِ عین سمجھتا ہے۔ سامعین بیچارے ان کا کلام سُن سُن کر اس کے اس قدر عادی ہو جاتے ہیں کہ اُنہیں داد دیئے ہی بنتی ہے،

اینگری ینگ مین

دو دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک اینگری ینگ مین تھا۔ اِتنا غصے والا کہ ناک پر مکھی بھی نہیں بیٹھنے دیتا تھا۔ ایک بار جب وہ اپنی فیملی کے ساتھ لان میں بیٹھا ہوا تھا تو غلطی سے ایک مکھی اس کے ناک پر بیٹھ گئی۔ اس نے مکھی کی اتنی بے عزتی کی اتنی بے عزتی کی کہ وہ غریب ہمارے سیاستدانوں کے برخلاف، وہیں پر گر کر مر گئی۔ اُس اینگری ینگ مین کے والدین نے جب یہ سب دیکھا تو فیصلہ کیا کہ اس کی شادی کروا دیتے ہیں تبھی اس کا غصہ ٹھنڈا ہو گا۔

اب اُس اینگری ینگ مین کی شادی کو چھ ماہ ہو چکے ہیں۔ اب جب اس اینگری ینگ مین کے ناک پر مکھی بیٹھتی ہے تو وہ مکھی سے عرض کرتا ہے "اب اُڑ بھی جانا میری جان۔ بچے کی جان لے گی کیا۔"

ارسلان بلوچ

یہ عمل بالکل وہی ہے جیسا کہ ہمارے ملک کے ووٹر ہمیشہ اُنہیں لٹیروں کو اپنا ووٹ دان کرتے ہیں جن کو بظاہر وہ پسند نہیں کرتے۔ یوں یہ مستند قسم کے حقیقی تخلیق کار کہلاتے ہیں چاہے سُن گُن پا کر حقیقی تخلیق کار لاکھ دعوے کرتا پھرے، اس کی ایک نہیں چلتی۔ بھلا نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سُنتا ہے۔ ایسوں کو ہم اپنی بولی میں "قینچی کڑپ" کہہ کر پکارتے ہیں اور بچارا سامع جو واقعی قاری اور باذوق ہوتا ہے، یہ کہہ کر چپ سادھ لیتا ہے کہ

بات تو سچ ہے مگر بات ہے رسوائی کی

اس کے بعد ایک اور قسم ہے اور یہ قسم اُن نام نہاد شعراء پر مشتمل ہے جو اپنے طرزِ تکلم کی جدت سے اپنے لیے اُردو شاعری میں وہ مقام پیدا کر دیتا ہے کہ جن تک قادر الکلام شاعر کا پہنچنا بھی محال ہوتا ہے۔ ان کا کلام متذکرہ بالا شعراء سے بہ لحاظ فن بہتر بھی ہوتا ہے اگر چہ مقصدیت سے کوسوں دور ہوتا ہے پھر بھی پنپ ہی جاتا ہے اور ہمارے قاری کو بھی تو اللہ سمجھ دے کہ بونگے کلام پر بھی واہ واہ کی ایسی فضا باندھ دیتا ہے کہ در و دیوار تک مارے ڈر کے دہل جاتے ہیں بلکہ بعض سامعین تو ایسے بھی ہوتے ہیں کہ شاعر موصوف نے ابھی منہ سے کچھ پھوٹا بھی نہیں ہوتا اور وہ ایڈوانس

شادی اور حادثہ

حادثہ کچھ یوں ہوا۔ جنوری میں منگنی ہوئی۔ مارچ میں نکاح اور جُون میں شادی پایۂ تکمیل کو جا پہنچی۔ اس سُست رفتاری کا انجام یہ ہوا کہ اب سال کی تین تین تاریخیں تو شادی کے حوالے سے یاد رکھنی پڑتی ہیں اور اس کے علاوہ ایک دو تاریخِ پیدائش کا بھی رٹا لگانا پڑتا ہے۔ خدشہ ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ یہ تاریخیں بھی بڑھتی جائیں گی اور سالانہ جشنِ عرس اور جشنِ میلاد کے خرچے بھی بڑھتے جائیں گے۔ اب خیال آتا ہے کہ شادی کی بجائے مطالعۂ پاکستان میں ایم اے کر لیتا تو اچھا تھا۔ **ارسلان بلوچ**

میں نعرۂ واہ واہ بلند کر دیتے ہیں، جیسے اُن پر موصوف شاعر کا کلام الہام بن کر اُتر پڑا ہو۔ اب بھلا ایسا قاری یا سامع تو عام سا نہیں ہوتا۔۔۔ ہاں ٹھیک سمجھے یہ قاری یا سامع بھی شاعر ہی ہوتا ہے جنکی ابھی باری آنی ہوتی ہے۔ ظاہر ہے اُن کی بھی تو خواہش ہوتی ہے کہ مشاعرے میں اُن کے سطحی کلام کو سننے اور داد دینے والا بھی تو کوئی ہو۔

اب جناب جگر تھا کر بیٹھیں اور اگلی قسم کا احوال ملاحظہ فرمائیں۔ یہ قسم وہ کیڑے مکوڑے۔۔۔ افففف۔۔۔ نہیں یار منہ سے پھسل گیا، وہ نامی گرامی شعراء کی ہے جو چند لفظ جوڑ کر سمجھ لیتے ہیں کہ ہم بھی "ملک الشعراء" ہیں اور اگر سچ پوچھیں تو وہ سرے سے شاعر ہی نہیں ہوتے بلکہ شعراء کی صحبت سے کچھ سیکھ لیتے ہیں اور اس بات پر ناز بھی کرتے پھرتے ہیں لیکن اگر ان کو کہا جائے کہ کسی ایونٹ پر کچھ لکھ لو تو پھر ان کی سٹی ہی گم ہو کر رہ جاتی ہے اور وہ بہانے بازی پر اتر آتے ہیں کیونکہ قلعی کھلنے کا خطرہ ہوتا ہے۔ اِنہیں واہ واہ کا جو چسکا لگا ہوتا ہے اس فعل سے اِنہیں اس کے گرہن لگ جانے کا خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔ اس قبیل کا قبلہ کبھی دُرست نہیں رہتا۔ یہ حضرات تاریخِ ادب کے بحرِ اسود میں گم ہو کر رہ جاتے ہیں اس لیے ان کو ہر وقت منہ بنا بنا کر کڑکڑانے کا مرض لاحق رہتا ہے کہ زمانہ ہیرا شناس نہیں۔ دراصل ان کا مقام ہی یہی ہوتا ہے کہ سٹیج پر آئیں، کلام سنائیں اور پھر باتوں ہی باتوں میں اپنی توپوں کا رُخ اچھے اور حاضر دماغ شاعر کی طرف کر لیں۔

صاحبو اس قسم والا شاعر اگرچہ جانِ محفل ہوتا ہے اور سامعین کے تفننِ طبع کا بہت سارا مواد ان کے ذخیرے میں جمع رہتا ہے مگر میں کم از کم میں تو ان کو شاعر نہیں مانتا کیونکہ ان کی شاعری میں خیال کی نزاکت کم اور بازاری لہجہ زیادہ ہوتا ہے مگر جانے کیوں ایسے شعراء مقبول عام بھی رہتے ہیں۔ شائد ہمارا قاری و سامع ہی سنجیدہ نہیں، اس لیے کسی بھی بے سروپا بازاری و پکڑ شاعری پر بیساختہ واہ واہ واہ کر اُٹھتا ہے اور اس قدر رشدت سے کرتا ہے کہ صبح سویرے دی جانے والی مرغوں کی بانگوں کو مات دے دیتا ہے، جبکہ سنجیدہ اور باوقار شاعر سسک سسک کر مر جاتا ہے، یہ الگ بات ہے کہ اُنہیں خراجِ عقیدت بعد از مرگ ملتی ہے جبکہ بقیدِ حیات اُن کی شاعری کو پوچھنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ جب وہ انتقال فرما جاتا ہے تو اُن کا کلام مارکیٹ میں مانگ بڑھ جانے کی وجہ سے نایاب رہتا ہے۔۔۔ ارے واہ واہ خانوں تمہارا ابھی کیا ہی کہنے۔ ہجوگو اور بازاری شاعری کو تو سب پسند کرتے ہو اور کمیاب لوگوں کے نایاب کلام کو اُن کی زندگی میں ہی ردی میں پھینک دیتے ہو۔

وہ شاعر جن کے کلام میں برجستگی و بے ساختگی بھری ہوئی ہو، ندرت، نزاکت خیال کی گہرائی اور گیرائی اُن کی شاعری کی نمایاں خصوصیت ہو، وہ شاعروں کا وہ کمیاب قبیلہ ہے جو زمانے کی بے اعتنائی کی بھینٹ چڑھ جاتا ہے۔ اگر بعد میں رفوگری کا اہتمام ہو بھی تو کیا حاصل؟ اور انکے کلام کی قدر و منزلت بڑھ جائے تو کیا فائدہ؟ جیتے جی تو موصوف داد و دہش کے لیے تڑپتا رہا ہوتا ہے، جو واقعی دل سے دی گئی ہوتی ہے اور اس واہ واہ میں ملمع کاری نہ ہو اور داد برائے داد نہ دی گئی ہو تو دوستو ساتھیو، ہم قبیلو، دل چھوٹا نہ کریں کہ ہم نے خود ہی اپنے ہم قبیلوں کو نشانہ بنایا بلکہ اس زمرے میں ہم بھی آتے ہیں چاہے متذکرہ بالا اقسام میں سے کسی میں بھی فٹ کر دیں، اپنا ظرف زیادہ اور نقد سننے کے لیے سینہ بڑا ہے۔ بیشک فدوی کی ہجو لکھ مارو لیکن پھر ہمارا اجواب ہی بھاری پڑے گا، آزمائش شرط ہے۔

چلو پھر آزما لو ظرف میرا
پتہ لگ جائے گا کتنا بڑا ہے

ذہین احمق آبادی

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

کہر کی ہلکی ہلکی دبیز تہہ میں لپٹی یاد پردۂ تخیل پر ابھر رہی ہے۔۔۔ جانے کیوں؛ مگر ایسا محسوس ہو رہا ہے، گویا یہ سب کچھ پہلے سے ہی یہاں موجود رہا ہو۔۔۔ الفاظ کے خمیدہ نقوش سرِ بین السطور ظہور پذیر ہو رہے ہیں۔۔۔ جیسے جادوئی چھڑی چھوتے ہی صفحۂ قرطاس نے سربستہ راز اگلنے شروع کر دیے ہوں۔۔۔ اِدھر تو فقط نوکِ قلم پھسل رہی ہے، اور خطوطِ نہاں، عیاں ہوتے جا رہے ہیں۔۔۔ گویا جو کچھ ہونا تھا، وہ از بس لکھا جا چکا تھا۔۔۔ مگر خیر۔۔۔!

ذہن بربطِ شعور پر ماضی کی تان بکھیر رہا ہے۔۔۔ غالباً اس وقت چھٹی جماعت میں تھا۔۔۔ یا شاید حفظ کر رہا تھا۔۔۔ نہیں، نہیں۔۔۔ چھٹی جماعت میں ہی تھا۔۔۔ یا شاید۔۔۔ خیر۔۔۔ ماما ہمیں نماز پڑھنے کو گھر سے نکالتی تھیں۔۔۔ ہمارا گھر گلی کے ایک نکڑ پہ تھا۔۔۔ اور دوسرے سرے کے موڑ پر، سیدھے ہاتھ کو مُڑنے سے مسجد آتی تھی۔۔۔ مگر وہاں جاتا کون تھا۔۔۔ ہم تو الٹے ہاتھ کو مڑ جاتے تھے۔۔۔ وہاں ویڈیو گیمز کی دکان ہوتی تھی۔۔۔

یہ نہیں کہ نماز سے بالکل ہی فارغ ہو کر رہ گئے تھے؛ حاشا وکلا۔۔۔ کبھی کبھی پڑھ بھی لیتے تھے۔۔۔ لیکن اکثر اس چوراہے پر پہنچتے ہی جب ''اُصحابُ الیمین '' (ما اصحاب الیمین) اور ''اصحاب الشِّمال'' میں چناؤ کا وقت آتا تھا، تو وہی حالت ہوتی تھی کہ بقولِ غالب ؎

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے، کلیسا مرے آگے

تو خیر۔۔۔ ماما ہمیں نماز کو بھیجتی تھیں تو ہمارا ہدف وہی دکان ہوتی تھی۔۔۔ پہلے پہل وہاں پر ہی ''ٹیکن ۳'' کھیلی۔۔۔ پھر گھر کے کمپیوٹر پر بھی برآمد کر لی۔۔۔ ''کیڈیلیک اینڈ ڈائنوسارز'' پر خوب وقت ضائع کِیا۔۔۔ جس کو عرفِ عام میں ''مصطفیٰ والی گیم'' کہا جاتا تھا۔۔۔ ''کِنگ آف فائٹرز'' کی تو بات ہی کیا تھی۔۔۔ کوئی ہمارے مقابل ٹِک نہیں سکتا تھا۔۔۔ 'پچّو مچّو' (سنو براس)، میٹل سلگ اور اس جیسی جانے کتنی ہی گیمیں روشن پردۂ شاشہ (اسکرین) پر موجود و معدوم ہوتی رہیں۔۔۔ اسی طرح دوکان کے باہر تھڑے پر، مگر راستے سے ذرا ہٹ کے، ''ہینڈ ساکر'' یا ''ہینڈ فٹبال'' کی میز پڑی ہوتی تھی۔۔۔ جو کہ مقامی زبان میں ''پچّی'' کہلاتی تھی۔۔۔ اس پر بھی خوب رنگ جمائے۔۔۔

لوگ ایسے آس پاس جمع ہوتے تھے کہ

اہلِ ایماں جس طرح جنّت میں گردِ سلسبیل

سنوکر کی میز بھی رکھی ہوئی تھی، مگراس سے کبھی دلچسپی نہ محسوس ہوئی۔۔۔ خیر۔۔۔ کھیلتے کھیلتے وقت دیکھ، خودکوسر پر چپت لگاتے، احساس ہوتا کہ نماز کا وقت تو آدھے گھنٹے پہلے ہی پورا ہو چکا۔۔۔ بس پھر سب کچھ ویسا ہی ادھورا چھوڑ چھاڑ، گھر کو دوڑ لگاتے۔۔۔ اور یقیناً مراد پاتے۔۔۔!

پھر چشمِ فلک نے وہ وقت بھی دیکھا جب ہم اس چوراہے سے بائیں کے بجائے دائیں جانب مُڑ جاتے تھے۔۔۔ مگر نماز تب بھی بھلا کون پڑھتا تھا۔۔۔ وہ تو مسجد کے سامنے والی گلی میں ذرا آگے کو جاکر ''گیم زون'' کھلا تھا۔۔۔ وہاں ''ایکس باکس'' اور ''پلیاسٹیشن۲'' براجمان ہوتے تھے۔۔۔ وہیں اپنا کثیر وقت پھینک آتے تھے۔۔۔ گوکہ یہ چیزیں گھر میں پہلے سے ہی موجود تھیں، مگر ہم وہاں جاکر تبرّک کشید کرنا عین مستحب سمجھتے تھے؛ کہ کیا معلوم نروانہ وہیں سے ہاتھ لگ جائے، اور وہ بھی تھوک کے حساب سے، چہ عجب۔۔۔ اور ہاں، اس دوران کاسۂ سر پر نیم مدوّر، چوکور شطرنجی سوراخوں والی، جالی دار سفید ٹوپی دھرے رکھنے میں بھی مطلقاً کوئی مضائقہ نہ محسوس کرتے تھے، بقولِ قمر

کہ دیکھیں لوگ تو سمجھیں بڑے اللہ والے ہیں

ایک دفعہ تو بال بال پھنستے بھی بچے۔۔۔ بلکہ برے پھنسے۔۔۔ ہوا یہ کہ ان دنوں کراچی سے خالہ زاد برآمد کیا ہوا تھا۔۔۔ تس پر طرّہ یہ کہ ہم اس کو شریکِ راز کر بیٹھے۔۔۔ مزید یہ کہ وہ حضرت ہم سے کسی بات پر ناراض ہوگئے۔۔۔ بس، پھر کیا تھا؛ ہمارا راز طشت از بام ہوگیا۔۔۔ مگر ہم نے بھی کچی گولیاں کہاں کھیلی تھیں۔۔۔ عبقری نسخہ ہائے کیمیا برائے کیل، مہاسوں سے نجات از بر تھے۔۔۔ اُنہیں نے رسد بہم پہنچائی۔۔۔ ایسی پیش بندی نقشبندی مجددی کی، کہ یہ تو نہ ہوا کہ گھر والوں کو اس سب کی خبر نہ ہوئی؛ مگر یہ بات مخفی ہی رہی کہ اپنی نمازیں بھی ادھر ہی گول ہوتی رہی ہیں۔۔۔ گھر والے فقط یہ سمجھے کہ وہاں کبھی کبھار (یہی کوئی دن میں چار پانچ مرتبہ) جاتے ہیں۔۔۔ گوکہ محض ویڈیو گیم کی دکان پر جانا ہی گھر والوں کے نزدیک انتہائی قبیح فعل ثابت ہوا۔۔۔ اور ہمارے ساتھ جو کچھ ہونا تھا، وہ ہوا۔۔۔ اور خُوب ہوا۔۔۔ ہمارے گھر میں جُوتیوں کی قلّت کی مختلف وجوہات میں سے ایک وجہ یہ بھی ہے۔۔۔ آخر ہم ماما، بابا کے ہاتھوں کی جُوتیاں بہت رغبت سے جو ''کھاتے'' ہیں۔۔۔ مگر خیر۔۔۔!

معانی، الفاظ کا ملبوس لیے، جہانِ صفحہ پر ثبت ہونے کو بے چین بیٹھے ہیں۔۔۔ جانے کیوں؛ مگر جتنے بھی بڑے بڑے گناہ کیے، اکثر رمضان میں ہی سرزد ہوئے۔۔۔ یا شاید، ایسا زودِ پشیمانی کے باعث محسوس ہوتا ہے۔۔۔ خیر۔۔۔ سب سے پہلا ''ایم پی ۳ پلیئر'' بھی رمضان میں ہی، اپنے ایک دوست کے ساتھ اشتراک کر کے، مُبلغ سات، ساڑھے سات سو روپے کا، بازار سے بارعایت خرید فرمایا تھا۔۔۔ کیا، کیا گانے سُنے۔۔۔ اور خُوب سُنے۔۔۔ اپنا گانوں کا ذائقہ بھی اِک ذرا منفرد قسم کا تھا۔۔۔ دیسی اور ولایتی، دونوں ہی مرغوب تھے۔۔۔ بلکہ نوبت تو یہ تھی، کہ انگریزی گانوں کے بول (لِرِکس) تک نیٹ سے نکال نکال کر یاد کرتے تھے۔۔۔ اور عند اللہ ماجور ہونے کی کوشش کرتے تھے۔۔۔ آج بھی یاد ہے؛ رمضان کے عشرۂ مغفرت کا دور دورہ تھا۔۔۔ مسجد میں تراویح سنائی جا رہی تھیں۔۔۔ اور، ہم دونوں حُفّاظ دامت برکاتہم، مسجد کے عین سامنے والے گھر کے دُوسرے پُختہ زینے پر بیٹھے، کانوں میں گناہ انڈیلتے، مغفرت کرانے میں مصروف تھے۔۔۔ میں گانوں کے حرام، حلال ہونے کی بحث میں نہیں پڑنا چاہتا؛ مگر جو ایک بات ہے، اور سیدھی بات ہے۔۔۔ وہ یہ ہے کہ کم از کم محمد صلّی اللہ علیہ وسلم کو اُسوۂ حسنہ ماننے والا ان کو ہرگز، ہرگز پسند نہیں کرسکتا۔۔۔!

تو خیر۔۔۔ گالیوں میں بھی ہمارا کوئی ثانی نہیں تھا، اللہ کے فضل سے۔۔۔ بلکہ اکثر تو ایسا معلوم ہوتا گویا منہ کے عین آگے کچرا گھر واقع ہے۔۔۔ بات نکلتی نہیں تھی، کہ تھوک کے حساب سے، موقعہ کی مناسبت کو ملحوظ رکھتے ہوئے، جملے کو مزیّن کرنے واسطے، گالیاں بہہ، بہہ جاتی تھیں۔۔۔ یا یہی کہنا شاید کافی ہو، کہ اس وقت اگر لکھتے ہوتے تو 'کالم نگاری' کے بجائے ''گالم

نگاری'' کرتے۔۔۔ اب تو خیالات میں وہ قدرت ہی باقی نہ رہی؛ بلکہ اب تو کوئی گالی دے بھی دے، تو یہی ہوتا ہے زیادہ سے زیادہ کہ اُس نے گالی دی، اور ہم نے لے لی۔۔۔ اللہ، اللہ، خیر صلہ۔۔۔!

اور ہاں، یاد آیا، مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے ہم ایک مرتبہ، قاری صاحب کے ساتھ ہماری حالت تو وہی تھی کہ بقول مومنؔ ۔

کل جو مسجد میں جا پھنسے مومنؔ
رات کاٹی خدا خدا کر کے

حضرت ایک بچے کی کارکردگی زہر مار کروا رہے تھے۔۔۔ تعریفانہ لہجے میں بولے:

"اس حرامی نے دس پارے حفظ کئے ہُوئے ہیں۔۔۔!"

اس کے جواب میں ہم ''ماشاء اللہ''، ''سبحان اللہ'' یا ''واہ'' کے علاوہ بھلا کیا کہہ سکتے تھے۔۔۔ سو، کہہ، چُپ ہو رہے۔۔۔ ہمارا حسنِ ظن کہتا ہے کہ یہ معیوب لفظ وہ عربی میں کہہ رہے تھے۔۔۔ جیسا کہ ضریر احمد نے اپنے ''ایک عجمی کی عربی کا احوال'' میں فرمایا کہ عجمی و عربی حرامی میں زمین آسمان کا فرق ہے۔۔۔ گو کہ دونوں ہی منفی ہیں مگر عربی میں یہ چور کیلئے مستعمل ہے۔۔۔ اُردو والے سے تو بہتر ہی ہے۔۔۔!

ہاں، ہاں؛ معلوم ہے۔۔۔ یہ تحریر بھی شیطان کی آنت ہو چکی۔۔۔ مگر اپنے آثارِ قدیمہ بھی اب اِتنے مختصر نہیں کہ اتنی جلدی قصہ پارینہ ہو رہیں۔۔۔ اس بات پر بھی مجھے شک ہے کوئی اب تک پڑھ ہی رہا ہوگا۔۔۔ مگر خیر، کیا فرق پڑتا ہے

یہ پیش لفظ تھا، جس نے رُلا دیا تُجھ کو

خیر۔۔۔ یاد تو اور بھی بہت کُچھ آ رہا ہے مگر کسرِ نفسی کے باعث بیان سے باہر ہے۔۔۔ شاید دس سال ہوتے ہیں۔۔۔ یا بارہ۔۔۔ وہ، ہر روز دوپہر کے وقت، بچپن میں، گرمیوں کی چھٹیوں میں بلا ناغہ، ''مولان'' مووی دیکھنا۔۔۔ وہ، چھالیہ وغیرہ کھاتے کھاتے، دوست کے کہنے پر، کُچھ اور بھی پھانک رہنا اور پھر عجب جذب کے عالم میں آوارہ گردی کرتے پھرنا گلیوں، گلیاروں میں۔۔۔ پھر چھالیہ، سپاریوں تک سے توبہ کرنا، اور سنجیدگی سے اس بات پر غور کرنا؛ کہ آخر کانچ کی کرچیوں کا ذائقہ خُون جیسا کیوں ہوتا ہے ۔

یادِ ماضی عذاب ہے یاربّ
چھین لے مُجھ سے حافظہ میرا

جانے کیوں، لیکن یہ شعر پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے؛ گویا اس کے دوسرے مصرعے میں جنس، یعنی کہ مذکر، مؤنث میں کوئی بہت ہی نامعقول اور غیر آرام دہ سی، فاش قسم کی غلطی رہی ہو۔۔۔ مگر خیر۔۔۔!

امّا بعد۔۔۔ جانے کیوں، اور کیسے، یک گُونہ احساس کی نمود ہوئی۔۔۔ لگا؛ گویا کہ کچھ غلط چل رہا ہے زندگی میں۔۔۔ کچھ غلط، بہت غلط۔۔۔ کُچھ ایسا، جسے نہیں ہونا چاہئے۔۔۔ بالکل بھی نہیں ہونا چاہئے۔۔۔ کسی بھی حالت میں۔۔۔ دِیروز تا اِمروز کی داستان کے زحاف زدہ صفحے اُلٹنے لگے۔۔۔ واپسی کا سفر طے کرنے لگے۔۔۔ ایک نئی کھکھوڑ شروع ہوئی۔۔۔ آگہی کے دروا ہونے شروع ہوئے۔۔۔ احباب دُور ہونے لگے۔۔۔ وہ جو ہر گناہ میں ساتھ دیتے نہ تھکتے تھے، کہنے لگے'' کیا مولوی ہو رہا ہے''۔۔۔ اور ہم مسکرا اٹھے۔۔۔ یا شاید رو دیے۔۔۔ کہ تمھیں کچھ نہیں معلوم۔۔۔ کچھ نہیں معلوم۔۔۔ کاش کہ تمھیں معلوم ہوتا۔۔۔ اور مزے کی بات تو یہ تھی کہ معلوم تو ہمیں بھی کچھ نہیں تھا۔۔۔ مگر یہی تو فرق تھا کہ کم از کم یہ تو معلوم تھا، کہ کچھ نہیں معلوم۔۔۔ وہ چھوڑ کر چلے گئے مجھے۔۔۔ سب چھوڑ کر چلے گئے۔۔۔ کیا تم یقین کرو گے۔۔۔؟ مگر نہیں۔۔۔ تم کیوں یقین کرو گے۔۔۔ لیکن پھر بھی، میں تمہیں بتاتا ہوں۔۔۔ میں رویا تھا۔۔۔ بہت رویا تھا۔۔۔ اور ربّ، ہاں، وہ ضرور اس ادا پر مسکرا دیا ہوگا۔۔۔ کہ بقول مجازؔ ۔

ہنس دیے، وہ میرے رونے پر مگر
ان کے ہنس دینے میں بھی اِک راز ہے

بہت وحشت ہوتی تھی۔۔۔ عجب مزاج ہو گیا تھا۔۔۔ الحاد سے دل خوگر ہونے لگا تھا۔۔۔ لیکن ربّ۔۔۔ میرا رحیم و کریم ربّ۔۔۔ وہ دُور کہاں تھا۔۔۔ دور تو میں تھا۔۔۔ وہ تو منتظر

تھا۔۔۔ ہمیشہ سے منتظر تھا۔۔۔تشنہ مضرابِ سماعت نے کلام کا لمس محسوس کیا۔۔۔

اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَ مَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ وَ لَا یَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَیْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَ كَثِیْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ

(الحدید - ۱۶)

''کیا اب بھی، اُن لوگوں کیلئے جو ایمان لائے، وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد، اور جو کچھ حق کی طرف سے نازل ہوا ہے، کیلئے نرم پڑ جائیں، اور؛ تا کہ وہ اُن لوگوں جیسے نہ ہو جائیں جنھیں پہلے کتاب دی گئی تھی؛ پھر ان پر طویل زمانہ گزر گیا تو ان کے دل سخت ہوگئے۔ اور ان میں سے اکثر جان بُوجھ کر گناہ کرنے والے ہیں۔''

ماہیئتِ قلب کیا ہوتی ہے۔۔۔؟ یہ تب ہی معلوم ہُوا۔۔۔ تب ہی سمجھ آیا کہ ایک دفعہ بندے کو بیٹھ کر سوچنا پڑتا ہے۔۔۔ ''اِقرار' بِاللِّسَان'' تو بچپن سے کرتے آرہے ہوتے ہیں۔۔۔ ''تصدیق' بِالقلب'' ایک دفعہ کرنا پڑتا ہے۔۔۔ ایک مرتبہ پھر سے اسلام کو دریافت کرنا پڑتا ہے۔۔۔ کہنا پڑتا ہے، ''سَمِعنَا وَ اَطَعنَا'' ہم نے سنا اور سرِ تسلیم خم کیا۔۔۔ اس کے بعد کُچھ بھی انتخابی (آپشنل) نہیں رہتا۔۔۔ کچھ بھی نہیں۔۔۔ کیونکہ راستے کے معلوم ہونے، اور اس پر چلنے میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔۔۔ اور اپنی مرضی کے راستے پر چلنے کیلئے، بہر حال، وہ راستہ چھوڑنا از بس ضروری ہوتا ہے جو آپ کی منشا کے مطابق نہیں ہوتا۔۔۔ کیونکہ آپ کے منشا کچھ ہوتی ہی نہیں۔۔۔ فقط ربّ کی منشا ہوتی ہے۔۔۔ اور راضی بہ رضا ہونا ہوتا ہے۔۔۔ اجل گرفتہ قلم یہ سب انڈیلتے لڑکھڑا رہا ہے۔۔۔ مگر یہ سچ ہے، اور صرف یہی سچ ہے کہ جو اس کے بعد بھی کان نہیں دھرتا، وہ برباد ہو کر رہ جاتا ہے۔۔۔ بالکل برباد۔۔۔ اُجڑ۔۔۔!

سارا عالم گوش بر آواز ہے
آج کن ہاتھوں میں دل کا ساز ہے

تُو جہاں ہے زمزمہ پرداز ہے
دل جہاں ہے گوش بر آواز ہے

بعدہُ۔۔۔ اپنے کیے پر ندامت ہوئی۔۔۔ گناہوں نے کبھی دامن نہیں چھوڑا۔۔۔ بلکہ گزرتے وقت کے ساتھ مزید گناہ گار ہوتے رہے۔۔۔ مگر پانچواں کلمہ ڈھارس بندھاتا رہا۔۔۔ اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کا کہا نظروں سے گزرا:

كُلُّ بَنِي آدَمَ خَطَّاءٌ, وَخَيْرُ الْخَطَّائِينَ التَّوَّابُونَ
(أَخْرَجَهُ التِّرْمِذِيُّ, وَابْنُ مَاجَهْ, وَسَنَدُهُ قَوِيٌّ.)
(۱۹۳۶)

''ہر ابنِ آدم گناہ گار ہے؛ اور بہترین گناہ گار وہ ہے، جو توبہ کر لے۔۔۔!''

یہ پڑھا تو دل بے اختیار وہی شعر پکار اُٹھا، جس کا ذکر ابنِ کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت سے کیا تھا۔۔۔ یہ بات اپنے آپ میں ہی کتنی حسین محسوس ہوتی ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دہنِ مبارک پر یہ شعر اکثر جاری ہوتا تھا:

اِنْ تَغْفِرِ اللّٰهُمَّ تَغْفِرْ جَمًّا
وَ اَيُّ عَبْدٍ لَكَ مَا اَلَمَّا

کہ ربّا، اگر تُو مغفرت فرماتا ہے تو پوری طرح ہی معاف کر دے۔۔۔ وگرنہ تیرا کونسا بندہ گناہوں سے مُبرّا ہے۔۔۔؟

اور پھر، کہنے والے نے کہا۔۔۔ جیسا کہ کہنے کا حق تھا۔۔۔ اور کیا خُوب کہنے کا حق تھا۔۔۔ حکم ہوا:

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ (۱)
مَلِكِ النَّاسِ (۲) اِلٰهِ النَّاسِ (۳)

''کہو! میں پناہ مانگتا ہوں؛ انسانوں کے ربّ، انسانوں کے بادشاہ، انسانوں کے معبود کی۔۔۔!''

چُھپ گئے وہ سازِ ہستی چھیڑ کر
اب تو بس آواز ہی آواز ہے

اَللّٰهُ اَكْبَرُ كَبِيْراً، وَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ كَثِيْراً، وَ سُبْحَانَ اللّٰهِ بُكْرَةً وَ اَصِيْلًا ۔

(اب ہم ماما سے پٹنے کی تیاری کرتے ہیں۔۔۔!)

حافظ مظفر محسن

نئے دور کی چالبازیاں

دنیا میں سب زیادہ جو لفظ استعمال ہوتا ہے وہ ہے ''سوری'' حالانکہ یہ لفظ محاورۃً استعمال ہوتا ہے۔ عملی طور پر نہ کوئی کسی سے ''سوری'' کرتا ہے نہ ہی آج کے دور میں کوئی کسی کو معاف کرنے کی پوزیشن میں ہے کسی کا دل جلا دو۔۔۔ کسی کو رُلا دو۔۔۔ ''سوری'' کرلو اور بس۔۔۔ بوسیدہ۔۔۔ زہریلی دوائیاں مریضوں کو کھلا دو اور اُن کو موت کے منہ میں پہنچا دو اور پھر ''سوری'' کرلو، بات ختم۔۔۔ یہی نہیں گدھے کا گوشت کھلا دو، کیمیکل ملا دودھ پلا دو، سوری ویری سوری۔۔۔!

استاد کمر کمانی کہتا ہے کہ ''سوری'' سے بھی زیادہ جو لفظ دنیا میں مُستعمل ہے وہ ہے ''حرامی'' لیکن یہ لفظ زیادہ تر انگلش بولنے والے بوزن "BASTARD" بولتے ہیں۔ اوسطاً ہر انگریز نے دوسرے انگریز کو زندگی میں ایک بار ضرور ''حرامی'' کہا ہوگا اور سنا ہوگا۔ سنا ہے انگریز یہ لفظ سن کر چپ رہتے ہیں۔ بس جواب میں ہماری معروف اداکارہ ''میرا'' کی طرح آہستہ سے کہہ ڈالتے ہیں ''سیم ٹو یُو'' Same to You۔۔۔ یہاں اُن کی سیم ٹو یو سے مراد۔۔۔ مثبت۔۔۔ منفی تاثر۔۔۔ ہم اس کام میں مداخلت نہیں کر سکتے۔۔۔ یعنی خوشی کا اظہار کرتے ہیں یا دکھ کا یہ ابھی تک ایسا معمہ ہے جو حل نہیں سکا۔ میرا بھی اُنھیں Bastard کہنے کو دل چاہتا ہے جنھوں نے ہمیں گدھے وغیرہ۔۔۔ وغیرہ کا گوشت کھلا ڈالا اور سوری بھی نہیں کیا۔۔۔ ویسے جہاں ضمیر مردہ ہو چکا ہو وہاں Bastard کہہ لیں، ''حرامی'' کہہ لیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

کیا گالی اپنے اصل معنوں میں استعمال ہوتی ہے یا محاورۃً، اس بحث کا صدیوں سے کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ سنا ہے انسان گالی اُس وقت نکالتا ہے جب اُس کے پاس دلیل ختم ہو جائے یا وہ دلیل نہ دینے کی پوزیشن میں ہو یا پھر ''موڈ'' میں ہو اور اس کیفیت میں کچھ بھی کہا جا سکتا ہے، یعنی کہہ دے ہاں کھلایا ہے گدھے کا گوشت۔۔۔ کرلو جو کرنا!

وہ پرانا لطیفہ تو آپ نے سن رکھا ہوگا۔۔۔ جی ہاں۔۔۔ آپ نے صحیح پہچانا۔۔۔ وہی طوطے والا۔۔۔ جو گزرتے ہوئے ''ٹام'' کو روزانہ ''حرامی'' کہہ کر چھیڑتا اور جب ''ٹام'' سڑک سے پتھر اٹھا کے مارنے لگتا تو وہ ''حرامی، حرامی'' کہتا اُڑ جاتا۔ ''ٹام'' نے جب مالک سے شکایت کی تو اُس نے طوطے کو بہت برا بھلا کہا۔ اگلے دن جب ''ٹام'' گزرا تو طوطا چپ رہا۔۔۔ دس قدم جا کے ''ٹام'' نے واپس مڑ کے دیکھا تو طوطا مسکرا رہا تھا۔۔۔ ''ٹام'' نے پھر پتھر اٹھا کے طوطے کو مارا کیونکہ وہ سمجھ چکا تھا کہ درحقیقت طوطا کیا کہہ چکا ہے۔ ایسے طوطوں سے اُن لوگوں کا پالا پڑتا ہے جو چھوٹی چھوٹی بات سے چڑتے ہیں، ہائی بلڈ پریشر کے اس دور میں ایسے ''مریضوں'' کی تعداد میں کہیں زیادہ اضافہ ہو چکا ہے۔۔۔ یقین

نہ آئے تو شیشہ دیکھ لیں۔

ویسے ہر رنگ و نسل کی روایات کی طرح ہر زبان والا اپنی زبان کی لاج رکھتا ہے اور فخر سے خوشی محسوس کرتے ہوئے گالی دینے کے لیے اپنی مادری زبان ہی استعمال کرنا پسند کرتا ہے۔ عرب دنیا میں تیس پینتیس سال پہلے جانے والے پنجابی عرب بچوں کو پنجابی گالیاں یہ سوچ کر سکھاتے کہ یہ عرب آپس میں لڑتے ہوئے پنجابی گالیوں کا آزادانہ استعمال کریں گے اور فلاح پائیں گے یا گالی وہ دیں گے مزہ ہم پائیں گے اور پھر آپ کو پتہ ہی ہے ''چل چھیاں چھیاں چھیاں چھیاں۔۔۔ چل چھیاں چھیاں'' لیکن اُن پاکستانیوں کو دکھ اُس وقت ہوا جب اُن عرب بچوں نے وہ ''گالیاں'' الٹا اُن پاکستانیوں پر ہی استعمال کرنا شروع کر ڈالیں جنہوں نے وہ گالیاں سکھائی تھیں۔ یہاں وہ تاریخی محاورہ فٹ بیٹھتا ہے۔۔۔ لینے کے دینے پڑ گئے۔۔۔اور پاکستانیوں نے ڈر کے کہا ''میاں اپنی اپنی لڑائیاں لڑو، ہمیں بیچ میں مت ڈالو۔''

انسان گالی کیوں دیتا ہے؟ جی آپ نے ٹھیک فرمایا یہ اُن انگریزوں سے پوچھنا چاہیے جو ''حرامی'' کہتے نہیں تھکتے ''حرامی'' سنتے نہیں تھکتے۔۔۔ میری مراد پھر وہی یعنی "BASTARD" ہے۔ ویسے کسی مصروف چینل کی میزبان کو چاہیے کہ وہ اہم ترین مسئلہ پر روشنی ڈالنے کے لیے دو گھنٹے کا لائیو "Live" پروگرام کر ڈالے، بہتر ہے گدھے کا گوشت کھلانے والوں کو سامنے کھڑا کیا جائے اور عوام کو ''فری ہینڈ'' دے کر حساب بے باک کرنے کا موقع ملے۔

استاد کمر کمانی فرماتا ہے کہ گالی صرف وہی نہیں جو پنجابی یا پشتو میں دی جائے یا لی جائے، گالی تو یہ بھی ہے کہ آپ کسی دشمن کو کتا نہ کہیں ''میر جعفر'' کہہ دیں ''میر صادق'' کہہ دیں یا آپ۔۔۔ کہہ دیں (آپ سمجھ گئے ہیں ناں) مقصد تو انسان کو ''چوٹ'' لگانا ہے ناں۔۔۔ پسینو پسین کرنا ہے، وہ چوٹ پنجابی/ پشتو میں دی گئی گالی سے بھی لگ سکتی ہے اور ''میر جعفر، میر صادق'' کہہ ڈالنے سے بھی۔۔۔ دوسری برائیوں کی طرح کچھ اور ایسی ہی برائیاں بھی ہمارے ہاں بڑی تیزی سے سرایت کر چکی ہیں۔

میں اکثر غور کرتا ہوں کہ کیا ہم (اگر سر پر آن پڑے) بغیر گالی نکالے لڑائی مکمل کر سکتے ہیں یا کیا دنگا فساد یا لڑائی بغیر گالیوں کے پایہ تکمیل تک پہنچ سکتی ہے؟ دل نہیں مانتا کیونکہ جب بھی ہم نے لڑائی ہوتے دیکھی ہے، اندازہ ہوا کہ عام گفتگو جب گالیوں میں منتقل ہوتی ہے تو پھر گندگی سے ہٹ کر لفنگی میں چلی جاتی ہے اور معاملہ گلی سے محلے میں اور محلے سے تھانے منتقل ہو جاتا ہے۔۔۔ وہاں کام گیا تو سمجھو سب گئے کام سے۔۔۔ وہاں تو کچھ ''ایسے'' بھی بیٹھے ہوتے ہیں جنہوں نے گالیاں نکالنے میں پی۔ایچ۔ڈی کی ہوتی ہے۔

فہیم انور چغتائی نے اس ''دنیا کے سب سے اہم ترین معاملہ'' پر گفتگو کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ گالی کو بہت زیادہ اہمیت دینے کی ضرورت نہیں، ''گالی'' کے اندرونی معنی دینے والا جانتا ہے یا لینے والا ایک بندہ بیک وقت بہت سے لوگوں کو گالیاں دے سکتا ہے۔ آجکل سب کو گالیاں انفرادی نہیں اجتماعی طور پر دی جا رہی ہیں نہ یقین آئے تو جب ساڑھے آٹھ بجے لوڈ شیڈنگ ہو تو اپنے کانوں سے سن لیں جو کچھ لوگ بے چاری ''واپڈا'' کی شان میں کہتے ہیں۔ جب بیچ دوپہر ٹرین کا انجن فیل ہو جائے تو کسی جنگل میں ''ریلوے'' والے بھی گالیاں سمیٹ لیتے ہیں اور ''پولیس'' توبہ توبہ بہتر ہے آپ مجھ سے اس وقت زیادہ ''فری'' نہ ہوں ''پولیس'' جانے یا عوام جانیں۔ ابھی تو ہم پاکستان کی پارلیمانی تاریخ کی طرف نہیں جا رہے، وہاں تو کئی کئی بار محض گالی کی وجہ سے کارروائیاں حذف کرنا پڑیں۔ پتہ چلتا ہے کہ عورت مرد اکثریت پارلیمنٹ میں من مرضی کی گالی بول سکتے ہیں۔۔۔ بیان کر کے داد سمیٹ سکتے ہیں۔۔۔ بس مشکل یہ ہے کہ اُس فری سٹائل گفتگو کی ریکارڈنگ عوام کو نہیں سنوائی جا سکتی۔

پہلی گالی کس نے کس کو دی، کب دی اور کیوں دی، ضرورت کیوں محسوس ہوئی۔۔۔ یہ تاریخ میں کوئی نہیں بتا پائے گا۔ ''گوگل'' پر ''سرچ'' کر کے دیکھتا ہوں۔۔۔ اگر کوئی نتیجہ سامنے آیا تو آپ کو بتاؤں گا۔

مسئلہ

ناقدِ فن نے کہا ساری غزل کو سُن کر
گو سخن تیرا ہواؤں میں بکھر جائے گا
وزن اور بحر میں ہو گی نہ کمی بیشی پر
"مسئلہ شعر کا ہے شعر کدھر جائے گا"

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

زورازوری

سوچ لے کچھ، یوں قلم کو مت بھگا
تجھ کو کیا آفت پڑی فوری نہ کہہ
شعر کا الہام ہو تو خوب ہے
گر نہیں ہوتا تو پھر "زوری" نہ کہہ

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

منظر، پس منظر

کینٹین میں احاطے میں زینوں کے آس پاس
پھرتے ہیں لڑکے زہرہ جبینوں کے آس پاس
رونق بڑھاتے ہیں پس منظر کے حسن سے
سیلفی بناتے ہیں وہ حسینوں کے آس پاس

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

سرفراز شاہد کے لئے

تمغۂ حُسن کارکردگی کو
آج اپنے پہ ناز ہوتا ہے
جیت یہ سرفراز ہی کی نہیں
اب مزاح سرفراز ہوتا ہے

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

گیس کی بچت

گیس کا بل زیادہ آیا ہے
بات مانو مری، بنو بے غم
پیٹ میں گیس روز بھرتی ہے
روز چولھا جلاؤ اے بیگم!

تنویر پھول

شاعر اور گلوکار

فرشتے سے بہتر ہے انسان بننا
پڑھا ہم نے بھی پھول! یہ قولِ حالی
ہے شاعر سے بہتر گلوکار بننا
سخنور ہے کمتر تونگر ہے عالی

تنویر پھول

سیاست کا امام

سیاست نام ہے جس کا، عجب نیرنگیاں اس کی
کبھی ملتے گلے ہیں اور کبھی کرتے ہیں وہ دنگے
بناتے ہم کو ہیں اُلو، گرہ کٹ چور کے بھائی
سمجھ لے قوم، وہ سارے ہیں اِک حمام میں ننگے

تنویر پھول

حجامت اور قیامت

حکمراں اپنے جو ہیں، شاید کبھی وہ نائی تھے
ہو رہی ہے قوم کی دیکھو! حجامت بار بار
ہم تو یہ سمجھے تھے کہ اِک دن قیامت آئے گی
ملک میں اپنے مگر آئے قیامت بار بار

تنویر پھول

انسان یا لوٹے

عجب انداز ہے اے پھول! اِن اہلِ سیاست کا
کبھی ان کے قدم لڑھکیں، کبھی ان کی نظر لڑھکے
کسی نے سچ کہا، انساں نہیں ہیں وہ تو لوٹے ہیں
جو ہیں لیڈر ہمارے وہ اِدھر لڑھکے، اُدھر لڑھکے

تنویر پھول

نکتہ چینی

اونٹ سے ہاتھی کہنے لگا
بلبلانا تری بھول ہے
گائے، گھوڑے سے کہنے لگی
ہنہنانا تری بھول ہے

تنویر پھول

پہلی بیوی

مستانی دوسری تھی تو جودھا تھی تیسری
شوہر کوئی بھی پہلی پہ عاشق کہیں ہوا
ممتاز آٹھویں تھی ملا تحفہ تاج کا
پہلی پہ اتنا خرچ ابھی تک نہیں ہوا

احمد علوی

لیڈر اور جیل

جاری کیا بیان یہ لیڈر نے جیل سے
مسرور ہوں میں فکرِ ضمانت نہیں مجھے
دو سو برس سے پیشہ ہے جیبیں تراشنا
کچھ لیڈری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

احمد علوی

نعیمہ

نہ بیوی کا نام مبارک شمیمہ
نہ اللہ اکبر نہ آیت کریمہ
وہ دانوں پہ تسبیح کے پڑھ رہے ہیں
نعیمہ نعیمہ نعیمہ نعیمہ

احمد علوی

لوٹ مار

اک غزل آپ نے چرائی تھی
آپ تو کل ہی جیل سے چھوٹے
نہ ہوئی درج ایک ایف آئی آر
ہم نے کتنے مشاعرے لوٹے

احمد علوی

فرق

فرق بیوی اور پڑوسن میں نہیں کرتا ہوں میں
ایک ہی جیسی کیا کرتا ہوں خدمت دوستو
اپنے بچوں کی ہو ماں یا پھر پڑوسی کی ہو ماں
سب کے قدموں میں ہوا کرتی ہے جنت دوستو

احمد علوی

اُردو

پھیکی لگتی ہے رس بھری مجھ کو
اتنا میٹھا بھرا ہے اردو میں
چٹکیاں چھوڑتی نہیں پیچھا
جب سے ایم اے کیا ہے اُردو میں

احمد علوی

جوڑوں کا درد

میں اُٹھنے بیٹھنے سے بھی لاچار ہوگئی
بیوی یہ بولی جوڑوں میں ہے درد اس قدر
بازار جا کے بیوی کو جوڑے دلا دیے
جوڑوں کا درد ختم ہوا قصہ مختصر

احمد علویؔ

اُداس نسلیں

دلوں کو کھلونا بنا دیتی تھی جو
بتاؤں کہاں وہ تباہی گئی ہے
جوانوں میں پھیلی ہے کتنی اداسی
سُنا ہے شگفتہ بیاہی گئی ہے

عابد محمود عابدؔ

مجرمانہ عزائم

میں عشق بزنس میں خوب نوٹوں سے کھیلتا ہوں
سمجھ رہا ہے زمانہ نقصان کر رہا ہوں
جہیز لوں گا ویاہ کے دن میں اُس سے عابدؔ
ابھی تو اغوا برائے تاوان کر رہا ہوں

عابد محمود عابدؔ

ندیدہ

سارا کھانا کھا گیا ہے
مرغی خانہ کھا گیا ہے
قلفی کھا کر بعد میں وہ
اُس کا کانا کھا گیا ہے

عابد محمود عابدؔ

کمیٹی

ہر خوشی سے کنارا کرتے ہیں
ہر تمنا کو مارا کرتے ہیں
ڈال کر ہم کمیٹیاں عابدؔ
زندگی بھر گزارا کرتے ہیں

عابد محمود عابدؔ

لیڈی ڈراؤنا

اپنی سیلفی بناتی رہتی ہے
فیس بک پر لگاتی رہتی ہے
کتنے نزدیک سے وہ روزانہ
کیمرے کو ڈراتی رہتی ہے

عابد محمود عابدؔ

ڈاکٹر اور ڈاکو

المیہ ہے آجکل کے دور کا یہ بھی جناب
جو دکھائی دے رہا ہے ڈاکٹر، ہے وہ قصاب
رہ گیا ہے ڈاکٹر اور ڈاکو میں بھی فرق کم
لٹ رہے ہیں دن دہاڑے اب یہاں پیر و شباب

انجینئر عتیق الرحمن

فیس بک

خود سے ملنا بھی ہوا ہے ایک خواب
اب نہیں ہیں ہم کہیں بھی دستیاب
فیس بک نے کر لیا ہے بک ہمیں
کھا گئے دھوکا سمجھ کر اک کتاب

انجینئر عتیق الرحمن

پیار ہونا چاہیے

دشمنی نفرت سے رکھیں پیار ہونا چاہیے
اب محبت سے ہمیں سرشار ہونا چاہیے
چاہتے ہیں پھول، خوشبو، تتلیاں سب ہی، مگر
آدمی کو خود گل و گلزار ہونا چاہیے

انجینئر عتیق الرحمن

عالمی دھڑے بندیاں

ہاتھیوں کی جنگ پھر سے ہے شروع
پس رہے ہیں ہر طرف کمزور ہی
جیت کے تمغے سجائیں گے بڑے
اور ہوں گے ہر طرف کمزور ہی

انجینئر عتیق الرحمن

سبزیاں

گوشت دم پخت کا سب کو بھائے مزا
کھا کے دم پخت سبزی بھی دیکھیں ذرا
خوشنما سبزیوں سے بنائیں سلاد
ان میں صحت، غذا ، ذائقہ فائدہ

انجینئر عتیق الرحمن

ارمغانِ ابتسام

چکھئے اب ذائقے میٹھے نمکین کھٹے
اس مجلّے میں سب ہو گئے ہیں اکٹھے
آیئے سب ہی کچھ اب ملے گا یہاں پر
مسکراہٹ، ہنسی، قہقہے اور ٹھٹھے

انجینئر عتیق الرحمن

تساہل

لوگ بارہی تڑپتے رہے شوج آلے کے
پیٹ پکڑے ہوئے دو چار وہیں اٹھ گئے
شور برپا تھا مگر میں بھی نہ آیا باہر
"حضرتِ داغ جہاں بیٹھ گئے بیٹھ گئے"

محمد انس فیضی

یہ اندازِ گفتگو کیا ہے؟

آدمی تو بھلے بھلے سے ہو
ہوش سے کام کیوں نہیں لیتے
او، ابے ،تو ، تری یہ سب کیا ہے؟
"تم مرا نام کیوں نہیں لیتے"

محمد انس فیضی

تنگیِ داماں

ایسے کمرے میں بھلا رات گزاروں کیسے
اس کو چھوتا ہوں اِدھر ہاتھ اُدھر لگتا ہے
اب شبِ وصل مناؤں تو مناؤں کیسے
"پاؤں پھیلاؤں تو دیوار میں سر لگتا ہے"

محمد انس فیضی

اُستاد کی غزل

استاد ہی کرے پسِ پردہ شاعری
سمو بھی اب تو گاتا ہے سمساد کی غزل
مجھ پر بھی ہو فدا کوئی استادِ شاعری
میں بھی پڑھوں گا دوستوں استاد کی غزل

محمد انس فیضی

دھم

ہر کوئی مسکرائے سن سن کے بات میری
دنیا کو گدگداتا بس اب ہو کام میرا
جب جب حسین چہرے غمگین ہو جہاں میں
"میں دھم سے آکے بولوں حضرت سلام میرا"

محمد انس فیضی

اُف وہ مسیحائی

اس نے اس بار کہیں اور چھوا تھا مجھ کو
اک نئے ڈھنگ سے قاتل نے مسیحائی کی
کیسے کہہ دوں کہ کہاں ہاتھ رکھا تھا اس نے
"بات تو سچ ہے مگر بات ہے رسوائی کی"

محمد انس فیضی

مائی

کتنا برا وہ شخص ہے جس نے اسے مائی کہا
اس پہ ستم یہ کردیا چھوٹی کو بھی تائی کہا
سن کر مری یہ بات وہ کتنی ہے راضی ہوگئی
جب یہ بتایا اس نے تو انگلش میں ہے مائی کہا

ریاض احمد قادری

دھاندلی

چیمپئن شپ جیتتی ہی تھی اسے
پاک کرکٹ ٹیم جولانی پہ تھی
ہاں مگر ہارا ہے بھارت کس طرح
دھاندلی ہے دھاندلی ہے دھاندلی

نوید ظفر کیانی

آج کا معجزہ

چمچہ گیری نہ جی حضوری ہے
تو مرے واسطے ضروری ہے
صاف اک معجزہ ہوا یہ تو
گیس چولھے میں آج پوری ہے

نوید صدیقی

نثری نظم

اس ناقد کے لہجے سے
فتویٰ بھی جھلکتا ہے
نثری نظمیں چکھنے پر
روزہ ٹوٹ بھی سکتا ہے

ڈاکٹر عزیز فیصل

ہیپی فادر ڈے

اپنے خونی رشتے داروں کے ہاتھوں
ہیں مضروب یہاں پر کتنے دل والے
جس کی شادی ابے نے رکوائی ہو
ہیپی فادر ڈے وہ کیسے کہہ ڈالے

ڈاکٹر عزیز فیصل

ندیدہ

اس نے بوفے میں ایک اک کرکے
ہر اچھوتے طعام کو چھوا ہے
اسی افطار پارٹی کے بعد
اس کو معدے کا ہیمبرج ہوا ہے

ڈاکٹر عزیز فیصل

اقبال حسن آزاد

انشائیہ کیا ہے؟

اِنسان کی زندگی روزِ اول سے ہی مصائب کا شکار رہی ہے۔ حضرت آدمؑ اور حضرت حواؑ کو جس لمحہ جنت سے نکالا گیا' اسی وقت سے انسان کی مشکلوں اور مصیبتوں کا آغاز ہو گیا۔ اس دنیا میں رہنے اور بسنے کے لیے اسے دن رات مشقت کرنی پڑی۔ آفاقی آفات کا مقابلہ کرنا پڑا' جنگلی درندوں سے اس کا سامنا ہوا' بھوک اور پیاس مٹانے کے لیے اس نے اپنا خون پسینہ ایک کیا اور اس طرح انسان کی زندگی ایک تکلیف دہ سنجیدگی سے عبارت ہو کر رہ گئی۔ لیکن قدرت نے اسے ایک ایسی حس عطا کی ہے جس کے بل بوتے پر اس نے ہر پریشانی کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور وہ حس ہے حس مزاح۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر انسان کے پاس یہ حس مزاح نہ ہوتی تو اس کی بقاء بہت مشکل تھی۔ دن بھر کا تھکا ہارا شخص جب کسی بات پر مسکرا اُٹھتا ہے تو اس کی ساری تھکن آنِ واحد میں ختم ہو جاتی ہے۔ ذہنی کشمکش کے شکار کسی شخص کو اگر کوئی روح پرور لطیفہ سننے کو مل جائے تو چند لمحوں کے لیے ہی سہی' وہ اس ذہنی کشمکش سے آزاد ہو جاتا ہے اور یہیں پر ہمیں مزاح کی اہمیت کا احساس ہوتا ہے۔

ہنسی نہ صرف لوگوں کو ایک دوسرے کے ساتھ مل بیٹھنے کی ترغیب دیتی ہے بلکہ ہر اس فرد کو اپنا نشانہ بناتی ہے جو سوسائٹی کے مروجہ قواعد و ضوابط سے انحراف کرتا ہے۔ یہ ہر اس فرد کا مذاق اڑاتی ہے جو سوسائٹی کی سیدھی لکیر سے ذرا بھی بھٹکے اور اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ پھر سے اس لکیر میں شامل ہو جائے۔ چنانچہ یہ بات ہنسنے والوں کے لیے تو باعث انبساط ہوتی ہے لیکن اس شخص کو ندامت اور شرمندگی سے دوچار کر دیتی ہے جس کے خلاف یہ عمل میں آئے۔ بہر حال یہ طے ہے کہ ہنسی ایک ایسا ہتھیار ہے جس کے ذریعہ سوسائٹی اس فرد سے انتقام لیتی ہے جو اس کے ضابطۂ حیات سے بچ نکلنے کی کوشش کرتا ہے۔ سماجی لحاظ سے ہنسی کا یہ پہلو اس لیے زیادہ اہم ہے کہ اس کی بدولت سوسائٹی بیرونی مضر اثرات سے محفوظ رہتی ہے۔ اس کے علاوہ ہنسی ان تمام اندرونی نقائص کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے جو مضحکہ خیز صورت اختیار کر چکے ہیں۔

عربی کا مشہور مقولہ ہے "الملح فی الکلام کالملح فی الطعام" یعنی کلام میں ظرافت کو وہی مرتبہ حاصل ہے جو کھانے میں نمک کو۔ کسی زبان کی لطافت اور کسی قوم کی ذہنی پختگی کا اندازہ کرنے کے لیے اس زبان کی ادبی ظرافت اور اس قوم کی حس مزاح ہی سب سے عمدہ معیار ہے اور کسی بھی زبان میں ظرافت اسی وقت نمودار ہوتی ہے جب اس کے ادب کا مواد پختہ ہو کر اپنے اظہار کے لیے ایک معیاری لطافت حاصل کر لیتا ہے۔ اس اعتبار سے اردو زبان دنیا کی پختہ تر زبانوں میں شامل ہو چکی ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انشائیہ کیا ہے اور اس میں طنز و

خصوصیت باتوں کی بے ترتیبی ہے۔غیر سالمیت اور انتشار ہی اس تحریر کی کشش اور کرامت ہے جیسے تاریک شب میں آسمان پر بکھرے ہوئے تارے یا رخ روشن پر زلف پریشاں کی دل پذیری۔"

عبدالماجد دریابادی کے الفاظ میں:

"انشائیہ کی امتیازی خصوصیت حسن انشاء ہے۔یہ اس کے نام سے ظاہر ہے۔انشائیہ وہ ہے جس میں بجائے مغزو مضمون کے اصل توجہ حسن عبارت پر ہو۔"

ڈاکٹر سید احتشام حسین فرماتے ہیں:

"انشائیہ کا اصل مقصد معلومات فراہم کرنا نہیں بلکہ محض انشاء پردازی کا زور دکھانا اور بعض علمی اور تہذیبی موضوعات کی طرف ذہن کو منتقل کر کے چھوڑ دینا ہوتا ہے۔"

اختر اورینوی انشائیہ کے متعلق رقم طراز ہیں:

"انشائیے دماغ کی آزاد ترنگ ہوتے ہیں ۔مطلب یہ کہ کسی موضوع سخن پر باضابطہ قسم کا مدلل اور منطقی مضمون پیش نہیں کیا جاتا بلکہ بات سے بات نکالی جاتی ہے اور کبھی بے بات کی بات پر بھی بڑے فلسفیانہ انداز میں خامہ فرسائی کی جاتی ہے۔خیالات کو تنہا چھوڑ دیا جاتا ہے۔۔۔۔۔خیالات عزم سفر نہیں ہوتے اور نہ منزلیں مارتے چلے جاتے ہیں تا کہ ایک خاص منزل مقصود تک پہنچیں بلکہ انشائیوں میں خیالات کی گلگشت ہوتی ہے۔"

عبادت بریلوی کا خیال ہے کہ:

"انشائیہ کا موضوع عام طور پر علمی اور تحقیقی نہیں ہوتا۔معلومات فراہم کرنا اس کا مقصد نہیں۔ایک داخلی آہنگ اس میں ملتا ہے جس کی حدیں غنائیت سے جا ملتی ہیں۔"

ڈاکٹر وزیر آغا کہتے ہیں:

"تنقید یا تفسیر کا خالق اس افسر کی طرح ہے جو چست اور تنگ سا لباس زیب تن کیے دفتری قواعد و ضوابط کے تحت اپنی کرسی پر بیٹھا احتساب اور تجزیے کے جملہ مراحل سے گزرتا ہے اور انشائیہ کا خالق اس شخص کی طرح ہے جو دفتر سے چھٹی کے بعد اپنے گھر پہنچتا ہے۔چست اور تنگ سا لباس اتار کر ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہن لیتا ہے اور ایک آرام دہ موڑھے پر نیم دراز ہو کر حقہ کی نے ہاتھ میں لے کر انتہائی بشاشت اور مسرت سے اپنے احباب سے مصروف گفتگو ہو جاتا ہے۔انشائیہ کی صنف اسی شگفتہ موڈ کی پیداوار ہے۔"

انگریزی نقاد جانسن Light Essay کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"It is a loose silly of mind"

یعنی Light Essay ذہن کی ایک ترنگ ہے۔یہی خوبی انشائیہ میں بھی پائی جاتی ہے۔۔لفظ ترنگ انشائیہ کی روح کی طرف اشارہ کرتا ہے یعنی وہ خاص وصف جس میں تیزی اور جولانی ہے مگر حدت و سوز نہیں، انتشار ہے مگر بکواس نہیں۔یہ وہ وصف ہے جو دل کے ساتھ دماغ کو بھی متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

انشائیہ نگار کو مزاح نگاری سے موسوم کیا جاتا ہے لیکن انشائیہ نگار کو مزاح نگار کہنا بڑی ناانصافی ہوگی۔مزاح نگاری، ہجو نگاری یا طنز نگاری انشائیہ کے مختلف روپ نہیں بلکہ قلم کار کی مختلف ادائیں ہیں۔تحریر کا اپنے موضوع اور اسلوب کے لحاظ سے کوئی خاص شکل اختیار کر لینا اور بات ہے اور اس میں کسی خاص رنگ کا پایا جانا اور بات ہے۔مزاح نگاری ایک وصف ہے صنف نہیں۔یہ قلم کار کی فطرت یا طبیعت کی ایک خصوصیت ہے۔یہ خصوصیت نثری تحریروں میں بھی پیش کی جا سکتی ہے اور شعری تحریروں میں بھی۔مزاح انشائیہ کا جوہر خاص ہے۔انشائیہ میں ہمیں رونے رلانے کے مواقع نہیں ملتے، ہنسنے ہنسانے کے مواقع ملتے ہیں۔انشائیہ نگار تیر انداز ہوتا ہے، گفتار کا غازی ہوتا ہے، چرب زبان ہوتا ہے۔اس کی باتیں ہمارے لیے ناگوار

خاطر بھی ہوسکتی ہیں مگر ہم انھیں برداشت کرنے پر مجبور ہیں۔

انشائیہ نگار کسی بات کا پابند نہیں ہوتا۔ چلتی پھرتی زندگی کی ہر بات' ہر ادا' ہر کیفیت اس کی زد میں آسکتی ہے۔ انشائیہ نگار ہمیں آسودگی بخش کر ہمیں شگفتہ کرتا ہے۔ وہ اپنی خوش گفتاری سے لوگوں کو مسحور کر دیتا ہے۔ غیر سنجیدہ باتوں کو سنجیدہ' معمولی کو غیر معمولی بنا لینا اس کی نیرنگیء نظر اور جنبش قلم کا کرشمہ ہے۔ وہ پارلیامنٹ کو ارہر کا کھیت اور کتوں کی سمع خراشی کو غزل بنا سکتا ہے۔ تل کو تاڑ اور رائی کو پہاڑ بنا کر پیش کرنا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔

یوں تو مزاح کی کئی شکلیں ہیں مثلاً مذاق' بذلہ سنجی' مضحک' چہل' چلبلا پن' دل لگی' ٹھٹھا' ٹھٹھول' مسخرا پن' لطیفہ' چٹکلہ وغیرہ۔ لیکن انشائیہ میں عام طور پر طنز وظرافت کا استعمال ہوتا ہے۔ یہ انشائیہ کے دو رنگ ہیں۔ ایک کامیاب انشائیہ نگار دونوں رنگوں کو ظاہر کرتا ہے۔ ظرافت کا رنگ ہلکا ہوتا ہے جبکہ طنز شوخ وشنگ رنگ بکھیرتا ہے۔ ظریف کے ہاتھوں میں ایک مہین سوئی ہوتی ہے جسے وہ ہلکے ہلکے چبھوتا ہے۔ اس سے کوئی خاص تکلیف نہیں ہوتی بلکہ ایک میٹھا میٹھا درد ہوتا ہے جبکہ طنز نگار کے ہاتھ میں ننگی تلوار ہوتی ہے جس سے وہ کشتوں کے پشتے لگا دیتا ہے۔ ظرافت کو ہم خوش مذاقی بھی کہہ سکتے ہیں۔ ظریف عموماً چٹکلے سناتا ہے۔ اس سے کسی کی دل شکنی نہیں ہوتی' بس ہنسی ہنسی میں چند پر لطف باتیں کہہ دی جاتی ہیں۔ اس میں گہرائی اور گیرائی نہیں ہوتی لہٰذا اس کا اثر بھی دیرپا نہیں ہوتا جبکہ طنز ایک طرح کا عمل جراحی ہے۔ اس کا مقصد زخم کو چیر کر سڑے ہوئے مواد کو باہر نکالنا ہوتا ہے اس میں تکلیف تو ہوتی ہے مگر جب زخم مندمل ہو جاتا ہے تو آرام ملتا ہے۔ اور یہ نہ صرف فرد کے لیے بلکہ سماج کے لیے بھی سودمند ثابت ہوتا ہے۔ اس بات کو ہم اس طرح بھی کہہ سکتے ہیں کہ انشائیہ نگار اگر سماج کی بیڈھنگی' انمل اور بے جوڑ چیزوں کو ایک تماشائی کی طرح دور سے دیکھتا اور دکھاتا ہوا گزر جاتا ہے تو اس کے انشائیوں میں ظرافت کی جھلک ہوگی اور اگر وہ بدصورتی اور ناانصافی کے خلاف احتجاج کرتا ہے تو اس کے یہاں طنز کی دھار کی اور زہرناکی ہوگی۔ یہ بات انشائیہ نگار کے ذہنی میلان اور افتادِ طبع پر ہے کہ اس کے انشائیوں میں مشاہدہ حق کی گفتگو ہوگی یا پردہ مجاز کی باتیں۔ ظرافت سے ہر شخص محظوظ ہوسکتا ہے لیکن طنز گھٹیا مذاق کے لوگوں کے دلوں پر اثر نہیں کرسکتا۔ اس کو سمجھنے کے لیے بالغ ذہن' نفیس طبع اور شائستہ مزاج ہونا ضروری ہے۔ ایک اچھا انشائیہ نگار طنز وظرافت دونوں کو ہوشیاری کے ساتھ برتتا ہے۔ ڈاکٹر شوکت سبز واری نے طنز کو ظرافت کی روح تصور کرتے ہوئے لکھا ہے:

''طنز ظرافت کی روح ہے۔ کہیں ظرافت ہوتی ہے لیکن طنز نہیں ہوتا۔ یہ مسخرگی اور کھلنڈرا پن ہے۔ ادب میں اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ بقول میریڈتھ یہ ملک اور قوم کے غیر متمدن ہونے کی علامت ہے۔'' (علی گڑھ میگزین' علی گڑھ طنز و ظرافت نمبر شمارہ ۱۹۵۳ء)

مزاح کی چند مثالیں ملاحظہ ہو:

''خوش خوراک تھے اور مزے لے لے کر کھانا کھاتے تھے۔۔۔۔۔۔ مگر مجھ کو ایک حسرت رہ گئی کہ کبھی شریک طعام نہ ہوسکا۔ کہتے بھی جاتے تھے' بھئی کیا مزے کا خربوزہ ہے' کیا مزے کا آم ہے مگر بندۂ خدا نے کبھی یہ نہ کہا کہ بیٹا ذرا چکھ کر تو دیکھو کیسا ہے۔ میں نے بھی تہیہ کر لیا تھا کہ اگر مولوی صاحب جھوٹے منہ بھی شریک ہونے کو کہیں تو سچ مچ شریک ہو جائیں۔ (نذیر احمد کی کہانی از فرحت اللہ بیگ)

''عصر جدید کا ہیرو کلاسیکی ہیرو سے زیادہ حوصلہ مند اور فعال ہوتا ہے۔ اس کی وجہ اس کے مزاج اور ماحول کی ہم رنگی ہے۔ لڑکپن سے پہلے اس میں عاشقی کا مادہ اور جوانی سے پہلے حسینوں پر مرنے کا حوصلہ آجاتا ہے۔'' (ہیرو از سید محمد حسنین)

''اچانک ہم پر یہ راز کھلا کہ جدید شاعری اصل میں داڑھ کے درد کی شاعری ہے جس میں آدمی کا سارا کرب سمٹ آتا ہے اور وہ سورج کو چبا کر کھانے کی منزل میں پہنچ جاتا ہے۔'' (بہرحال از مجتبیٰ حسین)

اپنے زمانے کے مشہور شاعر باقی کا خاکہ جناب مجتبیٰ حسین

نے ان الفاظ میں پیش کیا ہے:

''باآ،،،ہ دنوں چھوٹی بحر کا مصرع بن گئے تھے۔ ہاتھ میں ایک چھڑی آ گئی تھی جو اس مصرع کو وزن سے گرنے نہیں دیتی تھی۔ چھڑی کیا تھی اچھی خاصی ضرورت شعری تھی۔'' (بائی از مجتبیٰ حسین)

دلیپ سنگھ بھی ایک اچھے مزاح نگار ہو گزرے ہیں۔ ان کے انشائیہ نما سفرنامے ''آوارگی کا آشنا'' سے ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

''جمشید مسرور نے نوجوان دلکش خاتون ایوا کی تعریف میں اردو کے دو تین شعر پڑھ دیے۔ شکرانے کے طور پر ایوا نے سیشن کے اختتام پر ان کو ایک بوسہ دیا۔ میں نے بھی موقع غنیمت جان کر کہا کہ میں نے بھی دل ہی دل میں آپ کو بہت داد دی تھی۔ ایوا نے جواب دیا کہ میں نے بھی دل ہی دل میں آپ کو بوسہ دے دیا تھا۔'' (آوارگی کا آشنا از دلیپ سنگھ)

انشائیہ نگار کے لیے موضوع کی کوئی پابندی نہیں۔ وہ چاہے تو قطرے میں دجلہ دکھا دے، کوزے میں سمندر بند کر دے یا سوئی کے ناکے سے اونٹ گزار دے۔ مگر انشائیہ نگار کے لیے یہ ضروری ہے کہ شروع سے آخر تک اس میں دلچسپی برقرار رہے ورنہ وہ ناکام سمجھا جائے گا۔ انشائیہ نگار کے لیے یہ لازم ہے کہ وہ اپنے تجربات واحساسات، خیالات و کیفیات کو اس فنکاری کے ساتھ پیش کرے کہ مسرت کے ساتھ بصیرت تو حاصل ہو لیکن اس کی گفتگو واعظ کا وعظ نہ بن جائے اور اس میں نصیحت کی خشکی نہ آ جائے۔

سید محمد حسنین اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

''انشائیہ کسی عنوان پر قلم کار کی گپ ہے۔ یہ گپ سنی سنائی نہیں ہوتی۔ اس میں دل بیتی اور پرائی بیتی کی دھوپ چھاؤں ہوتی ہے۔ یہ خوش خرامی ذہنی لہروں کی پیداوار ہے جو کبھی کبھی چلتی ہے اور دبے پاؤں آتی ہے۔ اچھا اور کامیاب انشائیہ ذہن کا ایک شرارہ ہوتا ہے جسے ہم ادب کی پھلجھڑی بھی کہہ سکتے ہیں۔ انشائیہ نثر کی غزل ہے جو واردات قلب سے زیادہ محشر خیال کی ترجمانی کرتی ہے۔''

اس سلسلے میں خواجہ حسن نظامی کے انشائیہ ''جھینگر'' کا جنازہ سے ایک اقتباس پیش خدمت ہے:

''خدا بخشے بہت سی خوبیوں کا جانور تھا۔ دنیا کے جھگڑوں سے الگ کونے میں، کسی سوراخ میں، بوریے کے نیچے، آبخورے کے اندر چھپا بیٹھا رہتا تھا۔ نہ بچھو کا سا زہریلا ڈنک، نہ سانپ کا ڈسنے والا پھن، نہ کوے کی سی شریر چونچ، نہ بلبل کی مانند پھولوں سے عشق بازی۔ شام کے وقت عبادت رب کے لیے ایک مسلسل بین بجاتا تھا اور کہتا تھا کہ غافلوں کے لیے صور ہے اور عاقلوں کے لیے جلوہ طور۔'' (جھینگر کا جنازہ از خواجہ حسن نظامی)

اب طنز کی چند مثالیں دیکھیے:

''میرے بستر کی آرائشوں کے مالک بنو۔ میرے پوڈر سے ڈھکے ہوئے رخساروں سے اپنے ہونٹ سفید کر لو۔ میرے عطر میں بسے ہوئے جسم سے اپنا لباس معطر کر لو۔۔۔۔۔۔ ایک شب، دو شب، ہزار شب جتنا روپیہ صرف کر سکو، میرے مہمان رہو۔ پھر جب تھک جاؤ تو گھر جا کر کسی نیک بخت لڑکی کو شریک زندگی بنا لو اور سیدھے حج کرنے چلے جاؤ۔'' (لیلیٰ کے خطوط از قاضی عبدالغفار)

مشتاق احمد یوسفی کا طنزیہ رنگ ملاحظہ فرمائیے:

''بعض تنگ نظر اعتراض کرتے ہیں کہ مسلمان کتوں سے بلا وجہ چڑتے ہیں حالانکہ اس کی ایک نہایت معقول اور منطقی وجہ موجود ہے۔ مسلمان ہمیشہ سے ایک عملی قوم رہے ہیں اور وہ کسی ایسے جانور کو محبت سے نہیں پالتے جسے ذبح کر کے کھا نہ سکیں۔'' (پہلا پتھر از مشتاق احمد یوسفی)

یوسفی کے انشائیوں کے مجموعے ''آب گم'' سے ایک مثال دیکھیے:

''یہ بات آپ نے عجیب بتائی کہ راجستھان میں رانڈ سے مراد خوب صورت عورت ہوتی ہے ۔ماڑواڑی زبان میں سچ مچ کی بیوہ کے لیے بھی کوئی لفظ ہے یا نہیں! یا سبھی خوب صورت نورٌ علیٰ نور بلکہ حورٌ علیٰ حور ہوتی ہیں۔لیکن یہ بھی درست ہے کہ سوسوا سو سال قبل رنڈی سے مراد صرف عورت ہوتی تھی۔جب سے مردوں کی نیتیں خراب ہوئیں اس لفظ کے لچھن بگڑ گئے۔'' (آب گم از مشتاق احمد یوسفی)

اوپر مجتبیٰ حسین کی تحریروں سے ظرافت کی مثال پیش کی گئی تھی۔اب موصوف کا طنزیہ انداز ملاحظہ ہو:

''ادب میں اتنے تجربے کیے گئے کہ ادب لیبارٹری میں تبدیل ہوگیا۔ہر ادیب نے ادب کو ایک نیا موڑ دینا چاہا چنانچہ ہمارا ادب اتنا تڑا مڑا ہوگیا ہے کہ اسے دیکھتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ برسوں بعد کسی گھڑے سے نکالی ہوئی شیروانی کو دیکھ رہا ہوں۔'' (اردو کا آخری قاری از مجتبیٰ حسین)

اردو کے مشہور شاعر مخمور سعیدی کے بارے میں فرماتے ہیں:

''سنا ہے ٹونک میں ان کے گھر پر ہاتھی جھوما کرتے تھے اب ان کے اشعار پر سامعین جھوما کرتے ہیں۔مگر مخمور کو ہاتھی اور سامعین کے فرق کو ضرور ملحوظ رکھنا چاہیے کیونکہ ہاتھی سوچ سمجھ کر جھومتا ہے اور سامعین سوچے سمجھے بغیر جھومتے ہیں۔'' (مخمور سعیدی از مجتبیٰ حسین)

موصوف کا ایک رنگ یہ بھی ہے:

''نیا سال آتا ہے تو یقین مانئے سماج میں کلینڈروں کا ایک سیلاب امڈ آتا ہے۔سگریٹ خریدیئے اور کلینڈر لیجیے پان خریدیئے اور کلینڈر لیجیے اور ہم نے ایسے اصحاب بھی دیکھے ہیں جو اپنا تن ڈھانکنے کے لیے تو کپڑا خریدتے ہیں لیکن اس کے معاوضہ میں کلینڈر ضرور ایسی حسینہ کا منتخب کرتے ہیں جس کے بدن پر دور دور تک کوئی کپڑا نہیں ہوتا بلکہ ہم نے کپڑوں کی دکانوں سے ملنے والے کلینڈروں پر ایسی حسیناؤں کی تصویریں بھی دیکھی ہیں جن کے بدن پر سوائے گھڑی کے کوئی اور لباس نہیں ہوتا۔'' (قطع کلام از مجتبیٰ حسین)

طنز کی چند اور مثالیں ملاحظہ کیجیے:

''حسن بیباک اور عفت گستاخ کی سحر کاریاں نسوانیت کو آخری منازل تک پہنچا دیتی ہیں۔جاہل انسان حیا اور بیبا کی کو متضاد سمجھتا ہے۔اس غلط فہمی کی ذمہ داری محض اس کی بد مذاقی ہے۔'' (عفت نسواں از سجاد علی انصاری)

''بعض نقاد ایسے بھی دیکھے گئے ہیں جیسے گروہ باز کبوتر ہوتے ہیں۔بیٹھے بیٹھے یک بیک چھتری سے اڑے فضا میں ایک آدھ چکر لگائے دو چار گرہیں لگائیں اور پھر چھتری پر لوٹ آئے اور یاد خدا میں مصروف ہو گئے۔کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کو دیکھ کر ہندوستان کی افسانوی بازی گری یاد آ جاتی ہے یعنی رسی فضا میں پھینکی وہ کھڑی ہوگئی۔اس پر چڑھ کر نظروں سے غائب۔تھوڑی دیر بعد پھر آ موجود ہوئے۔'' (آجکل کے نقاد از رشید احمد صدیقی)

''یہاں ایسے مغرب پرست انسان ہیں جو دروازے اور روشن دان بند کر کے اپنی بیویوں کے ساتھ رقص کرتے ہیں۔ایسے سیاست داں ہیں جن کے نزدیک سیاست دانی کی انتہا چرخہ کاتنے میں ہے۔اینگلو انڈین مصنفین کی نظر میں ہندوستان مہاراجوں ہاتھیوں اور شیروں کا ملک ہے حالانکہ اچھی طرح سے دیکھا جائے تو یہ نقالوں غداروں اور کنگالوں

کا وطن ہے۔" (اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے از کنہیالال کپور)

"میرا خیال تھا کہ الیکشن لڑنا شرفا کا کام نہیں لیکن اب خیال آیا کہ شرفا ہی کو الیکشن لڑنا چاہیے ورنہ ڈیموکریسی غنڈہ گردی کا شکار ہو جائے گی۔ اس لیے جونہی میں نے حامی بھری، مجمع میں ایک عجیب احمقانہ طمانیت بھر گئی اور ایک مسٹنڈے سے نوجوان نے جو رام لیلا میں راون کا پارٹ ادا کرتا تھا مجھے پکڑ کر کندھے پر بٹھا لیا اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں رامائن کی سیتا ہوں اور ڈیموکریسی کا راون مجھے اغوا کر کے لیے جا رہا ہے۔" (میں نے الیکشن لڑا از فکر تونسوی)

اپنے اپنے داؤ

محمد عارف
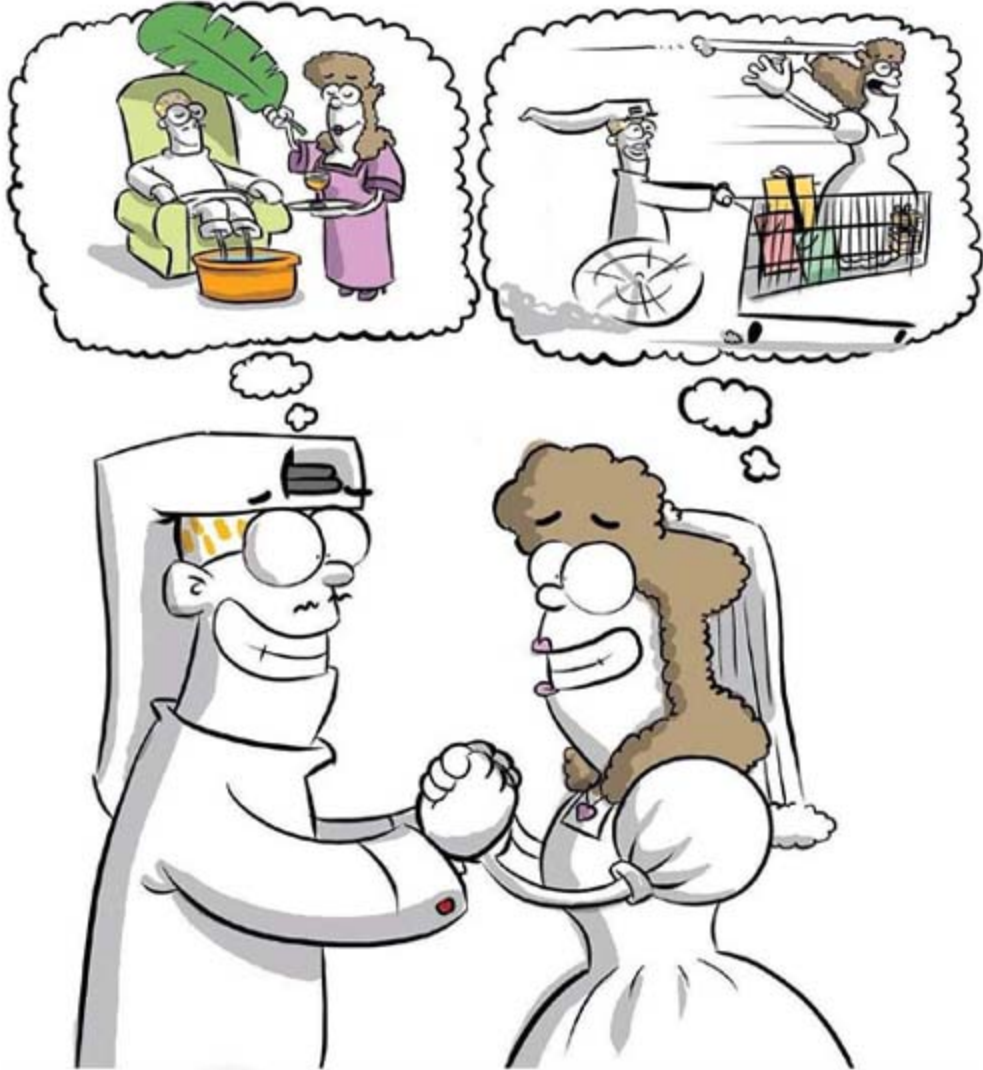
طنز، مزاح اور طنز و مزاح

مصنف کی کتاب "مزاحیہ شاعری کے خدوخال" مطبوعہ "نیشنل بک فاؤنڈیشن" کا ایک ذیلی باب

طنز و مزاح کی مختلف صورتیں ہیں جیسے ظرافت، بذلہ سنجی، نغز، ضلع جگت، فقرے بازی، حاضر جوابی، لطیفہ، رمز، لفظی، ہیرا پھیری، رعایتِ لفظی، ٹھٹھہ، تحریف، مخول، شوخی، نوک جھوک، چٹکلہ، کنایہ، شوخ بیانی، برجستہ گوئی، چشمک، پھبتی، تمسخر، ہزل وغیرہ۔ان میں سے بعض میں طنز اور مزاح الگ الگ اور بعض میں بیک وقت نظر آتا ہے۔ مقالہ ''مزاحیہ غزل کے خدوخال: قیامِ پاکستان تا ۲۰۱۳ء'' کی تکمیل کے دوران طنز و مزاح سے متعلق جو آراء نظر سے گزریں ان میں سے کچھ پیش کی جارہی ہیں۔

☆☆☆

''کامیڈی اور ٹریجڈی کا تعلق دراصل نقل کے موضوع سے ہے۔کامیڈی انسانوں کو نقل میں بدتر دکھائی دیتی ہے اور ٹریجڈی بہتر۔''

ارسطو، بوطیقا، [مترجم] عزیز احمد، کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۲۰۰۱ء، ص ۱۶

''مزاح، ظرافت کی سب سے اعلیٰ اور لطیف قسم ہے، جب ہم مزاح کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو اس لفظ کی بنیاد شگفتگی پر ہوتی ہے جو عام ہنسی سے متعلق ہو مگر اس کی وسعت ہمہ گیر اور عالم گیر ہوتی ہے۔انسانی ضمیر میں مزاح ایک جذبہ ہے جو زندگی کے قبیح بے ڈھنگے پن کا اظہار کرتا ہے جس میں تضحیک کی جھلک ہوتی ہے اور نفرت کا جذبہ عنقا ہوتا ہے۔''

Encyclopedia Britannica Vol1,
Page 883

''مزاح زندگی کی ناہمواریوں کے اُس ہمدردانہ شعور کا نام ہے جس کا فنکارانہ اظہار ہوجائے۔''

Stephen Leacock, Humour and Humanity, London , New Cheap Ed. Purnell and Sons 1930, P11

''ظریفانہ تحریر کو کامیڈی بھی بنایا جا سکتا ہے۔ کامیڈی تحریر کی صورت میں ظرافت ہے جب کہ ظریفانہ تحریر اداکاری کی شکل میں کامیڈی کا روپ اختیار کر لیتی ہے۔''

انور مسعود، شاخِ تبسّم، اسلام آباد ، دوست پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء، ص ۲۸۲

''ظرافت میں صرف خوش طبعی ہو تو وہ مزاح ہے۔''

پنڈت موہن دتاتریہ کیفی: کیفیہ، ص ۱۳۴

''زندگی کی مضحک صورتِ حال کا مشاہدہ کر کے اس کا ٹھٹھہ اُڑانا ''مزاح'' ہے۔ حیات کی وہ ناہمواریاں جو عام انسان کی نظروں سے اوجھل رہتی ہیں ایک دور بین فنکار انھیں نہایت قریب سے دیکھتا ہے اور پھر اس پر اس انداز سے فقرے کستا ہے کہ اس کا مذاق تخلیقی پیرایہ اختیار کر لیتا ہے۔''

انور جمال، پروفیسر، ادبی اصطلاحات، اسلام آباد نیشنل بک فاؤنڈیشن، طبع سوم، ۲۰۱۲ء، ص ۱۷۴

''ہنسی انسانی جبلتوں میں سے ہے، اس جبلت کا اظہار تخلیقی سطح پر ہو تو مزاح جنم لیتا ہے۔''

سلیم اختر، ڈاکٹر، تنقیدی اصطلاحات: توضیحی لغت، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء، ص ۲۴۲

''کسی عمل، خیال، صورتِ حال، واقعے، لفظ یا جملے کے خندہ آور پہلوؤں کو دریافت کرنا، سمجھنا اور ان سے محظوظ ہونا، مزاح ہے۔''

رؤف پاریکھ، ڈاکٹر، اردو نثر میں مزاح نگاری کا سیاسی اور سماجی پس منظر، کراچی، انجمن ترقی اردو، ۱۹۹۶ء، ص ۱۲

''مزاح صرف جملے کس دینے یا کسی کی عیب جوئی پر ہی منحصر نہیں بل کہ حسیات اور شعور کے سمندر کی گہرائیوں میں ڈوب کر موتی نکالنا، ہم آہنگی اور تضاد میں امتیاز کرنا، نامعقولیت کو رد کرنا اور اپنی منطق کو ایسے دل پذیر انداز میں پیش کرنا کہ سامعین قائل ہو جائیں۔''

خواجہ عبدالغفور، طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ، دہلی، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، پہلی بار، ۱۹۸۳، ص ۲۷

''مزاح، جب تک مجلس کا دل خوش کرنے کے لیے کیا جائے، ایک ٹھنڈی ہوا کا جھونکا، ایک سہانی خوش بو کی لپیٹ ہے، جس سے تمام پژمردہ دل باغ باغ ہو جاتے ہیں۔ ایسا مزاح فلاسفر اور حکما بل کہ اولیا و انبیا نے بھی کیا ہے۔ اس سے مرے ہوئے دل زندہ ہو جاتے ہیں اور تھوڑی دیر کے لیے تمام پژمردہ کرنے والے غم غلط ہو جاتے ہیں۔''

الطاف حسین حالی، مولانا، مقالاتِ حالی، نئی دہلی، انجمن ترقیٔ اردو، ۱۹۸۴ء، ص ۱۳۹

''میری نظر میں مزاح کی حیثیت، ایسی فضا میں جہاں سانس لینا ضروری ہے، آکسیجن کی سی ہے۔ یہ دنیا کے لیے کیف و مستی کا سرمایہ ہے اور اگرچہ کیف و نشاط سے علاوہ مزاح کے اور بھی انعامات و عنایات ہیں لیکن اس کا اصل فرض یہیں سے شروع ہوتا ہے۔''

خواجہ عبدالحمید یزدانی، ڈاکٹر، فارسی شاعری میں طنز و مزاح،

نگارشات، لاہور، ۱۹۸۹ء

''ظرافت کی سب سے اعلیٰ قسم مزاح ہے۔ برگساں کا کہنا ہے کہ 'مزاح کی اپیل براہ راست ذہانت سے ہے۔' ہر مزاح قہقہہ پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے مگر ہر قہقہے کے لیے ضروری نہیں کہ وہ مزاح سے پیدا ہو۔۔۔ مزاح کا تعلق ہنسی سے تو ضرور ہے مگر اس کا خاص تعلق ہمدردی سے ہے۔ مزاح ایک بات یا ایک فقرے میں نہیں چھپا ہوا ہوتا بل کہ ایک مکمل بیان میں جس کے مختلف جزویات مضحکہ خیز ضرور ہوتے ہیں مگر اس کا تاثر ہمدردی کا جذبہ طاری کر دیتا ہے۔''

فرقت کاکوروی، غلام احمد، اردو ادب میں طنز و مزاح، لکھنو، سرفراز پریس، ۱۹۵۷ء، ص ۱۶

''جہاں سنجیدگی کی حدیں ختم ہوتی ہیں وہاں سے مزاح کا آغاز ہوتا ہے۔''

انعام الحق جاوید، ڈاکٹر، گلہائے تبسم، اسلام آباد، دوست پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء، ص ۲۵

''مزاح نگاری پلِ صراط پر چلنے کے مترادف ہے، اگر مزاح نگار ایک مخصوص سطح سے نیچے آ جائے تو مبتذل اور ذرا اوپر چلا جائے تو خشک، درمیان میں راہ نکالنا بہت ہی مشکل کام ہے اور یہی معیاری مزاح نگاری ہے۔''

محمد طہٰ خان، پروفیسر، ''مکالمہ'' مشمولہ: گفتگو نما از ڈاکٹر راشد حمید، ص ۱۱۹

''عمدہ مزاح لکھنا تنے ہوئے رسے پر بغیر کسی سہارے کے چلنے کا نام ہے، ایک معمولی سی غلطی مزاح نگار کو پھکڑ پن اور رکاکت کے گہرے کنوئیں میں گرا سکتی ہے۔''

سلیم آغا قزلباش، [رائے] مشمولہ: گستاخی معاف از مظفر بخاری، ۲۲۱

''مضحکہ خیزی ایک قسم کی غلطی یا بدصورتی ہے جو تکلیف دہ نہیں ہوتی۔۔۔ کامیڈی کی تاریخ پردۂ اخفا میں ہے، کیوں کہ اس کی طرف کبھی سنجیدگی سے توجہ نہیں دی گئی۔''

ارسطو، بوطیقا، [مترجم] جمیل جالبی، ڈاکٹر، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، اپریل ۱۹۹۸ء، ص ۳۵

'' Encyclopedia Americana کے مطابق Satire کا لفظ Satura کے لفظ سے نکلا ہے جس کے معنی 'مختلف قسم کے پھلوں سے لدی ہوئی طشتری یا طباق کے ہیں۔' اس انسائیکلو پیڈیا میں Satire یا طنز کو ایسا ادبی اسلوب قرار دیا گیا ہے جس میں کسی فرد، بنی نوع انسان یا مکتبۂ فکر کی کمزوریوں، بُرائیوں اور بداخلاقیوں کو اصلاح کے خیال سے تضحیک اور تحقیر کا نشانہ بنایا جائے۔''

Encyclopedia Americana Vol 24, Page 294

''سطائر (Satire) کا جو مفہوم انگریزی میں ہے اس کی پوری اور صحیح ترجمانی ہمارے یہاں کے کسی ایک لفظ سے تقریباً ناممکن ہے۔ عربی اور فارسی میں اس موقع پر چند الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں مثلاً ہجو و ہجا، ہجو ملیح، تعریض، تنقیص، لعن و طعن، طعن و طنز، استہزاء، مذمت، مضحکات، شطحیات، جد و ہزل وغیرہ۔ ان الفاظ کے دینے سے یہ مقصود نہیں ہے کہ ان میں سے ہر ایک سطائر کا مترادف ہے اکثر ان الفاظ میں سے کوئی ایک لفظ (مناسبتِ موقع کے لحاظ سے) یا الفاظ کی ترکیب استعمال کی جاتی ہے۔۔۔ 'طنزیات' کا مفہوم Satire کے مفہوم سے بڑی حد تک متجانس اور ہم آہنگ ہے۔''

رشید احمد صدیقی، طنزیات و مضحکات، لاہور، آئینۂ ادب، ۱۹۶۶ء، ص ۲۵

''زندگی کی مضحک، قابلِ گرفت اور تنفر انگیز پہلوؤں پر مخالفانہ اور ظریفانہ تنقید اصطلاح میں طنز کہلاتی ہے۔''

ابوالاعجاز حفیظ صدیقی: کشاف تنقیدی اصطلاحات، ص ۱۲۰

''طنز بنیادی طور پر ایک ایسے باشعور، حساس اور درد مند انسان کے ذہنی ردِّعمل کا نتیجہ ہے جس کے ماحول کو ناہمواریوں اور بے اعتدالیوں نے تختۂ مشق بنالیا ہو۔''

وزیر آغا، ڈاکٹر، اردو ادب میں طنز و مزاح، لاہور، مکتبۂ عالیہ، گیارویں بار، ۲۰۰۷ء، ص ۴۹

''تلخی، استہزا، خشونت، نفرت کا تخلیقی اظہار طنز ہے۔ اگرچہ طنز ہنسی سے مشروط ہے لیکن مزاح کی ہنسی میں تفنن ہوتا ہے اور خوش وقتی کے لیے بھی مزاح سے کام لیا جاتا ہے، طنز بغرضِ اصلاح ہوتی ہے۔''

سلیم اختر، ڈاکٹر، تنقیدی اصطلاحات: توضیحی لغت، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء، ص ۱۸۴

''طنز برہمی اور نفرت کا خلاقانہ اظہار ہے۔ اس میں میٹھی نشتریت ہوتی ہے کہ سننے والے کے دل میں ترازو ہو جاتی ہے لیکن وہ آہ نہیں کرتا بلکہ مسکراتا ہے، طنز نگار، ناہمواری کو تبدیل کرنے کا خواہاں ہوتا ہے، لہٰذا نشتر زنی کرتا ہے۔ مطائبات کے عالمی نقادوں کے نزدیک طنز کو مزاح پر یوں فوقیت حاصل ہے کہ مزاح کی نسبت طنز میں ''اثریت'' زیادہ ہوتی ہے۔ مزاح وقتی مسرت دیتا ہے اور طنز مسرت کے ساتھ تغیرِ حالات پر بھی اکساتا ہے۔''

انور جمال، پروفیسر، ادبی اصطلاحات، اسلام آباد نیشنل بک فاؤنڈیشن، طبع سوم، ۲۰۱۲ء، ص ۱۳۱

''حماقتوں، برائیوں، بے ڈھنگے پن، بدتہذیبی اور بداخلاقی کی مذمت، بدمزگی پیدا کیے بغیر اس طرح کرنا کہ ان کے خلاف جذبات بیدار ہوں اور مزاح بھی پیدا ہو، طنز ہے۔''

رؤف پاریکھ، ڈاکٹر، اردو نثر میں مزاح نگاری کا سیاسی اور سماجی پس منظر، کراچی، انجمن ترقی اردو، ۱۹۹۶ء، ص ۱۴

''ہر ظرافت نگار کا کام طنز نہیں ہوتا جب کہ ہر طنز نگار کے لیے ظرافت کی کسی نہ کسی مقدار کا ہونا ضروری ہے ورنہ وہ سیدھی سیدھی تضحیک یا تبلیغ بن سکتی ہے۔''

شمیم احمد: ۲+۲=۵، ص ۳۱

''خالص مزاح اور طنز آمیز مزاح میں فرق ہے، محض طنز تو ظرافت کا حصہ ہی نہیں بن پاتی۔ طنز کی آمیزش سے مزاح با مقصد بن جاتا ہے۔ ظرافت نگار کے لیے ضروری ہے کہ وہ طنز کو مزاح کا لباس پہنائے۔''

انور مسعود، شاخِ تبسّم، اسلام آباد، دوست پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء، ص ۲۸۲

''طنز یا مزاح بے معنی ہنسی کا نام نہیں ہے، یہ گہرے عرفانِ ذات یا معاشرے کے شعور سے پیدا ہوتا ہے۔''

نثار احمد فاروقی، ''اردو ادب میں طنز و مزاح کی روایت''، مشمولہ: طنز و مزاح: تاریخ و تنقید، ص ۱۲۹

''طنز عام ادبی تنقید سے بلند ہے، تنقید کا مقصد ہے کسی ادبی پارے کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانا اور ادب میں اس کی حیثیت کا تعین۔ طنز کا مقصد ہے اصلاح، تنقیدِ استحسان اور طنزِ تحسین۔''

شوکت سبزواری، ڈاکٹر، ''اردو شاعری میں طنز''، مشمولہ: نقوش [طنز و مزاح نمبر]، شمارہ ۷۱، ۷۲، جنوری فروری ۱۹۵۹ء، ص ۸۵

''ہر اچھی ظرافت ایک قسم کی خوش گوار طنز ہوتی ہے اور ہر خوش گوار طنز بجائے خود ایک لطیف ظرافت۔''

بریکنگ نیوز

وزیراعظم نے اپنی برتھ ڈے کی تقریبات ۵ منٹ پہلے ہی شروع کر دیں تھیں، سئیر صحافی اسد کھرل نے ثبوت اکٹھے کر لیے، وزیراعظم صادق آمین نہیں رہے۔

بغدادی نژاد رازی

رشید احمد صدیقی، طنزیات و مضحکات، دہلی، مکتبۂ جامعہ نئی دہلی، ۱۹۷۳ء، ۱۳۰

''طنز و مزاح بیک وقت دو مختلف چیزیں بھی ہیں اور لازم و ملزوم بھی۔ انگریزی ادب میں تو یہ دونوں اپنی اپنی خصوصیات، مزاج اور تاثیر کے اعتبار سے نمایاں طور پر الگ الگ پہچانی جاتی ہیں جب کہ اردو ادب میں ان دونوں میں اتنا گہرا تعلق ہے کہ انھیں جدا کرنا دشوار ہے۔ طنز فن کی ضرورت ہے جب کہ مزاح طنز کا لازمہ۔''

اشفاق احمد ورک، ڈاکٹر، اردو نثر میں طنز و مزاح، لاہور، انتخاب جدید پریس، ۲۰۰۴ء، ص ۲۳

''خالص طنز اور خالص مزاح دو ایسے کیمیائی مفردات کی طرح ہیں جو علیحدہ علیحدہ زیادہ دیر تک نہیں رہ سکتے اور ایک دوسرے میں ضم ہونے کے لیے سدا بے چین رہتے ہیں۔''

شاہد عشقی، مشمولہ: ''مشتاق احمد یوسفی۔ چراغ تلے سے آبِ گم تک''، مرتّب: طارق حبیب، لاہور، الحمد پبلی کیشنز، بارِ اوّل، ۱۹۹۷ء، ص ۱۴۰

''طنز و ظرافت اکثر ساتھ ساتھ استعمال ہوتے ہیں، شاید اس لیے کہ ان دونوں میں فرق نہیں کیا جاتا اور سمجھا جاتا ہے کہ کوئی مضمون طنز پر مکمل اور جامع نہیں ہو سکتا جب تک اس کے ساتھ ظرافت کا ذکر نہ ہو۔ طنز، ظرافت سے بالکل الگ چیز ہے یہ اور بات ہے کہ اس کا ظرافت سے تعلق ہے اور یہ تعلق بہت شدید اور گہرا ہے۔''

شوکت سبز واری، ڈاکٹر، ''اردو شاعری میں طنز''، مشمولہ: نقوش [طنز و مزاح نمبر]، شمارہ ۷۱، ۷۲، جنوری فروری ۱۹۵۹ء، ص ۸۵

''طنز اور مزاح کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے ایک کا مقصد تفننِ طبع ہے اور دوسری کا افراط و تفریط میں توازن اور تناسب پیدا کرنا، مزاح میں زندہ دلی اور رحم کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے جب کہ طنز میں جوش، رنج، غصے اور بے چینی کا عمل دخل ہوتا ہے۔''

اشفاق احمد ورک، ڈاکٹر، اردو نثر میں طنز و مزاح، لاہور، انتخاب جدید پریس، ۲۰۰۴ء، ص ۲۳

''مزاح وہ ہوتا ہے جسے پڑھ کر مزہ آ جائے کہ مزاح کا لفظ شروع ہی 'مزا' سے ہوتا ہے، اور 'مزا' نہ آئے تو مزاح کیسا؟ جہاں تک طنز اور مزاح کے فرق کا تعلق ہے میں سمجھتا ہوں کی مزاح نگار اپنے اوپر ہنستا ہے جب کہ طنز نگار دوسروں پر ہنستا ہے۔''

انعام الحق جاوید، ڈاکٹر، گلہائے تبسم، اسلام آباد، دوست پبلی کیشنز، اشاعتِ اوّل، ۲۰۰۵ء، ص ۲۵

''حقیقت یہ ہے کہ طنز کا وجود مزاح کے بغیر ممکن ہی نہیں ہاں مزاح طنز سے پاک بھی ہو سکتا ہے۔''

احتشام حسین، پروفیسر، تنقید اور عملی تنقید، دہلی، ۱۹۵۲ء، ص ۳۸

''طنز و مزاح کوئی باقاعدہ صنفِ ادب نہیں بل کہ ایک رجحان اور رویے کا نام ہے۔''

اشفاق احمد ورک، ڈاکٹر، اردو نثر میں طنز و مزاح، لاہور، انتخاب جدید پریس، ۲۰۰۴ء، ص ۲۲

مزاحیہ ادب صرف تبسم ہی نہیں غور و فکر کی بھی دعوت دیتا ہے۔

بدقسمتی سے سائنسدانوں نے اب تک وہ پیراشوٹ ایجاد نہیں کیا جو تعریفیں سننے کے بعد خواتین کو باحفاظت زمین پر اتار سکے۔
بغدادی نژاد رازی

۔۔اچھا مزاحیہ ادب، ادب پہلے ہوتا ہے مزاحیہ بعد میں۔"

محمد حسن خان، ڈاکٹر،" کچھ مزاح کے بارے میں"، مشمولہ: شب خون، الہٰ آباد، جولائی ۱۹۶۶ء، ص ۱۵

"احساسِ مزاح اور اس کے مظہر یعنی تبسم، ہنسی اور قہقہہ ہی در اصل ہمیں اس سنجیدہ کائنات میں زندہ رکھنے کے ذمہ دار ہیں اور انھی کے سہارے ہم زندگی سے سمجھوتہ کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔"

وزیر آغا، ڈاکٹر، اردو ادب میں طنز و مزاح، لاہور، مکتبۂ عالیہ، گیارویں بار، ۲۰۰۷ء، ص ۲۶

"خالص ظرافت نگار ہو یا ہجو گو دونوں صناع ہیں، دونوں کے کارنامے تخلیقی ہوتے ہیں۔ ظرافت نگار محض کسی بے آہنگی کا مضحکہ خیز بیان نہیں کرتا وہ اس بے آہنگی کی تخلیق بار دگر کرتا ہے اور اسے دل چسپ سے دل چسپ تر بنا دیتا ہے۔ اس لحاظ سے ظرافت نگار اور کسی دوسرے صناع میں کوئی بنیادی فرق نہیں کہ وہ بھی مشاہدہ سے کام لیتا ہے۔ اس کی آنکھیں دنیا اور زندگی کے وسیع بوقلموں مناظر کو دیکھتی ہیں اور ان میں سے ایسی چیزوں کا انتخاب کر لیتی ہیں جو اس کے مخصوص آرٹ کے لیے موزوں ہوں۔"

کلیم الدّین احمد،" اردو ادب میں طنز و ظرافت"، مشمولہ: نقوش [طنز و مزاح نمبر]، شمارہ ۷۱، ۷۲، جنوری فروری ۱۹۵۹ء، ص ۵۰

"طنز زندگی اور ماحول سے برہمی کا نتیجہ ہے اور اس میں غالب عنصر نشریت کا ہوتا ہے، طنز نگار جس چیز پر ہنستا ہے اس سے نفرت کرتا اور اسے تبدیل کر دینے کا خواہوں ہوتا ہے اس کے برعکس مزاح، زندگی اور ماحول سے اُنس اور مفاہمت کی پیداوار ہے۔ مزاح نگار جس چیز پر ہنستا ہے اس سے محبت کرتا ہے اور اسے اپنے سینے سے چمٹا لینا چاہتا ہے۔ طنز نگار توڑتا ہے اور توڑنے کے دوران ایک فاتحانہ قہقہہ لگاتا ہے۔ چنانچہ طنز میں جذبۂ افتخار کسی نہ کسی صورت میں ضرور موجود ہوتا ہے دوسری طرف مزاح نگار اپنی ہنسی سے ٹوٹے ہوئے تار جوڑتا ہے اور بڑے پیار سے ناہمواریوں کو تھپکنے لگتا ہے۔"

وزیر آغا، ڈاکٹر،" ایک مزاح نگار"، مشمولہ: ادبِ لطیف، لاہور، سال نامہ ۱۹۶۱ء

"اگر ہنسی کا مادہ انسان سے سلب کر لیا جائے، اگر وہ اسباب نیست و نابود ہو جائیں جن کی وجہ سے ہم ہنستے ہیں تو پھر انسان ممکن ہے کہ فرشتہ ہو جائے، لیکن وہ انسان باقی نہ رہے گا۔ غالباً فرشتے ہنستے نہیں اور نہ ہنسنے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ جہاں ہر شے مکمل، موزوں و متناسب ہو وہاں ہنسی کا گزر نہیں ہو سکتا۔ ہنسی عموماً عدم تکمیل، بے ڈھنگے پن کے احساس کا نتیجہ ہے، جسے اس کا احساس نہیں، یعنی جسے ہنسی نہیں آتی اسے ہم انسان شمار نہیں کریں گے۔"

کلیم الدین احمد، پروفیسر،" اردو ادب میں طنز و ظرافت" ،مشمولہ: نقوش [طنز و مزاح نمبر]، شمارہ ۷۱، ۷۲، جنوری فروری ۱۹۵۹ء، ص ۴۹

"اس میں کوئی شک نہیں کہ طنز سماج اور انسان کے رستے ہوئے زخموں کی طرف ہمیں متوجہ کر کے بہت بڑی انسانی خدمت سرانجام دیتی ہے اور دوسری طرف خالص مزاح بھی تو ہماری بجھی ہوئی پھیکی اور بدمزہ زندگیوں کو منور کرتا اور ہمیں مسرت بہم پہنچاتا ہے۔ فی الوقت افادیت کے نقطۂ نظر سے دونوں ہمارے رفیق و غم گسار ہیں اور ہم ایک کو دوسرے پر فوقیت دینے سے قاصر۔"

وزیر آغا، ڈاکٹر، اردو ادب میں طنز و مزاح، لاہور، مکتبہ عالیہ، ۲۰۰۷ء، ص ۴۲، ۴۳

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

بیماری اور ہسپتال کا خیال آتے ہی فوری طور پر ذہن میں ڈاکٹر اور نرس کا تصور اُبھرتا ہے کہ شعبۂ صحت میں ان دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ہسپتالوں میں ڈاکٹر اور نرسوں کی چشمک روزانہ کی بات ہے۔ پھر اس میں جب مریض رقیبِ روسیاہ بن کر درمیان میں آٹپکتا ہے تو یہ رنگین صورتحال کچھ سنگین ہو جاتی ہے ۔ڈاکٹر، نرس اور مریض کی یہ تثلیث بڑی دلچسپ ہے ۔مریض ڈاکٹر کو اور ڈاکٹر مریض کو اپنا رقیب سمجھتا ہے، جب کہ بیچاری نرس اپنی پیشہ وارانہ خدمات بڑی خوبی اور تندہی سے بجالانے میں مصروفِ عمل رہتی ہے۔ ڈاکٹر سے ناراضگی کبھی کبھی نرس کو اس حد تک بھی لے جاتی ہے کہ وہ غصے میں مریض کے ذریعے اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کی کوشش کرتی ہے ۔مثلاً ایک دفعہ ایک نرس مریض سے کہنے لگی کہ جب ڈاکٹر وارڈ میں آئے تو تم اپنی زبان نکال لینا اور اسے نکالے ہی رکھنا۔ مریض حیران ہو کر پوچھنے لگا کہ آخر وہ ایسا کیوں کرے اس پر نرس معصومیت سے بولی ''کیونکہ مجھے وہ ڈاکٹر بالکل پسند نہیں۔۔۔!

مگر اس کے برعکس کبھی یوں بھی ہوتا ہے مریض کے سر اور نرس کی سینڈل میں ذرا سا بھی فاصلہ نہیں رہتا۔منقول ہے کہ کوئی مریض ڈاکٹر صاحب سے کہنے لگا ''جناب آپکی نرس بہت ہی اچھی ہے، اس کا تو ہاتھ لگتے ہی مجھے فوری آرام آ گیا۔'' ڈاکٹر ہنس کے بولا ''ہاں ہاں تھپڑ کی آواز تو میں نے بھی سنی ہے''۔ مریض کا اظہارِ عشق کبھی کبھی جان لیوا

بھی ہوسکتا ہے کہ جس طرح ایک مریض کو خوبصورت نرس نے سہارا دے کر اٹھایا تو وہ کہنے لگا کہ جی چاہتا ہے اسی طرح تمہارے بازوؤں میں رہ کے دم توڑ دوں۔ نرس بولی، ''تمہاری یہ خواہش ابھی پوری بھی ہوسکتی ہے کیونکہ اگلے بیڈ کے پاس کھڑے ڈاکٹر نے یہ بات سن لی ہے، اور وہ میرا منگیتر ہے۔!''

نرسی عاشق

ساری دنیا کے ٹھکرائے ہوئے عاشق کو جب ہسپتال میں پناہ ملتی ہے تو وہ بے اختیار پکار اٹھتا ہے

تو نے جب چھوڑ دیا ساتھ دوا خانے میں
نرس نے تھام لیا ہاتھ دوا خانے میں

اقبال شانہ

مگر بعض عاشق صادق ہسپتال میں بھی آخری دم تک اپنے محبوب کا انتظار کر رہے ہوتے ہیں اور نرس کے التفات انہیں اپنی طرف متوجہ نہیں کرتے۔

میری بالیں سے بندھی ہے غیر نرس
جس کا ہوں بیمار آیا تک نہیں

نوید ظفر کیانی

ہسپتالوں میں ''بیمارِ دل'' اور ''بیمارِ جاں'' دونوں ہی نظر آتے ہیں مگر اسد جعفری کے خیال میں

فقط بیمار ہی آتے نہیں ہیں ہاسپٹل میں
جو صحت مند ہیں وہ بھی رہینِ استفادہ ہیں
یہ فیضانِ نظر ہے یا عیادت کی کرامت ہے
کہ بیماروں سے نرسوں کے ملاقاتی زیادہ ہیں

اسد جعفری

نرس سے اک مریضِ دل نے کہا
میں نہ آتا تمھارے پاس کبھی
کیا کروں پر کہ بیٹھے بیٹھے ہی
''دل میں اک لہر سی اٹھی ہے ابھی''

سیّد ضمیر جعفری

اے نرس مری سمت نہ مردانہ وار دیکھ
گر ہوسکے تو میری نظر کا بخار دیکھ
عینک لگائے بیٹھا ہوں میں بیس سال سے
''تو میرا شوق دیکھ میرا انتظار دیکھ''

ڈاکٹر انعام الحق جاوید

ہسپتالوں میں نرس اور مریض
کتنے باہم قریب ہوتے ہیں
ایسی پُر کیف ساعتوں میں معین
ڈاکٹر ہی رقیب ہوتے ہیں

معین نقوی

لڑکے نے محفل میں پوچھا لڑکی سے
کیا ہم واقف رہے ہیں گئے زمانے میں
لڑکی ہنس کر بولی شائد واقف ہوں
مدت سے میں نرس ہوں پاگل خانے میں

ڈاکٹر سعید اقبال سعدی

اک نرس کے عاشق نے اک دن یہ کہا اس کو
کچھ تو بھی توجہ دے اپنی آرائش پہ
ہر وقت ہی پھرتی ہے تو ''چٹّے'' کپڑوں میں
''اج کالا جوڑا پا'' میری فرمائش پہ

ڈاکٹر سعید اقبال سعدی

دردِ دل، دردِ جگر کیسے رفع ہوتا ہے
مجھ کو معلوم ہے تو اپنا ہٹا لے ٹیکہ
اے حسیں نرس نہ کر چھلنی مرے بازو کو
مری خاطر ذرا ماتھے پہ سجا لے ٹیکہ

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

خرابی ہے ترے دل میں یہ بولا ڈاکٹر مجھ سے
دوا دیتا ہوں لیکن وقت اب آیا دعاؤں کا
میں کیا کرتا وہ دل اک نرس کو دے کر چلا آیا
تھا آیا ہوں اس کو ہی میں نسخہ بھی دواؤں کا

شوکت جمال

آہ کھینچی اور لپٹ کر نرس سے رونے لگا
جب مریضِ عشق کو کڑوی دوا دینے لگے

نذیر شیخ

ہسپتالوں میں اگر بہرِ عیادت جائیں
دیکھ کر نرسوں کو بیمار ہوئے جاتے ہیں

نذیر احمد شیخ

شفا خانے کے بستر پر جناب شیخ کو دیکھو
حسین و دل کش و دل دار نرسوں کے ہیں گھیرے میں

سجاد مرزا

حسین نرس کی خاطر ہی ہاسپٹل سے
ریلیز ہونے کی ساعت کو ٹال رکھا ہے

نسیم سحر

اس نرس کو دیکھا تو بے ساختہ جی چاہا
اے کاش وہ آ جائے بیمار کی باتوں میں

نسیم سحر

نرس آتی تو بڑے پیار سے باتیں کرتے
ڈاکٹر آتا تو بستر پہ کراہے جاتے

طہٰ خان

بہانے نرس سے ملنے تھا آیا
جو پہنچا ڈاکٹر ، بیمار کھسکا

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

غلط فہمیاں

لبوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں محبت تھی
میں سمجھا حال دل اپنا بتانے مجھ کو آئی ہے
مگر جب مرمریں ہاتھوں کو دیکھا تو کھلا مجھ پر
کہ وہ ہے نرس اور ٹیکہ لگانے مجھ کو آئی ہے

ڈاکٹر نفیس الحسن

کل نرس نے جو بات ذرا گول مول کی
ایسا لگا بجی مرے کانوں میں ڈھولکی
کاغذ تھما کے ہاتھ میں دہرائی اس نے بات
کھانی ہے یہ دوا تمہیں کولیسٹرول کی

شوکت جمال

ڈاکٹر آئے نہ آئے یا دوائی نہ ملے
وارڈ میں لیٹا رہوں بس یہ خیال اچھا ہے
نرس کو دیکھ کے ہوتی ہے طبیعت جو بحال
"وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے"

شبنم کارواری

نرس اور مریض

بیوی میاں سے کہنے لگی ہسپتال میں
چہرے پہ اب تو خیر سے سرخی ہے خون کی
نرسیں بھی مطمئن ہیں کہ اب ٹھیک ٹھاک ہو

حاجت تھی واقعی تمہیں نرسی سکون کی

امیر الاسلام ہاشمی

نشتر یہ ہسپتال ہے یا قتل گاہ ہے
نرسیں دکھائی دیتی ہیں تلوار کی طرح
آنکھوں میں جھانکتی ہیں یہ رکھتی ہیں دل پہ ہاتھ
ہم اس لئے بھی لیٹے ہیں بیمار کی طرح

ڈاکٹر نشتر امروہوی

دنیا میں آ کے ہم نے جب آنکھ اپنی کھولی
بعد از اذان ہم سے اک نرس آ کے بولی
جینا اگر ہے تم کو داخل رہو یہیں پر
باہر نہ جانے تم کو لگ جائے کس کی گولی

شوکت جمال

یوں نہ منہ موڑ کے جاؤ کہ میں زندہ ہوں ابھی
زندگی مری بچاؤ کہ میں زندہ ہوں ابھی
اپنے ہاتھوں سے علاج اپنا میں کرسکتا ہوں
نرس لوگوں کو ہٹاؤ کہ میں زندہ ہوں ابھی

اقبال شانہ

محبوبہ نرس

نرس کا حسن بھی کہیں باعثِ شفا ہے تو کہیں باعثِ بیماری:

چارہ گر کے حسین ہاتھوں سے
درد بھی زخم میں ذرا نہ ہوا
جلوہ حُسن نے شفاء دے دی
''درد مِنت کشِ دوا نہ ہوا''

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

کیا پٹاخہ سی نرس آئی ہے
بی پی پہلے ہی میرا ہائی ہے
اس سے زیادہ نہ ویک ہوجاؤں
نرس ہٹاؤ کہ ٹھیک ہوجاؤں

ادریس قریشی

عاشق ڈاکٹر

بولا سرجن اِک آرتھوپیڈک
کانٹا کیا ہے گلاب میں ہڈی
نرس کے ساتھ اُس کے ابا جی
یوں ہیں جیسے کباب میں ہڈی

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

نرس اور ڈاکٹر

امیر الاسلام ہاشمی نے اپنی اس قطعے کا عنوان ''نرسائیٹس'' بھی بہت ڈاکٹرانہ رکھا ہے۔ سوزش کو طبی انگریزی میں آئیٹس کہا جاتا ہے اور جسم کے جس حصے میں سوزش ہو اس کے ساتھ آئیٹس کا لاحقہ لگا دیا جاتا ہے، مثلاً ٹانسل کی سوزش ٹانسلائیٹس، جوڑوں کی سوزش، آرتھرائیٹس، جگر کی سوزش ہیپاٹائیٹس وغیرہ۔ لہذا نرس کے ساتھ تعلق کو نرسائیٹس کا نام دے دیا گیا ہے۔

نرسائیٹس

کیا سنائیں آپ کو ہم اک شفا خانے کا حال
کام سے اپنے جہاں سارے خفا ہیں آج کل
تو وہاں پر ڈاکٹر ہیں تو بہ تو نرسوں کے ساتھ
تو کے تو ہی تو بہ تو میں مبتلا ہیں آج کل

امیر الاسلام ہاشمی

اور اس سوزش کا سائڈ ایفیکٹ نسیم سحر اور ڈاکٹر مظہر عباس رضوی یوں بیان کرتے ہیں

توجہ نرس پر تھی ڈاکٹر کی
ہوئی بیمار کی ایسی کی تیسی

نسیم سحر

ڈاکٹر چل دیا آرام سے اُس نرس کے ساتھ
رہ گئے ہم وہیں بیمار کے بیمار پڑے

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

مریضوں کو یہ اعتراض ہمیشہ سے ہے کہ ڈاکٹر اُن پر توجہ دینے کے بجائے نرسوں کی زیادہ خبر گیری کرتے ہیں۔

ڈاکٹر پہلے دیکھیں گے سسٹرز کو
آئی سی یو کے بیمار اپنی جگہ

عنائت علی خان

وہ تبسم اور ہنسی اُن کے لئے مخصوص ہے
نرس چلاتی ہے شعلہ بار ہے میرے لئے
اس کے شیریں لب بھلا قسمت میں ہیں میری کہاں
ایک کڑوی سی دوا ہر بار ہے میرے لئے

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

دل پر لگا نظر کا تری وار مرگیا
تری قسم میں تجھ پہ لگا تار مرگیا
چھیڑی جو ڈاکٹر نے غزل ہسپتال میں
دیوانی نرس ہوگئی بیمار مرگیا

اقبال شانہ

بیوی اور نرس

بیوی اور نرس نہ صرف یہ کہ دونوں ہی صنفِ نازک سے تعلق رکھتی ہیں بلکہ مزاجاً اور طبیعتاً بھی ان میں پائی جانے والی مماثلتوں سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ہمارے یہاں نرس کو اکثر سسٹر کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے۔ مصیبت اس وقت پیش آتی ہے جب یہ دو رشتے یکجا ہو جائیں۔ اس صورت حال کو مزاحیہ شعرا نے اپنے اپنے طریقے سے بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ اب یہ توارد ہے، کہ سرقہ وہ جانیں یا خدا جانے، ویسے اگر ان قطعات کو ایک لطیفے کا شاخسانہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا

جہاں میں کام کرتا ہوں بطورِ ڈاکٹر یارو
وہاں پر کیا بتاؤں مجھ کو کیا کچھ سہنا پڑتا ہے
مری بیوی وہاں پہ نرس تعینات ہے چونکہ
مجھے خود اپنی بیوی کو ہی سسٹر کہنا پڑتا ہے

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

اک نرس بھی کی تیسری بنتے ہی منسٹر
یاروں نے کہا کیسی ہے بھابی نئی مسٹر
کہنے لگا سب ٹھیک ہے بس ایک ہے الجھن
سنتی نہیں جب تک نہ کہوں میں اسے سسٹر

ڈاکٹر سعید اقبال سعدی

عادت کی اور بات ہے دل کی بُری نہیں
رہتی نہیں وہ مجھ کو برادر کہے بغیر
بیوی بنا کے نرس کو پچھتا رہا ہوں میں
سنتی نہیں جو بات کو سسٹر کہے بغیر

مرزا عاصی اختر

مگر نرسوں کو کبھی کبھی خوامخواہ کے عاشقوں کے لئے اس لفظ کی اصلیت کی طرف توجہ دلانی پڑ جاتی ہے، بقول خالد محمود

قریبِ مرگ مریض ایک نرس سے بولا
کہ فدوی کل سے فقط آپ کا دوانہ ہے
چھڑا کے ہاتھ وہ کہنے لگی کہ کیوں نہ ہو
مرا جناب سے رشتہ جو سسٹرانہ ہے

خالد محمود

پیشہ ورانہ مسائل

جس طرح پاکستان میں ہر شعبہ ہی رو بہ زوال نظر آتا ہے، اس طرح نرسنگ کا شعبہ بھی بہت سی خامیوں کے ساتھ مزاحیہ شاعروں کی توجہ اپنی طرف مرکوز کرالیتا ہے۔ پابندی وقت کا خیال رکھنے سے لے کر مریض کی ہر مشکل اور مصیبت کا خیال رکھنے تک اور پیشہ ورانہ ذمہ داری سے لے کر پیشہ ورانہ تعلیم و تربیت تک بے شمار مقامات آہ و فغاں آتے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک سچے واقعے کا بیان دلچسپی سے خالی نہ ہوگا، جس سے میڈیکل کے شعبے سے وابستہ حضرات زیادہ لطف لے سکتے ہیں۔ ڈاکٹر نے آپریشن کے بعد لکھا nurse in lateral position یعنی مریض کو کروٹ پہ لٹا کر دیکھ بھال کی جائے جب کہ نرس محترمہ اسے نہایت واہیات جملہ سمجھتی رہیں کہ نرس بھلا کروٹ سے لیٹ کر کیا کرے!

ازراہِ مذاق یار لوگوں نے نرسوں اور ڈاکٹروں کی نا اہلی پر بہت سے لطائف بھی گھڑ لئے ہیں۔ مثلاً وارڈ کے راؤنڈ پر

سینئیر ڈاکٹر نرس سے پوچھنے لگا کہ وہ مریض کہاں ہے جسے بہت کپکپی چڑھی تھی اور سردی لگ رہی تھی۔ نرس بولی جناب میں نے اسے ۱۰۴ والے بخار زدہ مریض کے بستر پہ لٹا دیا ہے تا کہ گرم ہوجائے۔ یا کسی نرسنگ انسٹرکٹر نے زیر تربیت نرس سے پوچھا کہ اگر کسی زخمی کے سر سے بہت خون بہہ رہا ہوتو تم کیا کرو گی۔ نرس خون روکنے کی بنیادی وجہ یاد کرتی ہوئی بولی کہ میں گردن پہ کس کر پٹی باندھ دوں گی تا کہ مزید خون نہ بہے۔

نرسوں کی اہلیت و قابلیت کے ساتھ ساتھ ان کی بروقت موجودگی مریض کی بیماری اور ٹینشن کو آدھا کر دیتی ہے۔ لیکن نرس اگر ضرورت کے وقت نہ دستیاب ہو تو بیمار کفِ افسوس ہی ملتا رہ جاتا ہے:

نیند آئی ہے لڑھک جاؤ جمائی لے کر
ایسی لبریز صراحی سے بھلا کیا حاصل
تشنگی ہائے نہ اب جانے کہاں تک پہنچے
اب کوئی نرس نہ آئے گی سحر ہونے تک

نامعلوم

موت کا ایک دن معین ہے
نرس نہ آئے گر نہیں آتی

شبنم کارواری

اور غالب کے اس مصرعے میں ڈاکٹر مظہر عباس اس طرح تحریف کرتے نظر آتے ہیں۔

پہلے آتی تھی نرس گھنٹی پر
اب کسی بات پر نہیں آتی

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

نرسوں کا غصہ بھی ضرب المثل بن چکا ہے۔ اگر چہ اس کی بے شمار وجوہات ہیں اور اس کا سارا قصور نرسوں پر نہیں ڈالا جا سکتا مگر مریض بیچارہ وارڈ میں اکثر سہما سہما نظر آتا ہے ۔

ہیں خون آلود نظریں، سرخ چہرہ، ناک پر غصہ
مریضِ ناتواں اب نرس بلوانے سے ڈرتے ہیں

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

بستر بھی نہ تھا گو کوئی بیمار کے نیچے
غُصّہ تھا مگر نرس کو بیمار کے اوپر

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

گُل ہے خار سے گُتھم گُتھا
در دیوار سے گُتھم گُتھا
چارہ گر، ڈسپینسر، نرسیں
ہیں بیمار سے گُتھم گُتھا

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

مگر نرس کے ظاہری غصے کے پیچھے نسوانہ کمزوری بلبل کاشمیری کی نظروں سے اوجھل نہیں رہتی۔

نرس ڈرتی ہے مرے زخم پہ مرہم رکھتے
سخت بزدل ہے وہ چوزے کا جگر رکھتی ہے

بلبل کاشمیری

اگر منصفانہ جائزہ لیا جائے تو نرسوں کا یہ غصہ اور جھنجھلاہٹ وقتی ہی ہوتی ہے۔ کام کی افراط اور ڈیوٹی کی یکسوئی انہیں نڈھال کر کے رکھ دیتی ہے۔ مگر جس طرح ہر شعبے میں نکمے لوگ بھی ہوتے ہیں اسی طرح یہ شعبہ بھی اس نقص سے پاک نہیں۔

احوال کیا سنائیں تمہیں ہسپتال کا
نقشہ دکھائی دیتا ہے جنگ و جدال کا
بستر پہ رن پڑا ہے زبردست دیکھنا
ہر ماں یہ کہہ رہی ہے یہ ہے میرے لال کا
کہتی ہے نرس آتی ہوں چلا نہ اس قدر
تھوڑا سا کام رہتا ہے بس میری شال کا
جانے قمر کو کس نے لگایا یہ بولی نرس
ٹیکہ تو یہ بنایا تھا میں نے ہلال کا

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

کام صبر و ضبط سے لے بند کر چیخ و پکار
وارڈ میں سوئے ہوئے بیمار مت بیزار کر
نرس نے پہلے لگایا نیند کا ٹیکہ مجھے
اور پھر کہنے لگی اب درد کا اظہار کر

مجذوب چشتی

اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا لطیفہ دوستو
اک قیامت سی قیامت یوں اٹھائی نرس نے
تاب زخموں کی نہ لا کر سوگیا بیمار جب
پھر اٹھا کر نیند کی گولی کھلائی نرس نے

افضل پارس

ہے یہ اِس دن کی یا اگلے دن کی ہے
نرس نے دی شب کو Pill بارہ بجے
شفٹ کے" رولے" میں مظہر پھنس گیا
مجھ کو کر یارب نہ "ill" بارہ بجے

ڈاکٹر مظہر عباس

نرسوں سے نئے نویلے ڈاکٹروں کا اول اول سامنا ہاؤس جاب کی ٹریننگ کے آغاز میں ہوتا ہے کہ اس سے پہلے وہ ہسپتال میں دن اور رات کی مسلسل ڈیوٹی اور ہسپتال کے مصروف معمولات سے بے خبر ہوتے جب کہ نرسیں کئی سالوں سے ان ہسپتالوں کے شب وروز سے پوری طرح واقف ہوتی ہیں اور یوں تجربہ کار کھلاڑی کے طور پہ ڈاکٹروں سے بہتر طور پر نبرد آزما ہوتی ہیں۔

دن رات کام کیجئے پھٹکار لیجئے
آئے ہیں خارزار میں تو خار لیجئے
پہلے ہوں ہاتھ جوڑ کے نرسوں کی خدمتیں
پھر ان سے کام اپنے کئی بار لیجئے

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

تفنن برطرف ،نرسنگ کے شعبے کی افادیت ایک جینوئین مریض ہی محسوس کرسکتا ہے ۔درد سے سسکتے اور بلکتے مریض جب ایک رحمِ دل نرس کے ہاتھ سے دوا لے کر سکون پاتے ہیں تو بقول پروین شاکر

اُس نے جلتی ہوئی پیشانی پہ جب ہاتھ رکھا
روح تک آگئی تاثیر مسیحائی کی

نظمیں

ذیل میں نرس کے عنوان سے ہمیں چار نظمیں ملیں جن کو پیش کیا جارہا ہے۔

بلبل کاشمیری پچاس کی دہائی میں انگلستان سدھار گئے تھے۔ انہوں نے برطانیہ میں ادھیڑ عمر سے بڑھاپے تک کی ساری منازل طے کیں۔ ہسپتال کی نرس کے بارے میں اُن کی نظم بعنوان " فرنگی نرس" ان کے تجربات ومشاہدات کا نچوڑ ہے، جسے پڑھ کر انگلستان میں نرس کی ایک خوبصورت تصویر ابھرتی ہے۔اور کیوں نہ ابھرے کہ شعبہء نرسنگ کی بانی فلورنس نائیٹ انگیل کا تعلق بھی اسی سرزمین سے تھا۔معروف مزاحیہ شاعر عنائیت علی خان نے ایسٹ انٹرنیشنل میں جب اپنی میڈیارڈ کی نظم پڑھی تو ان کے دل کی آواز ان کی ماخوذ نظم نرس سے سفید گلاب میں منتقل ہوتی نظر آئی۔مگر ڈاکٹر مظہر عباس رضوی کہ جو معالج بھی ہیں اور مزاحیہ شاعر بھی اور جنہوں نے ارضِ پاکستان کے بہت سے ہسپتالوں میں کام بھی کیا ہے کسی اور ہی قسم کی نرس کی تصویر کشی کرتے نظر آتے ہیں اور یہی صورتحال ہمیں پروفیسر غفار بابر مرحوم کے ہاں نظر آتی ہے جو اک ماہر تعلیم ہونے کے ساتھ ساتھ مزاحیہ شاعر بھی تھے اور جن کا تعلق ڈیرہ غازی خان سے تھا۔نرسوں کے حقیقی رویئے کو انہوں نے جس طرح محسوس کیا، اپنی نظم "مریض کی فریاد" میں بلاکم وکاست بیان کردیا ہے۔ذیل میں یہ چاروں نظمیں پیش کی جارہی ہیں۔

بلبل کاشمیری نے اختر شیرانی کے لب و لہجے کو استعمال کرتے ہوئے فرنگی نرس کی کچھ اس طرح عکاسی کی ہے۔

فرنگی نرس

یہی وہ وارڈ ہے روزی جہاں روزانہ آتی تھی

وہ جب وردی میں ہوتی تھی بھلی لگتی تھی وہ کتنی
گلستان محبت کی کلی لگتی تھی وہ کتنی
ادائے کافرانہ میں ولی لگتی تھی وہ کتنی
حقیقت تھی مگر وہ صورت افسانہ آتی تھی

یہی وہ وارڈ ہے روزی جہاں روزانہ آتی تھی

وہ آتی تھی تو ہر اک مردہ تن میں جان آتی تھی
وہ جاتی تھی تو اس کے ساتھ سب کی جان جاتی تھی
وہ بجلی کا منور بلب بن کر جگمگاتی تھی
شبِ ظلمت میں وہ مہ ناز مہتابانہ آتی تھی
یہی وہ وارڈ ہے روزی جہاں روزانہ آتی تھی
وہ میٹھی خواب آور گولیاں ہم کو کھلاتی تھی
سُلاتی تھی ، جگاتی تھی ، اُٹھاتی تھی ، بٹھاتی تھی
چبھو کر دل میں پچکاری وہ ہنس ہنس کر رلاتی تھی
فرنگن تھی پہ تیر و ترکشِ ترکانہ لاتی تھی
یہی وہ وارڈ ہے روزی جہاں روزانہ آتی تھی

عنایت علی خان نے ''ابنی میبارڈ'' کی نظم کا ترجمہ یورپ کے پس منظر کو اسلامی قالب میں ڈھال کر کچھ اس طرح کیا ہے۔

سفید گلاب

وہ اسپتال میں آتی ہے یوں خوش خرام
ستارۂ سحری ضوفشاں ہو جوں سرِ شام
وہ اُس کا وارڈ میں برقعہ اتارتے آنا
پئے سلام ، محبت سے ہاتھ لہرانا
وہ جس کی دید سے دل کو قرار آجائے
خزاں میں جیسے نسیمِ بہار آجائے
وہ جیسے محفلِ شب میں ہو ضوفگن مہتاب
وہ جیسے صحنِ چمن میں کھلے سفید گلاب
ہر اک مریضہ کو جا جا کے حوصلہ دینا
جو اُس کو نسخے میں لکھی ہو وہ دوا دینا
کراہ سن کے مریضوں کی تلملا جانا
پلک جھپکتے میں بستر کے پاس آجانا
بخار لینا مریضوں کا اہتمام کے ساتھ
کسی کو سوئی لگانا خدا کے نام کے ساتھ
نمازیوں کو بوقتِ سحر جگا دینا
وضو کرا کے مصلے وہیں لگا دینا
نماز پڑھ کے مریضوں پہ خود بھی دم کرنا
پھر ان کا چارٹ پہ احوالِ شب رقم کرنا
اور اپنے سارے مریضوں کو الوداع کہنا
ہر ایک کے دلِ ممنون سے دعا لینا
اسی نہج سے ہر اک شام کو سحر کرنا
حیات خدمتِ مخلوق میں بسر کرنا

کسی مزاحیہ شاعر کی لکھی ہوئی سنجیدہ ماخوذ نظم کی پیروڈی اردو ادب میں شائد نئی چیز ہو۔ ڈاکٹر مظہر عباس پاکستان کے ہسپتالوں کی نرس کی حقیقی صورتحال کی نشاندہی کرتے نظر آتے ہیں۔ ہاتھوں کی پانچوں انگلیاں ایک سی نہیں ہوتیں لیکن یہاں پر مجموعی صورتحال کی تصویر کشی کی ایک کوشش کی گئی ہے۔ ڈیوٹی فل اور بیوٹی فل نرسوں سے معذرت کے ساتھ۔ اور عنائت علی خان صاحب سے ڈبل معذرت کے ساتھ۔

پاکستانی نرس (پیروڈی)

وہ اسپتال میں آئے تو چیختی آئے
جو درد کم تھا اُسے اور تیز کر جائے
وہ جس کی دید سے سر کو بخار چڑھ جائے
وہ جس کو دیکھ کے ہر اِک مریض تھرّائے
وہ جیسے جلتا ہوا آفتابِ نصف نہار
وہ جیسے نارِ جہنم ، غضب سے شعلہ بار
وہ اس کا وارڈ میں چلّا کے ڈانٹنا سب کو
ہر اک کو کہنا کہ اُٹھو ، چلو ابھی نکلو
ہر اک مریض کو جا جا کے ''بلبلا'' دینا
یہ کہنا جلدی سے بازار سے دوا لانا
لگا کے وارڈ میں اِک چوکیدار کی ڈیوٹی
وہ گھسنے دیتی نہیں ہے وہاں کسی کو بھی
نکالتی ہے مریضوں کے غمگساروں کو
جو خون دیتے نہیں ، ایسے جاں نثاروں کو
وہ ڈانٹتی ہے جو غصّے میں آ کے آیا کو

تو چھوڑتی نہیں پھر اُس کے ماموں تایا کو
جھڑکتی ہے جو کبھی زور سے اٹینڈینٹ کو
لواحقین یہی سوچتے ہیں اب بھاگو
جگا کے کہتی ہے سوتے ہوئے مریضوں کو
اُٹھو اور اُٹھ کے ذرا گولی نیند کی کھا لو
جو غصہ آئے ، لگائے وہ زور سے ٹیکا
نہ کر سکے کوئی پر اُس کا بال بھی بیکا
بُلاتی ہے وہ ہر اِک کو بڑے تحکّم سے
کرے وہ درد مگر دور اِک تبسّم سے
وہ کر کے آتی ہے ہر روز بت نئے فیشن
مریضِ دِل کی بڑھاتی ہے اِس طرح ٹینشن
چڑھی ہے تیوری ، لہجہ ہے سخت ، دِل پُر سوز
لبوں پہ پھول کھلیں گر اُسے کہیں ''مس روز!''

پروفیسر غفار بابر کا ''نرسیانہ تجزیہ'' ڈاکٹر مظہر عباس سے مختلف نظر نہیں آتا۔ان کی نظم'' مریض کی فریاد'' پاکستان میں عام سرکاری ہسپتال کے مریض کا نوحہ بھی ہے اور ہمارے لئے لمحہ فکریہ بھی۔

مریض کی فریاد

اے ربّ دو جہاں ، دنیا کے والی
ترا دربار ہے دربارِ عالی
مریضوں کی ذرا فریاد سن لے
کھڑے ہیں جو ترے در پر سوالی
نچوڑا خون کچھ تو ڈاکٹر نے
کسر باقی ہے نرسوں نے نکالی
خدا محفوظ رکھے سسٹروں سے
لئے پھرتی ہیں بندوقیں دو نالی
دوائی جب یہاں ملتی نہیں ہے
ملے گولی کے بدلے کیوں نہ گالی
کہاں کے ڈاکٹر کیسی یہ نرسیں
کوئی بینگن کوئی بینگن کی تھالی

مریضوں سے نہیں ان کا تعلق
طبیعت سب نے پائی لاابالی
سلامت سسٹروں کے ہوں دوپٹے
مریضوں کی گئی پگڑی اچھالی
بڑی اِٹھلا کے چلتی ہیں یہ نرسیں
بنی پھرتی ہیں راجہ خاں کی سالی
حقیقت سے نہیں ان کا تعلق
پکاتی ہیں پلاؤ سب خیالی

نوید ظفر کیانی اسلام آباد میں مقیم محفلوں اور مشاعروں سے دور مگر انٹرنیٹ اور فیس بک سے جڑے ہوئے مزاحیہ شاعر ہیں جو انٹرنیٹ کے مزاحیہ رسالے'' ارمغانِ ابتسام'' کے مدیر بھی ہیں۔ان کی شاعری بڑی متنوع اور پر بہار ہے۔لیکن نرس کے رویئے کے وہ بھی شاکی نظر آتے ہیں۔

نرس اور ملاقاتی

نرس ری نرس تری کون سی'' گل چنگی'' ہے

ہر ملاقاتی ''ملیٹینٹ'' تجھے لگتا ہے
جس کا گھس آنا مریضوں کے لئے خطرہ ہے
تو محافظ ہے سو ''ڈیفینس'' پہ آمادہ ہے
اِسی باعث تو ہر اک چال تری جنگی ہے
نرس ری نرس تری کون سی'' گل چنگی'' ہے

تیرا اندازِ سخن ہے یا کوئی ''کاشن'' ہے
تیری باتیں ہیں کہ ہاتھوں میں تنا بیلن ہے
یہ ترا لہجہ ہے کہ بھینس کا انجکشن ہے
ہر ملاقاتی کے حق میں تو نری'' ڈینگی'' ہے
نرس ری نرس تری کون سی'' گل چنگی'' ہے

کہہ دیا تو نے تو پھر گھات نہیں ہو سکتی
''مُک گیا وقت ، ملاقات نہیں ہو سکتی''

گویا اس بات پہ اب بات نہیں ہو سکتی
لاکھ بتلایا کہ کمرے میں مرا "تنگی" ہے
نرس ری نرس تری کون سی "گل چنگی" ہے

ایسا کرنا تیری ڈیوٹی کا تقاضہ ہی سہی
دوسرے لوگوں کے نزدیک یہ نخرہ ہی سہی
فرض اِک تیغ ہے تو جس پہ سدا "ننگی" ہے

تو ہمارے لئے اِک پنجۂ گربہ ہی سہی
نرس ری نرس تری کون سی "گل چنگی" ہے

ڈرامے بازیاں
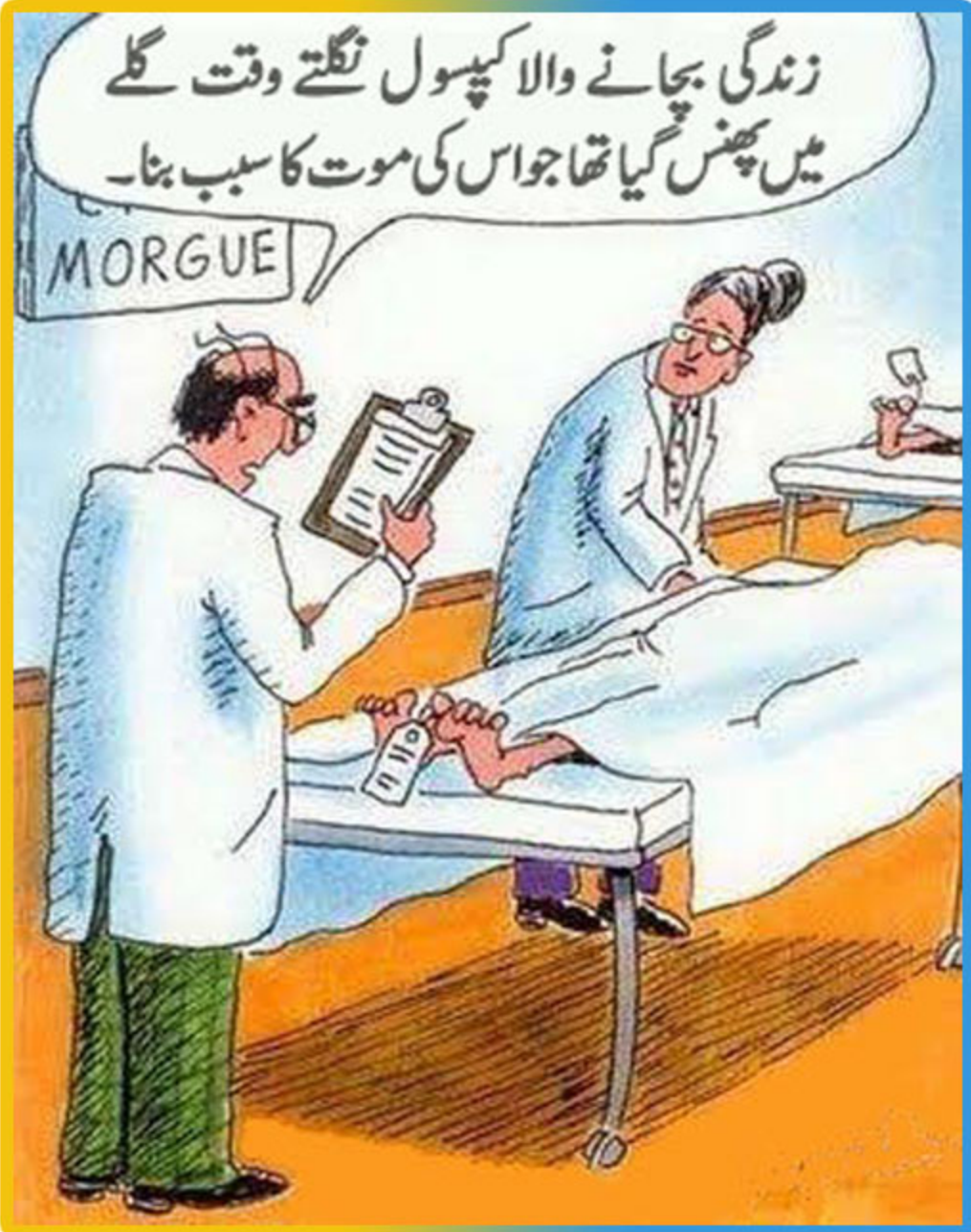
محمد یعقوب آسی
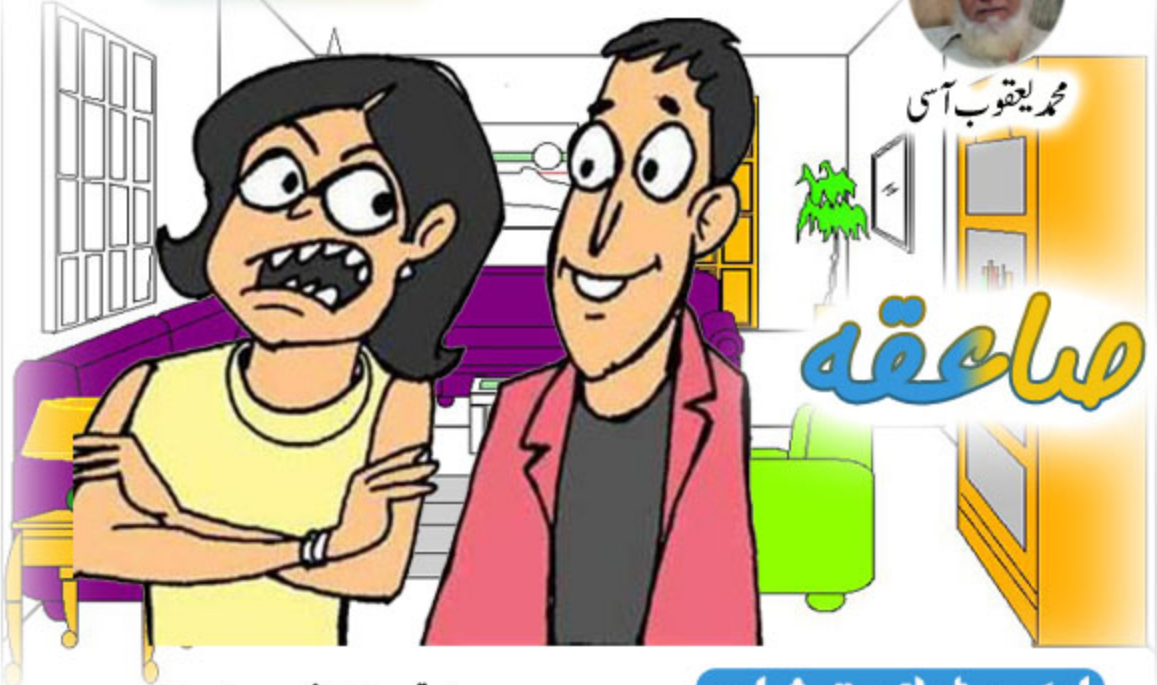
صاعقہ

ایک ریڈیائی تمثیلچہ

کردار **جواد** (صاحبِ خانہ)

صاعقہ (خاتونِ خانہ)

طفیل (گھریلو ملازم)

منظر میاں بیوی دونوں لاؤنج بیٹھے ہیں۔ جواد ایک مجلّے کی ورق گردانی کر رہا ہے، صاعقہ اپنے سمارٹ فون سے کھیل رہی ہے۔

صاعقہ کیا پڑھ رہے ہو؟

جواد کچھ نہیں، ایسے ہی بس ورق گردانی کر رہا ہوں، میگزین کی۔۔۔تم کیا کر رہی ہو۔

صاعقہ "کیا کر رہی ہو، کہاں جا رہی ہو، کون آ رہا ہے"۔۔۔ میں کہتی ہوں، جواد! یہ کیا طریقہ ہے؟ میں کوئی سکول گرل نہیں ہوں جو تم ہر لمحے میرے ٹیوٹر بنے رہو۔ اور سنو! یہ ٹوہ لگانے والی عادت بہت بری ہے تمہاری! زہر لگتے ہو کبھی کبھی۔ ہر وقت سوال، ہر وقت ٹوکنا، اور مجھے بات کرنے کا موقع نہیں دیتے! بات کرتی ہوں تو سنتے نہیں ہو، یا پھر ان سنی کر دیتے ہو۔ میں کہتی ہوں میں تمہاری بیگم ہوں یا۔۔۔

جواد (بات کاٹتے ہوئے) وہ طفیل کہاں ہے۔

صاعقہ مر گیا ہوگا کہیں! یہ گلی کی نکڑ تک بھیجا تھا، ہری مرچ لانے کو، گھنٹا بھر ہو گیا!۔۔۔ جہاں جاتا ہے بیٹھ جاتا ہے، نکما!۔۔۔ اے میں کہتی ہوں جواد! تم نے سر چڑھا رکھا ہے اسے! میں تو اسے کب کا چلتا کر چکی ہوتی! نکھے لوگ، سمجھتے ہیں گھریلو ملازموں کا کال پڑا ہے۔ ایک ڈھونڈو، ہزار ملتے ہیں! تمہیں پتہ نہیں اُس میں کیا دکھائی دے گیا جو اُس کو اٹھا لائے! جواد!۔۔۔ جواد!۔۔۔ میں تم سے بات کر رہی ہوں، بولتے نہیں ہو۔۔۔ اپنے لاڈلے طفیل صاحب کا کام بھی خود ہی کر لیا کرو، اسے کیوں رکھا ہے روٹیاں توڑنے کو؟ پر، تم سے کیا ہوگا! نہیں تو اس طفیلیے کو کیوں لاتے! سارا ہفتہ شام تک دفتر میں پڑے رہتے ہو اور چھٹی کے دن بھی، اول تو کہیں باہر گئے ہوتے ہو، نہ

بھی گئے ہو تو پلندوں کے پلندے گھر پر اٹھا لاتے ہو۔۔۔ اے، میں کہتی ہوں: کمپنی کا سارا کام کیا تمہارے کندھوں پر ہے؟۔۔۔ کچھ پھوٹو گے بھی منہ سے؟ میں پاگل ہوں کیا! باؤلی ہو گئی ہوں؟ جو خود سے باتیں کر رہی ہوں۔

(جواد سے مجلّہ جھپٹ لیتی ہے)

جواد آپ کا یہ خادم آپ کے خاموش ہو جانے کا منتظر تھا۔۔۔ فرمائیے!

صاعقہ آئے ہائے! (جواد کی نقل اتارتی ہے) ''فرمائیے'' ۔۔۔تم مردوں میں یہی ایک تو خوبی ہے! میرا سر دکھنے لگا ہے بول بول کے اور تم نے ایک لفظ بھی نہیں سنا! تم مجھے پاگل کر دو گے جواد! بلکہ کر کیا دو گے کر دیا ہے! پاگل بنا رکھا ہے مجھے!۔۔۔ ہائے میرا سر! وہ کمینی بھی نہیں آئی آج، حرام خور کہیں کی۔۔۔ نواب زادی نے گھر سے پیغام بھیج دیا کہ بیٹا بیمار ہو گیا ہے۔۔۔ اے لو! تو بھئی ہم نے تو بیمار نہیں کیا اُس کو، آ کے ناشتہ وغیرہ بنا کے دے جاتی، تو کیا ہو جاتا! اب کل منہ بسورتی آئے گی، ٹسوے بہائے گی۔۔۔ ''بیگم صاحبہ دو سو روپے اٹھ گئے بیٹے کی دوائی پر، مجھے کچھ پیسے دے دیں، تنخواہ سے کاٹ لیجئے گا''۔۔۔ اے میں کہتی ہوں، ہم نے یتیم خانہ کھول رکھا ہے کیا؟ میرا سر پھٹ رہا ہے جواد، اور تم پتھر کی طرح چپ بیٹھے ہو!

جواد طفیل آتا ہے تو اس کے ہاتھ سر درد کی گولی منگوا لینا۔ تمہاری نان سٹاپ تقریر سے سر درد تو مجھے ہونا چاہئے تھا۔ ہو سکے تو کچھ دیر خاموش رہ لو، تھوڑا سا سکون مل جائے گا۔

صاعقہ وہ تمہارا لاڈلا طفیلی کیڑا واپس آئے گا تب نا! تم جا کے کیوں نہیں لا دیتے سر درد کی دوا؟

جواد یہ بھی ٹھیک ہے! اچھا میں لاتا ہوں دوائی، کچھ اور بھی منگانا ہے تو بتا دو، لیتا آؤں گا۔

صاعقہ میں نے لسٹ نہیں بنا کے رکھی ہوئی! دوائی لا دو، ڈاکٹر کا نسخہ میری دراز میں رکھا ہے، وہ ساتھ لیتے جانا ۔۔۔ نہیں تو خالی ہاتھ لوٹ آؤ گے کہ دوائی کون سی لانی تھی۔۔۔ اے! یہ تم نے کہا کیا تھا؟ ''تھوڑا سا سکون مل جائے گا''؟ کسے مل جائے گا سکون؟

جواد دونوں کی بات کی ہے۔

صاعقہ آئے ہائے جواد! مجھے سر درد کہتے ہو تم؟۔۔۔ جواد! تم؟ بھول گئے اتنی جلدی؟ ابھی تو بیس سال بھی نہیں ہوئے! میری ایک ایک ادا پر مرتے تھے تم! ڈرامے باز کہیں کے! ہر وقت ''صاعقہ صاعقہ صاعقہ'' (کچن میں کھٹ پٹ کی آواز آتی ہے، وہ بلند آواز میں پوچھتی ہے)۔۔۔ کون ہے ادھر؟

طفیل (کچن ہی سے) میں ہوں بی بی جی! ہری مرچ یہاں رکھ دی ہے، ادرک بھی لے آیا ہوں، بریانی مسالہ بھی، مکھن کی ٹکیاں اور۔۔۔

صاعقہ (مزید بلند آواز میں) ادھر تو آؤ! احمق کہیں کے!

(طفیل کے آتے قدموں کی چاپ)

طفیل جی، جی بی بی جی۔

صاعقہ میں نے تجھے ایک ہری مرچ لانے کو کہا تھا، تو اِتنی ساری چیزیں اٹھا لایا! مفت میں بٹ رہی تھیں کیا؟

طفیل (گھبرائے ہوئے لہجے میں) وہ جی، وہ، وہ، کچن میں یہ چیزیں نہیں تھیں جی۔ میں نے سوچا۔۔۔

جواد (بات کاٹتے ہوئے) طفیل! بیکری تک جاؤ ذرا، چار پانچ دوستوں کے لئے چائے کا سامان لانا ہے۔ یہ لو پیسے۔

طفیل جی صاحب جی!

جواد نہیں! چائے نہیں، چائے بنانی پڑے گی۔۔۔ کولڈ ڈرنک کا کر لینا، اوکے؟

طفیل جی صاحب جی۔ (طفیل کے جاتے قدموں کی

چاپ)

صاعقہ میں یوں ہی نہیں کہتی جواد! تم نے اس کو ہزار کا نوٹ تھما دیا، بتایا کچھ بھی نہیں۔ پتہ نہیں کیا الا بلا اٹھالائے گا، اور تم اسے پھر بھی شاباش دو گے۔ سر چڑھا رکھا ہے تم نے! میں کہتی ہوں کیوں منہ لگاتے ہو، ان کو؟

جواد (تلخی کے ساتھ) سنو صاعقہ بیگم! ہر وقت کڑکتی رہتی ہو، اپنے نام کی طرح۔۔۔ تمہیں پتہ ہے بجلی دور کڑک چمک رہی ہو تو اچھی لگتی ہے، میں وہ کہتا پھرتا تھا: ''صاعقہ صاعقہ صاعقہ''۔۔۔ اب جو ہمہ وقت عین میرے سر پر کڑکتی ہو، نا! تو۔۔۔

صاعقہ (تقریباً چیختے ہوئے) کیا، کیا، کیا، کیا! یہ تم ہو جواد؟ جواد یہ تم ہو؟ یہ تم کہہ رہے ہو؟

(جواد کے موبائل فون پر کال آجاتی ہے)

جواد ہاں بھئی خواجے۔۔۔ ہاں، میں گھر پر ہوں، آ جاؤ یار، بس، اور کیا ہے! کون کون ہے تمہارے ساتھ؟۔۔۔ انہیں بھی ساتھ لے آؤ، کوئی حرج نہیں، اگر وہ خود بور نہ ہوں تو۔۔۔ کس کی مہربانی؟ شٹ اپ خواجہ! تم جانتے ہو یہ فارمل انداز مجھے اچھا نہیں لگتا، کم آن! مجھے کہیں نہیں جانا، یار!۔۔۔ او کے۔

صاعقہ کون آ رہا ہے؟ وہی ہوں گے، ایک وہ کسی مُشر وم اخبار کا ایڈیٹر، ایک وہ نقاد کیا نام ہے اس کا، اور، وہ کون ہے وہ۔۔۔؟ وہی جس کو ہنسنے کا بھی سلیقہ نہیں آتا (طنزیہ ہنسی ہنستی ہے) اور وہ ہوگا، تمہارا طوفان آبادی یا گل خانہ، اور۔۔۔ پتہ نہیں کون سارے نکمے اکٹھے ہو کر آ جاتے ہیں، تمہارے پاس۔

جواد میرے دوستوں کا مذاق اڑا کر ہی سہی، شکر ہے تم ہنسی تو ہو!۔ (ہلکا سا قہقہہ لگاتا ہے) اپنے ویک اینڈ بھی کیا ہوتے ہیں، بجلی بیگم!

صاعقہ ہو جاؤ شروع! میں کہتی ہوں تم نے بیوی کی قدر کرنا سیکھا ہی نہیں! نام میرا تم نے بگاڑ دیا، بچے نہ ہوتے تو میں ٹھینگا دکھا جاتی تمہیں، نکمے ہو تم! صرف باتیں بنانا جانتے ہو، اور کہتے مجھے ہو کہ بولتی بہت ہے۔۔۔ میں شور نہ مچاؤں تو اس گھر کے کمروں میں گھاس اُگ آئے۔۔۔ میں مرگئی نا، تو پتہ چل جائے گا سکون کہتے کسے ہیں۔ پتہ نہیں امی کو تم میں کیا دکھائی دے گیا کہ تم پر صدقے واری گئیں اور مجھے تمہارے پلے باندھ دیا (چونک کر) ارے! جواد! بچوں کو تو لے آؤ! امی کے ہاں گئے ہوئے ہیں۔ بلکہ چلو میں بھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔

جواد (سرد لہجے میں) میرے دوست آ رہے ہیں، بھائی کو فون کر دو چھوڑ جائے۔

صاعقہ بس؟ چل گیا نا پتہ! تمہارے دوست آ رہے ہیں۔ سیدھا کیوں نہیں کہتے کہ میرے ساتھ جانا تمہیں اچھا نہیں لگتا۔۔۔ تم، تم جواد! ابھی تو میں کہتی کچھ نہیں، نہیں تو سمجھ آ جائے تمہیں! میری خاموشی سے ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہو تم۔

(طفیل کے آتے ہوئے قدموں کی چاپ)

طفیل صاحب جی! بڑی میز پر لگا دوں یا بیٹھک میں؟

جواد ڈرائنگ روم میں لگا دو یار، تکلفات میں کیا پڑنا۔

صاعقہ (طفیل سے) اے نکمے! آ گیا ہے تو پورا دن گزار کر۔ جہاں جاتا ہے مر جاتا ہے جا کر۔ میں تمہاری چھٹی کرا دوں گی، بس یہ مہینہ پورا کر لو (چونک کر) اے! سنو!

طفیل جی بی بی جی!

وہ کام والی بھی آج مری ہوئی ہے، تمہاری طرح۔ جلدی جلدی ڈش واشنگ کر دو، اور ہاں! برتنوں میں صابن رہ گیا تو میں تمہارے ہاتھ توڑ دوں گی۔۔۔ اور وہ تم نے دیکھا تھا؟ مسالے وغیرہ کچھ ختم ہو رہے تھے، وہ بھی لانے ہیں، اے! میں ہی بتاؤں گی سارا کچھ کیا؟ تمہاری آنکھیں نہیں ہیں؟ خالی ٹین کے

ڈبے ہو تم۔

طفیل جی بی بی جی، وہ تو میں لے آیا تھا۔ اور آپ نے۔۔۔

صاعقہ (ہنستے ہوئے) اچھا، اچھا! بہت سیانے ہو تم! اب زیادہ باتیں نہ بناؤ۔

(سب اکٹھے ہنستے ہیں)

ڈاکٹر عزیز فیصل

مونچھوں کا اس کے منہ پہ تھا گچھا لگا ہوا
جیسے ہو تارکول کا گولہ لگا ہوا

ممکن نہیں ہے بزمِ سجن میں پرا کسی
واں باؤ میٹرک کا ہے آلہ لگا ہوا

سمجھو نہ اس مریض کی حالت کو نارمل
ہو جس کے سر میں عشقیہ ٹیکا لگا ہوا

بولے وہ شخص خیر کے الفاظ کس طرح
ہو جس کی عقل داڑھ کو کیڑا لگا ہوا

چشم گناہگار سے دیکھا ہے خواب میں
جاناں کے دل پہ چائنا تالا لگا ہوا

ایسے ہیں اس دماغ کے دھاگے اڑے ہوئے
جیسے کہ ہو انار کو جالا لگا ہوا

نمکین شاعرات بٹھائی گئیں وہاں
فیصل جہاں تھا شہد کا چھتہ لگا ہوا

وہ اگر ہے رقیب تقریباً
میں ہوں پھر خوش نصیب تقریباً

خود کو کہتا تھا برملا وہ حکیم
گائنی کا طبیب تقریباً

فیس بک پر بیاہ کرتا ہے
ہر کنوارا ادیب تقریباً

دن دہاڑے بھی تھا میاں اس کا
رات جتنا مہیب تقریباً

تاڑتا ہو جو دوربین سے چاند
وہ ہے مفتی منیب تقریباً

بھاگ سکتا ہے کوئے لیلیٰ سے
قیس بھی عنقریب تقریباً

میں بشیراں کے حسن کا فیصل
ہوں اکیلا نقیب تقریباً

ڈاکٹر مظہرؔ عباس رضوی

وہ ''بزمِ طرح'' سے مصرعے چُرا کر
غزل لائے گا اِک پوری بنا کر

اُگائے جارہا ہے شعر اپنے
زمیں پر دوسروں کی ہل چلا کر

لگا کر ڈھول اور باجے پہ قدغن
ہوا خوش مولوی بغلیں بجا کر

مکاں ٹھیکے پہ بنوایا تھا جس سے
اسے وہ چل دیا چُونا لگا کر

سماعت کی بھی شامت آئے گی اب
سنائیں گے ہمیں وہ شعر گا کر

عدالت نے دیا ہے فیصلہ تب
مرے جب لوگ سارے کھپ کھپا کر

ہے جن کی عقل ساری مائینس میں
بصیرت ڈھونڈیں وہ چشمہ لگا کر

بنی ہے سوچ اپنی طالبانی
نہ مانے جو اسے پسٹل سے ''ٹھا'' کر

سیاست داں، کرے گا یوں سیاست
''نکل جائے گا وہ دامن بچا کر''

ملاوٹ بھی اثر دکھلا رہی ہے
ہیں زندہ کب سے مظہرؔ زہر کھا کر

ڈاکٹر مظہرؔ عباس رضوی

اُڑایا آندھی نے رُقعہ، رومال سے بھی گئے
اب عرض کیا کریں، ہم عرضِ حال سے بھی گئے

اُدھر یہ حال کہ مرغے اڑائے روز رقیب
اِدھر یہ حال کہ ہم باسی دال سے بھی گئے

مضاربے کی لگی ضرب مولوی جی سے
مآلِ کار ہوا یہ کہ مال سے بھی گئے

جو گوشمالی کے قابل تھے اُن سے ہاتھ ملائے
جنوب میں بھی پٹے اور شمال سے بھی گئے

پھُدکتے پھرتے ہیں جوگر میں اور نیکر میں
ہم ایسے کوئے ہیں جو اپنی چال سے بھی گئے

وبال بن گیا نسخہ حکیم صاحب کا
وہ چار بال تو کیا آتے کھال سے بھی گئے

بڑھائیں پینگیں اگرچہ بہت ہی ڈالر سے
مگر ستم یہ ہوا ہم ریال سے بھی گئے

بہت سے لوگوں کے سر گھومتے ہیں بارہ بجے
غلط ہے گر کوئی سمجھے کہ ''خالصے'' بھی گئے

رہا نہ بانس تو پھر بانسری بھی کیا بجتی
جو دانت گر گئے تو ہم خلال سے بھی گئے

ملال یہ ہے کہ مرضی سے خود بنے گونگے
نہ آئی ''اے۔بی۔سی'' اور ''دال''، ''ڈال'' سے بھی گئے

نہ یادگار ہے ماضی نہ اپنا مستقبل
ہمارا حال تو یہ ہے کہ حال سے بھی گئے

جو آئیں آنسو بھی مظہرؔ تو ہنسنا پڑتا ہے
ظریف جب بنے، رنج و ملال سے بھی گئے

تنویر پھول

تو نے جو کو توال رکھا ہے
کیا اُسے دیکھ بھال رکھا ہے ؟

خانصاحب کی کھوپڑی ہے عجب
کس مصیبت میں ڈال رکھا ہے !

کرتا رہتا ہے بس جو ٹیں ٹیں
کیسا طوطا یہ پال رکھا ہے

قوم کو لوٹ کر ڈکار نہ لی
کیوں چھپا کر وہ مال رکھا ہے

گاؤں سے مرغیاں چُرانے کو
پال تو نے شغال رکھا ہے

وزن تیرا ٹنوں میں ہے شاید
کس نے تجھ کو سنبھال رکھا ہے

رال بہہ بہہ کے بن گئی ندی
دیکھ ! لڈو کا تھال رکھا ہے

شیخ چلّی کا خواب ہے اس میں
تو نے انڈا اُبال رکھا ہے

جو بڑی مچھلیاں ہیں عیش کریں
''جیم'' نے چھوٹا ''جال'' رکھا ہے

چور اور ڈاکو مل کے بیٹھے ہیں
اپنی شامت کو ٹال رکھا ہے

پھولؔ ! اصلی نہیں، ہے مصنوعی
گال پر اُس نے خال رکھا ہے

تنویر پھول

دیکھ کر تھانے دار، سمجھے نا ؟
اُس کو آیا بخار ، سمجھے نا !

اُس نے درگاہ اِک بنا لی تھی
جو گدھے کا مزار ، سمجھے نا !

آج بیگم کو ہو گئی اُلٹی
لاؤ جلدی اچار ، سمجھے نا!

مال سارا چلا گیا باہر
ملک پر ہے اُدھار ، سمجھے نا!

وہ ہے چکنا گھڑا مگر ڈرپوک
بزدلی میں سیار، سمجھے نا!

قوم کو ''فول'' وہ بناتا ہے
اُس کا یہ کاروبار ، سمجھے نا!

اپنی فطرت میں تھالی کے بینگن
اُس کے مکّار یار، سمجھے نا!

کچھ سمجھ دانی میں نہیں آتا
بولا وہ بار بار سمجھے نا!

ہار کر بھی وہ جیت جاتا ہے
دیکھو! گردن میں ہار ، سمجھے نا !

پیٹ اُس کا کبھی بھرے گا نہیں
یہ ہوس کا ہے غار، سمجھے نا!

پھولؔ ! مچھر نے آج یوں کاٹا
جیسے چبھتا ہے خار ، سمجھے نا!

عرفان قادر

کس لیے سیرت یا صورت دیکھنا
بینک میں ہے کتنی دولت دیکھنا

دیکھتے ہی گر نہ پڑنا سوٹ پر
سب سے پہلے اُس کی قیمت دیکھنا

جھوٹ کو جب دیکھنے کا دل کرے
آپ اربابِ سیاست دیکھنا

بیٹھتا ہے اونٹ کس کروٹ جناب
بیٹھنے سے قبل، حضرت! دیکھنا

مولوی جی! اور بھی کچھ کام کر
چھوڑ حلوے کی حلاوت دیکھنا

رانجھے کو ایک دن مروائے گی
قیس کی ہر وقت سنگت، دیکھنا

خوب "لاہوری مٹن" کھانے کے بعد
کیا کرے گا اب وہ حرکت، دیکھنا

ایک گھر داماد کی سسرال میں
کس طرح بنتی ہے درگت دیکھنا

خود کو ہے غالب سمجھتا، غالباً
ہے چول کی کتنی جرأت، دیکھنا

عرفان قادر

مجرموں کو کبھی ایسی بھی سزا دی جائے!
اُس کو چھتے، اِس کو غزل ایک سنا دی جائے!

ٹینک" کی بکنگ آج ہوئی ہے اوپن
سب رقیبوں کی ٹکٹ، کیوں نہ کٹا دی جائے؟

میرے سُسرال کا ہمسایہ ہے ڈونلڈ ٹرمپ
رُعب لوگوں پہ ہو، بے پر کی اُڑا دی جائے!

ساس کہتی ہے کہ آئی ہے کہاں سے یہ چڑیل
آس رکھتی ہے بہو، کب یہ فسادی جائے؟

شام تک شہر کے ہر شخص کو ہو گی معلوم
بات، جاٹو کو اگر کوئی بتا دی جائے!

پھونک سے اُڑ کے، سفر قیس کیا کرتا ہے
اُف یہ لیلیٰ، کہ ٹرالر پہ ہی لادی جائے!

جب بھی آپس میں ملیں، کرتے ہیں گِٹ مِٹ دونوں
جولیٹ رومیو کو اردو سکھا دی جائے!

بحر و بر میں ہے غزل، قافیے ٹیڑھے میڑھے
داد کیونکر تجھے، اے ماہ لقا! دی جائے؟

اک نیا ردِ بلا کا ہے طریقہ یہ بھی
کر مقابل میں کھڑی اور بلا دی جائے!

قمر آسی

چاہت ہے گر تری کہ نہ تجھ کو ڈیلفیٹ ہو
بے غیرتی کے گھونٹ پی، حد درجہ ڈھیٹ ہو

شاعر تمام آئیں گے محفل میں آپ کی
تگڑا معاوضہ جو ہو، ریٹرن سیٹ ہو

ویسے تو ڈاکٹر نے مرغن منع کیا
ہوتا نہیں ہے صبر جہاں پر بھی میٹ ہو

شعلہ نگاہی آپ کی جھلسا نہ دے کہیں
ازراہ مہربانی ذرا کم یہ ہیٹ ہو

ناچیں گے اور نچائیں گے شیطان سب، جہاں
گاتا ہو بادشاہ، ہنی سنگھ فیٹ ہو

دور منافقت میں کہیں کھو نہ جائے وہ
رکھ دو میوزیم میں جو اندر سے نیٹ ہو

لوٹ آؤں گی میں جلد ہی، وائف نے کہہ دیا
آسی نہ اس ازادی پہ اتنا گریٹ ہو

قمر آسی

عاشقی کا عجیب قصہ ہے
ہر قدم پر فراڈ، دھوکہ ہے

حور کو جب قریب سے دیکھو
اس کے پہلو میں ایک نورا ہے

تم سے بس ایک پھول مانگا تھا
تم نے گملا ہی کھینچ مارا ہے

میں ہوں لاچار بیٹھنے سے بھی
سب رقیبوں نے اتنا پیٹا ہے

دنیا والوں سے میں نہیں ڈرتا
تیرے گھر میں مگر جو کتا ہے

کتنی دلکش نئی پڑوسن ہے
ہاں مگر اس کا ایک بچہ ہے

عاقبت کا خیال ہے ورنہ
دل تو بابے کا بھی مچلتا ہے

ترچھی نظروں سے دیکھنے والی
تیری آنکھوں میں کوئی مسئلہ ہے

چل قمر اس گلی میں چلتے ہیں
لال شربت وہاں پہ بنتا ہے

نوید صدیقی

یہ جو بے وزن ڈھیروں شاعری ہے
سبب اس کا زیادہ خواندگی ہے

سمجھتے ہی نہیں کچھ آپ خود کو
یقیناً آپ کی خود آگہی ہے

کنڈکٹر نے کہا ''فارغ ہوں جلدی''
ذرا سی دیر کو یہ بس رکی ہے''

سپیلنگ ہیں جدا اس کی لغت میں
صحیح کو بھی وہ کہتا ہے''سہی ہے''

تمھارے گال پر ''ریشز'' نہیں تو
یہ کیسی آگ جیسی روشنی ہے

بزی ہے فون اس کا پچھلی شب سے
کسی سے بات لمبی ہوگئی ہے

نوید صدیقی

مل گیا آج ان کے در سے بھی جواب
جن سے مانگا ہی نہ تھا میں نے حساب

آتے آتے آ ہی جاتا ہے شعور
جان کر انسان ہوتا ہے خراب

گھونٹ دیجے اپنے جذبوں کا گلا
کیجیے پھر شوق سے سرکاری جاب

اس لیے ہوتی نہیں تخلیقِ نو
آنکھ اب کم دیکھتی ہے کل کے خواب

ہے مسلسل زندگی کا امتحاں
اورمدت سے نہیں کھولی کتاب

دے رہا ہوں وقت اپنے آپ کو
یوں بڑھاپا جا رہا ہے پرشباب

جہانگیر نایابؔ

نخرہ ہی سہی کچھ تو دکھانے کے لیے آ
تُو مجھ سے خفا ہے تو زمانے کے لیے آ

اک تیرِ نظر دل پہ چلانے کے لیے آ
اک زخم جگر اور لگانے کے لیے آ

محفل میں ذرا رنگ جمانے کے لیے آ
سنگت ہی سہی، طبلہ بجانے کے لیے آ

تمہیدِ جدائی ہے اگرچہ ترا ملنا
آ پھر سے مجھے ڈانٹ کے جانے کے لیے آ

بن تیرے یہاں اب تو خموشی کا ہے ڈیرا
کہرام میرے گھر میں مچانے کے لیے آ

کچھ اور نہیں بنتا تو ٹیچر ہی مری بن
تیار ہوں میں مرغا بنانے کے لیے آ

روٹھا ہوں تو روٹھا ہی رہوں تیری بلا سے
کہتا ہے تجھے کون منا نے کے لیے آ

سنجیدہ غزل کہتا ہے نایابؔ تُو گرچہ
کچھ رنگِ ظرافت بھی دکھا نے کے لیے آ

جہانگیر نایابؔ

جو جی میں آئے وہی تم خطاب دے جاؤ
مری دکان کان کا پچھلا حساب دے جاؤ

بنا سکوں میں ورق پھاڑ کر جسے پُڑیا
گئے زمانے کی کوئی کتاب دے جاؤ

مری دکان سے جو تم نے ادھار کھایا تھا
ملے ہو آج تو پورا حساب دے جاؤ

سفید بال ہیں ان کے ہے گنجا سر میرا
مجھے دو ٹوپی انہیں تم خضاب دے جاؤ

دے جائے جوتے مرے ماہتاب سے کہنا
قمیض میری مجھے آفتاب دے جاؤ

حکیم جی مجھے معجون کی ضرورت تھی
کہا تھا کب تمہیں میں نے جُلاب دے جاؤ

دغا فریب ہو دھمکی کہ طعنہ اے نایابؔ
تمہیں جو بھی ہے دینا وہ بے حجاب دے جاؤ

روبینہ شاہین بیناؔ

چل رہی ہے جو آج کل گپ شپ
دال دلیا ہے پل دو پل گپ شپ

فیس بک پر ہزار مسئلے ہیں
اور ہر مسئلے کا حل گپ شپ

فقرے کستے ہیں ایک دوجے پر
ہوتی رہتی ہے برمحل گپ شپ

گویا یہ بھی ہے دفتری کھاتہ
بزم یاراں میں ہے لعل گپ شپ

پہنچتی ہے میاں سے میاؤں تک
کس طرف جاتی ہے نکل گپ شپ

ہائے کیا ہو جو لیک ہو جائے
نند بھاوج کی بے مثل گپ شپ

نیوز چینل کا ٹاک شو کیا ہے
کرتے رہتے ہیں دو چول گپ شپ

ہائے ہم نے کہا تھا حالِ دل
کیوں سمجھتی ہے مس کنول گپ شپ

ایک دوجے پہ پھبتیاں کسنا
کھیل ہے یا کوئی شٹل گپ شپ

چکنی چپڑی یہ گفتگو بیناؔ
کھٹا میٹھا ہے جیسے پھل گپ شپ

روبینہ شاہین بیناؔ

پہن کے ریشمی چوڑیاں عید پر
قید ہونے لگیں لڑکیاں عید پر

سب کی سب دیکھیے خوبرو، خوش گلو
عید شو میں چلیں تتلیاں عید پر

کوئی رانجھا گلی میں ضرور آئے گا
کھول دیں ہیرؔ نے کھڑکیاں عید پر

شر کے چیلے بھی آزاد ہونے کو ہیں
ٹوٹ جائیں گی یہ بیڑیاں عید پر

شوہروں کی ڈبل عید ہو جائے گی
میکے جانے کو ہیں بیویاں عید پر

چاند کی رات شاپنگ جو کرنا پڑی
دل پہ گرتی رہیں بجلیاں عید پر

عید کے دوسرے دن وہ ڈیوٹی پہ تھے
جن کو مل نہ سکیں عیدیاں عید پر

سال بھر دال دلیا جو کرتے رہے
ان کو بیناؔ ملیں مرغیاں عید پر

گوہر رحمٰن گہر مردانوی

خناس سمایا ہے ترے کاسۂ سر میں
اُودھم یہ مچا رکھا ہے جو آپ نے گھر میں

سوچے گا اگر اس طرح بچوں کے موافق
بچ پائے گا کچھ بھی نہیں اِس شور میں، شر میں

ہم اب بھی تڑپ اٹھتے ہیں یہ سوچ کے یارو
یادیں کہ چھوڑیں ہیں اُسی خواب نگر میں

شوگر کے گرفتار کو مروا دیا آخر
یہ چائے تو پھیکی نہیں، ڈوبی ہے شکر میں

اُردو میں یہ انگلش کے قوافی بھی عجب ہیں
شامل ہیں نہ مادہ میں نہ کھسرے میں نہ نر میں

اس توپ سے شاعر سے توقع یہ نہیں تھی
لیلیٰ تو زمیں پر تھی تلاشا ہے قمر میں

جب ہاتھ کو مانگا تو پری وش یہی بولی
پاگل تو نہیں! دیکھ کہاں تو ہے کدھر میں

چل شکر ہے جھنجھٹ سے تو آزاد ہوئے ہیں
زلفوں میں پھنسا رہتا تھا ہر بار گہر میں

گوہر رحمٰن گہر مردانوی

یہاں جتنی سیاستدانیاں ہیں
سبھی ووٹر کی کارستانیاں ہیں

جو کرسی پر بٹھایا، آپ بھگتو!
یہ حق خدمت تو نہیں من مانیاں ہیں

مچایا چور کا تو شور سب نے
نہ بھاگا ڈھیٹ ہے حیرانیاں ہیں

عدالت نے کیے محفوظ آخر
وہی جو فیصلے کی کاپیاں ہیں

فقط تاریخ بدلی جارہی ہے
مقدمے میں بڑی آسانیاں ہیں

فوجداری سے دیوانی بنا کر
وکیلوں کی یہی شیطانیاں ہیں

محلوں میں جو بانٹی جارہی ہے
مٹھائی ہے کہ باقر خانیاں ہیں

بھرے کھیسے میں جتنے نوٹ ہونگے
بہ خاطر عیش اور اوباشیاں ہیں

عوام الناس سارے جانتے ہیں
سیاست میں نری عیاشیاں ہیں

کمیشن پر کمیشن بن رہے ہیں
فقط بس آنیاں ہیں جانیاں ہیں

قوافی گرچہ کچھ بے جوڑ ہوں گے
مگر یہ تو گہربارانیاں ہیں

گوہر رحمٰن گہر مردانوی

ہماری جان میں in ہوگیا ہے
کوئی evil ہے یا jin ہوگیا ہے

حسیں لوگوں کو out کردیا ہے
وہ سانول eye میں pin ہوگیا ہے

بہت ہی beautiful بھی وہ نہیں ہے
مگر کیوں؟ love کا sin ہوگیا ہے

رقیب روسیاہ تھا trumph جیسا
مگر یہ معرکہ win ہو گیا ہے

گہر lion سے بکری بن گیا ہے
تری فرقت میں یوں thin ہوگیا ہے

ہاشم علی خان ہمدمؔ

تصویر دیکھ، خواب کے پیکر میں پڑ گیا
اے دل تو کس فلرٹ کے چکر میں پڑ گیا

کانٹا کسی کی یاد کا چبھتا رہا مجھے
نکلا جو میرے دل سے تو بستر میں پڑ گیا

اک روز پہلے عید منانے کے شوق میں
وہ چاند دیکھنے کو پشاور میں پڑ گیا

اپنی سہیلیوں سے وہ سر جوڑ کر ملی
لشکر جوؤں کا گیسوئے عنبر میں پڑ گیا

جعلی تھا لاٹری کا ٹکٹ میرے پاس بھی
رولا مرے نصیب کے نمبر میں پڑ گیا

اس نے تو پھیکی چائے کا اک گھونٹ ہی لیا
ہونٹوں کا لمس پیار کی شوگر میں پڑ گیا

دیکھی نہ چال ڈھال کسی نے بھی شہر میں
سو مولوی بھی مسجد و منبر میں پڑ گیا

وہ عقدِ نو کا خواب بھی اب دیکھتا نہیں
بیگم کا خوف اس طرح شوہر میں پڑ گیا

سالی سے اس کا عشق رہا اتنا کامیاب
پہلی کو چھوڑ دوسری سسٹر میں پڑ گیا

بی میم بن گئی ہے ہمارے پڑوس میں
اک اور طفل آ کے جو لشکر میں پڑ گیا

رشتہ مرے رقیب نے جھٹ پٹ کرا لیا
میں ٹوٹکوں میں، جنتر و منتر میں پڑ گیا

بکرے کے بھاؤ بک تو گیا وہ گدھا مگر
باقی بچا دماغ تھا لیڈر میں پڑ گیا

ہمدمؔ مزاج رنگ قدیم و جدید ہے
اکبر میں پڑ گیا کبھی انور میں پڑ گیا

احمد علوی

محبت جان جاناں کیوں کریں ہم
ہری جیبوں کو ویراں کیوں کریں ہم

امام الدین کو کلمہ پڑھا لیں
گجو دھر کو مسلماں کیوں کریں ہم

اگر بیوی بنادے چائے اچھی
پڑوسن کو پریشاں کیوں کریں ہم

اگر بکروں سے جنت مل رہی ہے
تو پھر اونٹوں کو قرباں کیوں کریں ہم

سبھی کی شادیاں اب ہو چکی ہیں
کسی سالی کا ارماں کیوں کریں ہم

نجانے کب بدل جائیں وہ نظریں
دکاں میں ختم ساماں کیوں کریں ہم

لکھیں سو نظم ماں کی عظمتوں پر
مگر غزلوں میں ماں ماں کیوں کریں ہم

جسے معلوم فعلن فاعیلن بس
حوالے اس کے دیواں کیوں کریں ہم

سلام ان کو ہمیشہ ٹھوکتے ہیں
ترے ابا کو نالاں کیوں کریں ہم

نہیں ہمت اگر سچ بولنے کی
بنا مطلب ہی ہاں ہاں کیوں کریں ہم

وہاں پریاں ہزاروں منتظر ہیں
یہیں دست و گریباں کیوں کریں ہم

ابنِ منیب

کہیں مطلع نہیں ہوتا، کہیں مقطع نہیں ہوتا
غزل کے نام پر صاحب، یہاں کیا کیا نہیں ہوتا

ہماری بے خودی ہے یہ، کہ تم آسیب ہو جاناں؟
وہاں ملتا ہے پیمانہ، جہاں رکھا نہیں ہوتا

ہزاروں غم ہیں دنیا میں، مگر شاعر کا غم اِتنا
جو اچھا شعر سنتا ہوں، وہ شعر اپنا نہیں ہوتا

بہت سچے تو ہیں بچے، مگر ہیں عقل کے کچے
خدایا عقل دے اِن کو، کہ سچ اچھا نہیں ہوتا

سنی جب چاپ قدموں کی، رفو چکر ہوئے دونوں
کہ عشق اندھا تو ہوتا ہے، مگر بہرا نہیں ہوتا

تلفظ وَزن ہے اِس کا، مجھے معلوم ہے لیکن
یہاں میں وَزن باندھوں تو وَزَن پورا نہیں ہوتا

نیاز احمد مجازؔ انصاری

کس کو کہہ دوں کون ہے اچھی غزل
ایک ہے کالی تو اک کانی غزل

ناشتے کی میز پر بیٹھی غزل
لنچ میں بھی رہ گئی بھوکی غزل

جو نہ پڑھنے کو ملے کیسی غزل
لکھنوی ہو یا ہو دہلی کی غزل

چوم لیتا میں ردیف و قافیہ
میرے آنگن میں اگر رکتی غزل

ہو گئی اغوا یا شاید کھو گئی
آپ نے دیکھی کہیں میری غزل

کاش ہم بھی شاعرہ ہوتے جناب
ہم جہاں سے چاہتے ملتی غزل

گھر مرا بھوتوں کا ڈیرہ ہو گیا
بھوتنی پر میں نے کیا کہہ دی غزل

ہوٹ کر کے آج مجھ کو دیکھ لو
آج میں لایا ہوں ملتانی غزل

سو گئی بھوکی وہ دسترخوان پر
سامنے بیگم کے جب چھیڑی غزل

آجکل ہونے لگی ہے پارسل
برقیاتی شعر کی چینی غزل

باپ کا مقطع کبھی بدلا نہیں
آج بھی پڑھتا ہوں میں اپنی غزل

میں مجازؔ استاد کیسے بن گیا
میں نے میٹر سے کہاں ناپی غزل

نورؔ جمشید پوری

آتا نہیں تھا، مرغ پکانا پڑا ہمیں
عیبوں کو اپنے خود ہی چھپانا پڑا ہمیں

تعریف اُن کی ہم پہ جو لازم ہوئی تو پھر
روٹی جلی تھی، چاند بتانا پڑا ہمیں

بارات میں کیا نہ جو مدعو جناب نے
آنے کا اک بہانا بنانا پڑا ہمیں

دعوت میں اتنا کھا لیا کل شام اور پھر
کھا کھا کے ہاجمولا پچانا پڑا ہمیں

محفل میں اپنی غزلیں سنانے کی چاہ میں
سب کو پکا کے کھانا کھلانا پڑا ہمیں

ملنے کا پھر بہانہ، نہ کوئی نکال لے
اس کا ہر اک حساب چکانا پڑا ہمیں

ہولی کے بعد بیٹے کی اپنے، تلاش میں
بچوں کا کتنے مونھ دھلانا پڑا ہمیں

بن کر کے ان کی شادی میں سالی جو ہم گئے
دولہے کا ایک جوتا چرانا پڑا ہمیں

مقصد دلوں میں خوف بڑھانا تھا نورؔ کا
ہر ایک پر ہی دھونس جمانا پڑا ہمیں

ذیشان فیصل شانؔ

مجموعی طور پر ہے اچھا برا ہمارا
راحیل اور مشرف اب باجوہ ہمارا

ایسے ججوں سے ہم نے امید کیوں لگائی
ان میں سے کون دل تھا یا پھیپھڑا ہمارا

یوں منتظر تھی ساری یہ قوم فیصلے کی
ان کا نہیں ہو جیسے ہو فیصلہ ہمارا

سنتے ہی فیصلے کو بیوی سے کہہ دیا تھا
جاگے ہوئے ہیں کب سے بستر لگا ہمارا

چین و عرب سے یاری مسلم کی معتبر ہے
لیکن جو تیسرا ہے دشمن رہا ہمارا

محسن تھے جو وطن کے بیکار گھومتے ہیں
ہر سانپ آستیں کا ہے رہنما ہمارا

جمہوریت کی خاطر بیلے تمام پاپڑ
حالانکہ بس خلافت تھا راستہ ہمارا

دیتے ہیں داد سب کو پر شان کو گلہ ہے
چولھے میں ڈالتے ہیں لکھا پڑھا ہمارا

شاہین فصیح ربانی

غزل کا ربط کسی صاحبِ کمال سے ہے
بھری ہوئی جو مضامینِ پائمال سے ہے

کہاں کوئی بھی شکایت ہمیں خیال سے ہے
مسابقہ تو یہاں قافیے کے کال سے ہے

قلم پڑھے لکھے ہاتھوں میں زیب دیتا ہے
ہمارا کام کلہاڑی سے اور کدال سے ہے

جو سالِ حال نے پوچھا نہیں تو کیا غم ہے
”بہت امید مجھے آنے والے سال سے ہے“

غرض نہیں اسے ابا میاں کی صحت سے
غرض فقط اسے ابا میاں کے مال سے ہے

بزرگو! آپ بزرگی بہ عمر ناپتے ہیں
یہ مرتبہ تو میسر سفید بال سے ہے

یہ تیرا لہجہ کریلا ہے وہ بھی نیم چڑھا
فصیح سامنا تیرا شکر مقال سے ہے

عابد محمود عابدؔ

ہر طرح سے کریں کور سیلفی
لینے دیتی نہیں لور سیلفی

جا گرے تھے کسی گٹر اندر
لے رہے تھے وہ بے خبر سیلفی

قُرب کا دل نشیں بہانہ ہے
روز بنتی ہے تازہ تر سیلفی

تالیاں بج رہی ہیں فوٹو میں
لگ رہی ہے کھسر پھسر سیلفی

ندی کے پانی میں اداؤں سے
روز لیتے ہیں سب شجر سیلفی

یُونی کے کونے کونے میں دیکھا
کھینچتے ہیں نیو کمر سیلفی

اب کوئی کام کاج کرنے دے
بخش بھی دے ہمیں ڈیر سیلفی

اپنی اماں کے ساتھ لینے سے
بن گئی ایک معتبر سیلفی

مالکن ہے دُکان کی دل کش
ساتھ لیتے ہیں کسٹمر سیلفی

بھیجنا آج تم بنا کے ہمیں
خوب میک اپ کے آفٹر سیلفی

چائے کے ساتھ ہر کوئی عابدؔ
لیتا ہے اب زیادہ تر سیلفی

فوزیہ اختر رداؔ

راز دل کے خفیف کہتے ہیں
ایسے لوگوں کو thief کہتے ہیں

کان دھرتے نہیں ہیں باتوں پر
چاہے کچھ بھی حریف کہتے ہیں

جو بلند ہیں وہاں مراتب میں
لوگ اُن کو ضعیف کہتے ہیں

دل میں جذبات کا سمندر ہے
بات دل کی brief کہتے ہیں

نوش فرماؤ گے بھلا کیسے
گوشت جس کو وہ beef کہتے ہیں

اب تماشائیوں کو دنیا میں
اے رداؔ کیا حلیف کہتے ہیں؟

ڈاکٹر منظور احمد

قطرہ سمجھ لیا تھا، سمندر میں پڑ گیا
یہ کیسی بدنصیبی کی ٹھوکر میں پڑ گیا

میں نے کسی کی جیب کبھی گرم کی نہیں
میرا ہر ایک کام مؤخر میں پڑ گیا

کیا کیا نہ تہمتیں جو مجھے جھیلنی پڑیں
بھولے سے میرا بٹوہ جو دفتر میں پڑ گیا

اِس فون کال آئی کہیں سے جو کل مجھے
جھاڑو سے یوں پٹا کہ میں بستر میں پڑ گیا

پکڑا گیا جو جیب کوئی سیندھتے ہوئے
گالوں پہ ہاتھ بھاری تواتر میں پڑ گیا

قسمت تو آپ دیکھیے بوڑھے مریض کی
ٹی بی کے بچ کے نکلا تو شوگر میں پڑ گیا

پیشنٹ کسی بھی طرح نہ بیہوش ہو سکا
سرجن یہ سین دیکھ کے تھیٹر میں پڑ گیا

پہلے شمار ہوتا رہا ہوں میں خاص میں
اب ذکر میرا دیکھیے دیگر میں پڑ گیا

کارِ سہل نہیں ہے کہ پہچان کر سکیں
یکساں سا حلیہ مادہ و نر میں پڑ گیا

ہر بار ہارتا ہوں محبت کی لاٹری
منحوس آنکڑا کیا مقدر میں پڑ گیا

پیٹا رہا نہ جانے وہ کیا کیا تمام شب
دن بھر ہر ایک شخص کی ٹھوکر میں پڑ گیا

نوکر سمجھ رہا تھا میں خاتون کا جسے
ہسبنڈ جو اس کا نکلا میں چکر میں پڑ گیا

منظورؔ میرے پاؤں کی حالت نہ پوچھیے
غلطی سے ننگے بجلی کے ہیٹر میں پڑ گیا

دلشاد نسیم

شیروں کا پیار دھاڑنا، گیدڑ کا پیار چپ
بیگم کے سامنے ہے میاں کی کچھار چپ

لگتا ہے زندگی کا کنکشن خراب ہے
رہتے ہیں میرے دل کے کبھی تار وار چپ

گو جانتے ہیں بے ضرر کردار کو مگر
ممنون ہیں صدارتی امیدوار چپ

تجھ پر بھی اقتدار کا نشہ سوار ہے
تجھ پر کرے گی قوم نہیں اعتبار چپ

خوش ہیں کہ پھر کوئی نیا ٹینڈر ملے انہیں
سڑکوں کی ٹوٹ پھوٹ پہ ہیں ٹھیکے دار چپ

لگتا ہے ان کے ساتھ ہے سیٹی ملی ہوئی
چوروں کی واردات پہ ہیں تھانیدار چپ

خاموش ٹاکیوں کا پرانا چراغ ہے
ہر کھیل میں رہا ہے جو ٹی وی سٹار چپ

شوہر نہیں ہے گھر پہ تو بیگم خموش ہے
اتوار بولنے میں کتنا سوموار چپ

یہ عشق ہے جناب کہانی تو ہے نہیں
میں نے بھی یہ کسی کو سنانی تو ہے نہیں

کس واسطے چھپاتے رہے ہو تمام عمر
عینک نظر کی ہم نے چرانی تو ہے نہیں

رکھتے ہو کیوں سنبھال پرانے یہ کاغذات
محبوب گمشدہ کی نشانی تو ہے نہیں

ہوٹل میں لے کے آگئے تم مجھ کو کس لئے
دعوت یہاں پہ تم نے کھلانی تو ہے نہیں

ان ڈگریوں کو گھول کے پی جاؤں میں مگر
صحرا میں رہتے ہیں یہاں پانی تو ہے نہیں

اب ویڈیو پہ دیکھ لو محبوب جان کو
تصویر اس نے اپنی چھپانی تو ہے نہیں

کرتے ہو کیوں مذاق مری فائلوں کو تم
ہیں ورڈ کی یہ کوئی پرانی تو ہے نہیں

رخ کیوں کروں میں دریا کے پانی کا ایک دن
سوہنی کے ڈوبنے کی کہانی تو ہے نہیں

بچوں کو چھٹیاں ہیں تو ماں کو یہ فکر ہے
مصروف کیسے رکھوں گی نانی تو ہے نہیں

کیوں کر پڑھوں کیمسٹری اُردو کو چھوڑ کر
اب اس میں کوئی چیز سہانی تو ہے نہیں

پنجاب جائیں کس لئے صحرا کو چھوڑ کر
دریا کے پانیوں میں روانی تو ہے نہیں

پڑھ پڑھ کے میں تو پاگلوں میں ہو گیا شمار
اب بس کرو کہ عمر گنوانی تو ہے نہیں

اب بس کرو یہ شاعری چھوڑو بھی اب صنم
اس دن کو اس نے جان بچانی تو ہے نہیں

اسا نغنی مشتاق رفیقی

شریفاں سر جھکائے بیٹھے ہیں کچے مکانوں میں
رذیلاں اڑ رہے ہیں سینہ تانے آسمانوں میں

منافق جیت کر بخشیں گے زینت تختِ شاہی کو
چنے بیچیں گے اب مومن شرافت کی دُکانوں میں

خطیبِ شہر بھی خطبے میں ان کا ذکر کرتے ہیں
سنا ہے شہر کا حاکم بھی ہے اب ان کے خانوں میں

جہاں ہوتی ہے بندر بانٹ عہدے اور کرسی کی
مجھے دشمن گنا جاتا ہے ان دیوان خانوں میں

کنول کا پھول ہیں وہ، جھیل کی زینت انہی سے ہے
زمانہ یاد رکھے گا انہیں اپنے فسانوں میں

اِلیکشن پھُسپھُسا ثابت ہوا، اس بار یاروں کو
نہیں تھا کوئی جوش و ولولہ اُن کے بیانوں میں

نہ خوشبو کا ہوا درشن، نہ کوئی ہیروئن آئی
بڑی مایوسی دیکھی اے رفیقؔ، نوجوانوں میں

شوکت جمال

نہیں جچتے ہیں اُن کو یہ گلابی رنگ کے کپڑے
تقاضا عمر کا اب ہیں سلیٹی رنگ کے کپڑے

تھے جن کے تن پہ مقتل میں کلیجی رنگ کے کپڑے
پہن کر آئے میت پر سیاہی رنگ کے کپڑے

ہو کابینہ کا جلسہ تو فرنگی سوٹ لازم ہے
کہ چبھتے ہیں وزیروں کو یہ دیسی رنگ کے کپڑے

عنایت ہے یہ ٹی وی کی کہ اب مفتی و واعظ بھی
نظر آتے ہیں پہنے سب عجب ہی رنگ کے کپڑے

اسمبلی کی ہر اِک خاتون ممبر کو پریشانی
کہ پہنے سُرخ، نیلے یا فروزی رنگ کے کپڑے

چلا جب کام نہ شوکت کا شائستہ لباسی سے
بنا سادھو پہن کر زعفرانی رنگ کے کپڑے

محمد خلیل الرحمٰن خلیل

مرا یہ سال تو گزرا بڑے ملال سے ہے
بہت اُمید مجھے آنے والے سال سے ہے

منی ٹریل کا نام و نشاں ملے کیسے
کہ ربط اس کا تو قطری کے اب ریال سے ہے

مجھے مٹھائی کی اب شاپ کھولنا ہو گی
کہ آج کل یہی دھندہ بڑے کمال سے ہے

کہاں کمال سیاست ہے کرسیوں کے لئے
یہاں پہ رونقِ مسند کھلے سے مال سے ہے

ابھی میں ہاتھ لگانے لگا تھا بتی پر
کہا کہ شرط ٹرک کی کسی بھی چال سے ہے

نہ میٹرو سے نہ اورنج ٹرین سے مطلب
سوال اپنا اُسی آف شور مال سے ہے

مری تو ڈیٹ کی ہر چال ہی فلاپ ہوئی
مرا رقیب جو کلبھوشنوں کی چال سے ہے

مشاعرے سے ہمیشہ وہ بھاگ جاتا ہے
یہ سب کمال خلیل اس چنے کی دال سے ہے

نوید ظفر کیانی

میرے پلے نہ پڑی تیری ادا عید کے دن
تو نے مس کال میں کیا مجھ کو کہا عید کے دن

تیرے گھر سے بھی میں ہو آیا میاںِ شیخاں
گھوریاں ڈالے رہا تیرا پپا عید کے دن

حُسن جلوؤں کے کئی رنگ لئے آیا تھا
دل ٹھرکی میرے ہاتھوں سے گیا عید کے دن

تنگ کتنوں کو کیا، جب بھی پہن کر آیا
جامۂ تنگ کوئی جانِ حیا عید کے دن

کتنے شبہات سرِ دیدۂ زوجہ دیکھے
جب بصد شوق میں تیار ہوا عید کے دن

تیرے شاعر کی وہیں چیخ نکلتے دیکھی
روزہ خوروں سے جہاں عید ملا عید کے دن

لوٹ لیتے تیرے بچے بھی بنامِ عیدی
میں نہ بن جاتا اگر چکنا گھڑا عید کے دن

وہ غرارے میں تھی سو میں نے بھی تہمد پہنا
یونیفارم ایک محبت کا رہا عید کے دن

نفسِ امارہ کا روزہ سرِ رمضان رہا
سب نے دل کھول کے افطار کیا عید کے دن

لے اُڑا جوتی مری کوئی بطورِ عیدی
برہنہ پاؤں میں مسجد سے چلا عید کے دن

دورِ پیزا کی ہے یہ پود، بھلا کیا جانے
کیسا لگتا ہے سویوں کا مزا عید کے دن

نوید ظفر کیانی

مارے پتھر تو سدا بم سے سواگت کرنا
جو بُرا تم سے کرے اُس سے بھلا مت کرنا

زور گوئی کی مہارت ہے ترے بیٹے میں
اُس سے کہنا کہ بڑا ہو کے وکالت کرنا

اک ذرا دل کی عدالت میں اُسے لے آنا
حُسن کے کیس کی روزانہ سماعت کرنا

کارنامۂ عدو ہے وہی دہشت گردی
اور اپنا ہے وہی کام مذمت کرنا

راگ دربار کے گاتا ہے اگر تو دِن بھر
راگ درباری کی شب کو بھی ریاضت کرنا

جیسا دل لیتے ہیں ویسا کہاں لوٹاتے ہیں
ہے خوئے حُسن امانت میں خیانت کرنا

جانے اس دور کے لیڈر کو سکھائی کس نے
اس طرح ساس بہو والی سیاست کرنا

پھوٹ دینا کبھی سچ بات بھی منہ سے ظالم
زندگانی میں ہمیشہ نہ صحافت کرنا

میرا دل خوں بھی جو ہونا تو مقدمہ خارج
اُس کی انگلی بھی جو کٹتی تو عدالت کرنا

بزمِ جاناں سے رقیبوں کا صفایا ہو جائے
اپنے حصے کا یہی کارِ طہارت کرنا

جاگتے میں جو کُڑک مرغی بنا پھرتا ہو
اُس کا خراٹے بھی لینا ہے عبادت کرنا

لیڈرِ قوم کے ذمے ہے فریضہ کب سے
بیوقوفانِ ریاست کی قیادت کرنا

باندھ کر آنا بصد ناز و مسرت سہرہ
اپنی بربادی کی تقریب میں شرکت کرنا

مجھ کو مجبور کیا رنگِ زمانہ نے ظفر
نغز گوئی میں فقط طنز و ظرافت کرنا

ریاضؔ احمد قادری

بڑھاپے میں بھی جو عہدِ شباب ڈھونڈتے ہیں
وہ گڑ کے پانی میں موجِ شراب ڈھونڈتے ہیں

حکیم مانو انہیں یا انہیں کہو مجنوں
چنبیلیوں میں جو برگِ گلاب ڈھونڈتے ہیں

ہمیں جو کرنا ہو بے ہوش سب مریضوں کو
تو اپنے گھر سے پرانی جراب ڈھونڈتے ہیں

وہ کون لوگ ہیں آئے مرے ولیمے میں
جو آلو گوبھی کی ڈش میں کباب ڈھونڈتے ہیں

وہ کس طرح سے بھلا پاس ہو سکیں گے کبھی
جو امتحان کے اندر کتاب ڈھونڈتے ہیں

ملے گی کس طرح جنت انہیں بتاؤ ذرا
جو قتل کر کے ہمیں اب ثواب ڈھونڈتے ہیں

ریاضؔ کیسے وہ ان جان ہیں زمانے میں
جو تیری آنکھ سے بچنے کی تاب ڈھونڈتے ہیں

ریاضؔ تیغ سے نینوں کا کیا علاج کریں
جو قتل کرتے ہیں پھر بھی نقاب ڈھونڈتے ہیں

ریاضؔ احمد قادری

کیسا ہے شخص خوب نہایا ہے عید پر
یوں رنگِ حسن اس نے دکھایا ہے عید پر

پورا برس نصیب میں بوٹی نہیں ہوئی
مرغا بھی سال بعد ہی کھایا ہے عید پر

بارہ مہینے دور رہا وہ نماز سے
مسجد میں آج چل کے وہ آیا ہے عید پر

بچے رہے ہیں گھر میں مقید جو پورا سال
اب ان کو چڑیا گھر میں وہ لایا ہے عید پر

سرخی نہ لالی اور نہ شیمپو وہ لے سکا
بیگم نے اس کی منہ کو سجایا ہے عید پر

پورا برس ہے پہنا پرانا لباس ہی
اب اس نے ایک سوٹ سلایا ہے عید پر

بیگم کو اس نے سیر کرائی نہیں کبھی
اب اس کو لے کے شہر میں آیا ہے عید پر

بچے ہمیشہ ٹکڑوں پہ پلتے رہے تمام
کسٹرڈ کے ساتھ حلوہ دلایا ہے عید پر

کھاتے رہے ہیں جھڑکیاں بچے جو سال بھر
لیکن اب عید کیک کھلایا ہے عید پر

چپ چاپ منہ پھلا کے جو بیٹھا رہا ریاضؔ
اس نے خوشی کا گیت بھی گایا ہے عید پر

سید فہیم الدین

ہتھیلیوں میں تھا مگر نصیب سے نکل گیا
ذرا وہ کچھ قریب ہی قریب سے نکل گیا

جو سرجنوں کے باپ سے نکل سکا نہ دوستو!
وہ تیر دل کے اپنے ہی طبیب سے نکل گیا

کبھی جو رازِ دل بیاں کیا تھا بزمِ یار میں
وہ دشمنوں کے سامنے حبیب سے نکل گیا

میں سوچتا رہا کہ جھوٹ کی میں انتہا کروں
مگر یہ واقعہ کسی خطیب سے نکل گیا

گراں ہوا جو مال تو یہ فائدہ ہوا مجھے
روپے کا جو وبال تھا، غریب سے نکل گیا

وہ ایک دن جو پارلر کے راستے میں تھا رواں
اسے لگا وہ کوچۂ عجیب سے نکل گیا

سید فہیم الدین

سگانِ شہر ہیں پیچھے ہمارے شام کے بعد
تری گلی میں نہ آئیں گے تام جھام کے بعد

جو کہہ رہے تھے وطن پر وہ جان دے دیں گے
تو یہ بھی یاد رہے، دیں گے وہ عوام کے بعد

برائے جاب میں بھرتی ہوا تھا گھر داماد
گریڈ اب کہ ہے نوکر مرا غلام کے بعد

یوں تیرے ساتھ تو پکا ہے وعدۂ شادی
کچھ اور نام بھی دل میں ہیں تیرے نام کے بعد

یہ مانتے ہیں کہ کھانے کو پہلے بیٹھ گئے
فہیم اُٹھیں گے ہم بھی اب اُن تمام کے بعد

حافظ مظفر محسنؔ

پانچ کروڑ لے لو!

دوسری قسط

اِس طرح الماری میں سے ایک بڑا سا شاپر فرش پر گر پڑا جس میں کچھ جانوروں کے پر تھے اور ایک بوسیدہ قسم کا ''اُلّو'' کا سر بھی تھا، میں پیچھے ہٹ گیا۔۔۔اُس نے میرے چہرے کا جائزہ لیا اُسے یقین تھا کہ میں یہ دیکھ کر خوفزدہ ہوا ہوں گا لیکن اُسے درحقیقت اس بات کا احساس بھی تھا کہ میں ایسی چیزوں سے گھبرانے والا نہیں ہوں کیونکہ تیرہ سال پہلے اُس نے مجھے نہ جانے کیوں ہر پہلو سے ٹٹولا تھا۔شروع میں مجھے اس بات کا احساس نہیں تھا کہ وہ مجھے کیوں اس طرح ہر وقت اپنی نظروں کے سامنے رکھنا چاہتی ہے، بعد میں مجھے اُس دن اس بات کا احساس ہوا جس دن اُس نے باتوں ہی باتوں میں بلکہ مذاق ہی مذاق میں آہستہ سے کہا ''کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ ہم دونوں زندگی ایک ساتھ گزار لیں۔''۔۔۔میں نے اُس کو معنی خیز نظروں سے دیکھا اس دوران ہمارے سامنے ایک کار بس کے نیچے جا گھسی اور ایک شور برپا ہوگیا اور ہمارے گفتگو کا رُخ بھی تبدیل ہوگیا۔۔۔میں زخمیوں کو بس میں سے نکالنے والوں کے ساتھ جا کر شریک ہوگیا۔ جب میں واپس آیا تو اُس نے میرے کندھے پہ تھپکی دی اور ہنستے ہوئے بولی ''انسانیت سے تمہارا یہ لگاؤ اور اللہ کی مخلوق سے محبت کرنا مجھے ہمیشہ ہی اچھا لگتا ہے'' میں نے اُس سے پوچھا کہ پرندوں کے پر کس لیے رکھ چھوڑے ہیں اب تو تمہیں ایبٹ آباد کے کسی سردار سے بھی مقابلہ نہیں کرنا پھر بھی تم اس طرح کے چکروں میں کیوں الجھی رہتی ہو۔۔۔؟

اُس نے مجھے ایسے دیکھا جیسے وہ مجھے گھور رہی ہو اور غصہ دکھانا چاہ رہی ہو۔

''تم پریشان ہو؟''

''اس میں پریشانی والی تو کوئی بات نہیں، رہی بات ایبٹ آباد والے سردار کی اس میں شک نہیں کہ اُس نے مجھے نیچا دکھانے کے لیے سردھڑ کی بازی لگا دی لیکن میں نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں یہ اُس کا خیال تھا کہ وہ اپنے تجربے کے زور پر مجھے کسی کھائی میں گرا ڈالے گا یا کسی دریا میں ڈبو دے گا لیکن حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ شاید کسی دریا میں مچھلیاں اُس کی لاش چبا رہی ہوں!'' یہ بات اُس کے منہ سے نکلتے ہی اُس کا رنگ فق ہوگیا شاید وہ بے خیالی میں یا جذباتی انداز میں ایسا کچھ کہہ گئی جو اُسے نہیں کہنا چاہئے تھا یا شاید وہ اپنی کسی بڑی غلطی کا اعتراف کر گئی ۔۔۔میں نے چلنے کا کہا تو وہ بولی ''میں نے صبح سے کچھ نہیں

کھایا! آؤ اکٹھے کھانا کھاتے ہیں ہمارے درمیان صدیوں سے ایک رشتہ قائم ہے میں نے بار ہا تجھے یہ سب بتانا چاہا مگر افسوس ہر بار تم نے میری باتوں کو مذاق سمجھا یا شاید تمہاری کوئی مجبوری تھی کہ تم چاہتے ہوئے بھی وہ سب کچھ نہ کہہ پائے جو تمہاری آنکھوں سے محسوس ہوتا تھا اور میں نے کئی بار تمہاری آنکھوں میں لکھی تحریریں پڑھیں اور انتظار کیا کہ جلد یا بدیر تم وہ سب کچھ کہہ ڈالو گے اپنے اُن خیالات کا جذبات کا اظہار کر ڈالو گے جن پر تم نے نہ چاہتے ہوئے بھی بند باندھ رکھا ہے۔''

اُس دوران اُس نے مجھے اشارے سے چلنے کو کہا ''ہم دونوں رات گئے آہستہ آہستہ چلتے ہوئے گھر سے باہر آ گئے جہاں اُس کی نہایت مہنگی اور Latest ماڈل گاڑی کھڑی تھی۔''

''تم تو ہمیشہ COROLLA گاڑی رکھنے کی عادی ہو یہ بڑی گاڑی کیوں رکھی یقیناً کسی اچھے انسان نے گفٹ کی ہوگی؟''

اُس نے ٹھنڈی آہ بھری اور خلاؤں میں گھورنے لگی اس دوران اُس نے چابی تھماتے ہوئے مجھے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔۔۔ میں نے اُس کو یوں Show کیا جیسے میں بڑی گاڑی چلانے سے ہچکچا رہا ہوں۔ اُس نے میرے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھتے ہی سنجیدہ انداز میں کہا ''شاید تم پہلی بار اتنی بڑی گاڑی ڈرائیو کرنے لگے ہو؟''

میں سمجھ رہا تھا کہ وہ مجھے کس بات کا احساس دلانا چاہ رہی ہے اور اُس کے پیچھے کیا فلسفہ ہے۔

''فورٹیرس'' ٹھیک رہے گا ''نہیں'' اُس نے اپنے ہی انداز میں باہر دیکھتے ہوئے بے خیالی میں کہا۔

''پھر کدھر چلیں؟''

''گاڑی موٹروے پر ڈال دیں''

''کتنے دن کا پروگرام ہے؟''

''نہیں نہیں۔۔۔ ذرا رات میں تمہاری ڈرائیونگ کے انداز دیکھنے ہیں اور کسی اچھے ''سروس ایریا'' پہ کھانا کھائیں گے!''

دریائے راوی پار کرنے کے بعد اُس نے شاید سوچے سمجھے منصوبے کے تحت بے خیالی میں پوچھا ''پھر کیا سوچا ہے؟''

کچھ جون ایلیا کے بارے میں

اُسی نشست میں بھائی جون نے اظہارِ محبت کے طریقے میں وہی جُملے دہرائے جو وہ اپنے مجموعہ "شاید" کے دیباچے میں لکھ چکے ہیں۔ (میں نے ان سے پوچھا کہ آپ محبت کا اظہار کیسے کرتے ہیں تو اس کے جواب میں انہوں نے جواب دیا)، وہ یہ کہ محبوبہ اگر سامنے سے آ رہی ہوتی تو میں اس کی طرف سے منہ پھیر لیتا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اے لڑکی! میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ انہوں نے گردن موڑ کر اور دائیں ہاتھ سے بائیں آنکھ ڈھک کر بتایا کہ وہ منہ پھیر کر اس طرح شدید محبت کا اظہار کرتے ہیں (خواتین اسے نوٹ کر لیں!)۔ فرمایا کہ شریف مرد اور باعصمت عورتیں اسی طرح اعلانِ محبت کرتی ہیں۔ اظہارِ محبت کا یہ طریقہ معلوم کر کے مجھے جو مسرّت ہوئی وہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ ساری بدگمانیاں دور ہو گئیں۔ میں صبح سویرے ساحلِ سمندر پر ٹہلنے جاتا ہوں۔ میں بھی تو کہوں کہ یہ خوش شکل خواتین، مجھے آتا دیکھ کر کبھی پلّو کھینچ کر اور کبھی منہ پھیر کر دوسری طرف کیوں دیکھنے لگتی ہیں۔۔۔!

مشتاق احمد یوسفی

''کس بارے میں؟''

''وہی جو پانچ کروڑ روپے میرے پاس پڑے ہیں؟''

''آپ کا ارادہ کیا ہے؟۔۔۔ ان پیسوں کو کیا کرنا ہے آپ کے ذہن میں ان کا کوئی مصرف ہے یا ابھی کوئی منصوبہ بندی کرنا ہے؟''

''اصل میں میں نے زندگی کا ہر بڑا فیصلہ تمہاری مشاورت سے ہی کیا ہے اور میرا اس بات پر عقیدہ اب مزید پختہ ہو چکا ہے کہ تم مجھے کبھی بھی ایسا مشورہ نہیں دو گے؟ ایسا راستہ نہیں دکھاؤ گے جو مجھے پھر سے بھٹکنے پر مجبور کر دے یا کسی بے منزل سفر پہ ڈال دے۔''

میں نے دل ہی دل میں سوچا یہ میری خوشامد کر رہی ہے یا مجھے کسی جال میں پھسانے کا ارادہ ہے؟

اس دوران میں نے گاڑی کی رفتار پہلے سے کہیں زیادہ تیز کر دی۔

''آپ کو جلدی ہے؟ پہلے تو میرے ساتھ سفر کرتے ہوئے آپ نے کبھی گاڑی اس قدر تیز اور احمقانہ انداز میں نہیں چلائی؟''

''نہیں نہیں...... ویسے ہی سڑک اچھی ہے اور رات کے پچھلے پہر عام طور پر اگر میں سو نہ سکوں تو پھر مجھے صبح تک نیند نہیں آتی اور

میں پوری طرح الرٹ ہو جاتا ہوں جیسے آدمی آٹھ گھنٹے نیند پوری کر کے جاگا ہو اس لیے یوں سمجھو کہ میں فریش ہو کر گاڑی چلا رہا ہوں ضروری نہیں کہ ہم پہلے ''سروس ایریا'' پر ہی رُکیں، ہو سکتا ہے ہم کسی پہاڑی مقام پر جا کر رُکیں ویسے پنڈی سے چالیس پچاس کلومیٹر پہلے جو ''سروس ایریا'' آتا ہے وہ نہایت خوبصورت ہے اور مجھے ایسے لگتا ہے جیسے وہاں کوئی دوسری مخلوق بھی اُن چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں میں موجود ہے اور مجھے باقاعدہ اُس دوسری مخلوق کا چلنا پھرنا وہاں محسوس ہوتا ہے اور عام طور پر جب بھی میں وہاں جا کر رُکا ہوں میرا وہاں سے آنے کو دل نہیں چاہتا۔

''اچھا'' اُس نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ اس دوران اُس کے چہرے پر خوف کے آثار نمایاں تھے۔

میں نے گاڑی کی رفتار پہلے سے مزید تیز کر دی۔

''چالان نہ ہو جائے!!'' اُس نے ڈرتے ہوئے غیر ارادی طور پر کہا۔

''میں نے دو چالانوں کے پیسے جب بھی موٹروے پر سفر کرتا ہوں اپنی جیب میں رکھے ہوتے ہیں اور کبھی اپنی مرضی کے خلاف موٹروے پر گاڑی نہیں چلاتا۔۔۔اس حوالے سے میرا فلسفہ یہ ہے کہ اتنی اچھی موٹروے نواز شریف نے صرف پابندیاں لگانے کے لیے نہیں بنائی اُس نے یہ سڑک شہزادوں کے لیے بنائی ہے وہ الگ بات ہے کہ اس سڑک پر عام لوگ اپنی مرضی سے اپنی ضرورت کے مطابق سفر کریں لیکن یہ سفر عام لوگ بھی ''انجوائے'' ضرور کرتے ہوں گے۔''

''مجھے تمہارا اس طرح سے موڈ چینج کر لینا ہمیشہ سے اچھا لگتا ہے اور بہت سی خوبیوں کے علاوہ تمہاری ایک یہ والی خوبی تمہیں دوسروں سے کہیں نمایاں کر دیتی ہے کہ تم جب بھی موڈ میں ہوتے ہو تو پھر تمہارے اندر کا خوبصورت انسان بھی جاگ اُٹھتا ہے جو ایک پورے مرد کے اندر پوشیدہ ہوتا ہے اور دنیا دار لڑکیوں کو ایسے مرد بہت پسند ہوتے ہیں اسی لیے ایک عرصہ سے تمہیں بتائے بغیر میں چپکے سے تمہارا پیچھا کرتی چلی آ رہی ہوں۔''

اس دوران بائیں طرف دیکھتے ہوئے اُس نے مجھے کہا ''وہ دیکھو۔۔۔لائیٹ جل رہی ہے، اس ویرانے میں رات کے پچھلے پہر یہ لائیٹ کیسی ہے'' میں نے بھی گاڑی کی رفتار آہستہ کر دی اور اُس لائیٹ کی طرف توجہ دی۔

''میرے خیال میں یہاں کوئی بزرگ، اللہ والے رہائش پذیر ہیں۔''

اس دوران اُس نے آنکھیں بند کر لیں اور بولی ''تم کیا سمجھتے ہو یہ بزرگ۔۔۔اللہ والے ویرانوں میں کیوں ڈیرے جماتے ہیں؟''

''تم رات گئے چھت پر کیوں خاموشی سے عبادت کرتی ہو حالانکہ تم اپنے کمرے میں بھی عبادت کر سکتی ہو؟''

''میری بات چھوڑو!!''

''آج کچھ بتاؤ اپنے بارے میں۔۔۔میں تیرہ سال سے اس کوشش میں ہوں کہ تمہیں جان سکوں لیکن تم نے کبھی مجھے سمجھنے سوچنے کا موقع ہی نہیں دیا اور نہ ہی مجھ پر کچھ واضح ہونے دیا جس سے میں تمہارے بارے میں منفی یا مثبت رائے قائم کر سکوں!''

''تو گویا اس بات کا بھی چانس ہے کہ تم میرے بارے میں ''منفی'' رائے بھی قائم کر سکتے ہو؟''

''دیکھو آج ہم جس سفر پر جا رہے ہیں اس میں ہم دونوں عہد کریں کہ ہم منافقت سے بالکل کام نہیں لیں گے اور جو کچھ دل میں ہے وہی زبان پر ہو گا آج ہم دماغ سے کام نہیں لیں گے ورنہ ہم دونوں کی ادھوری زندگیاں ادھوری ہی رہ جائیں گی اور پھر اُس کے بعد جب کبھی ہم دوبارہ ملیں گے تو سوائے پچھتاوے کے کچھ نہیں ہو گا اور پچھتاوا انسان کو موت کے منہ میں لے جاتا ہے کیونکہ پچھتاوا بہت سی ناکامیوں یا بہت سے غلط فیصلوں کے باعث انسان کے دل و دماغ پر قبضہ کر لیتا ہے اور تم سمجھتی ہو کہ تمہیں کن کن غلط یا جلد بازی میں کئے گئے فیصلوں پر پچھتاوا ہوتا ہے کیونکہ میں تمہیں تم سے زیادہ جانتا ہوں اور اس کی وجہ یہی ہے کہ میں وہ بات بہت سال پہلے کرنا چاہتا تھا جو آج تم مجھے اُمید ہے، میرے ساتھ کرو گی؟؟''

(باقی آئندہ)

م۔ ص۔ ایمن

احمقانہ سوال

مربی کے پاس ایک شخص گیا اور درخواست کی کہ میں آپ کا شاگرد بننا چاہتا ہوں، مجھے علم سیکھنے کا بہت شوق ہے۔

مُربی یعنی یہودی عالم نے کہا کہ ہم باہر کے کسی فرد کو اپنا علم نہیں دیتے صرف یہودیت کے پیروکاروں کو ہی اپنا شاگرد بناتے ہیں اور اپنا علم انہی کو سکھاتے ہیں۔

اس شخص نے اصرار کیا کہ میں آپ کا شاگرد بننے کا پکا ارادہ کر کے آیا ہوں، مجھے اپنی تعلیمات سے سرفراز فرمائیں۔

مربی بولا ''میں نے بتایا ناں کہ ہم صرف یہودی بچوں کو ہی تعلیم دیتے ہیں، ہمارا علم اتنا آسان نہیں ہے کہ ہرا پراغیرا اسے سیکھ لے!''

وہ شخص باز نہ آیا، آخر اس کے پیہم اصرار پر مربی نے اس کا استاد بننا منظور کر لیا لیکن یہ شرط رکھی کہ'' وہ اس سے تین سوال کرے گا، اگر اس نے ان تینوں سوالوں کے جوابات درست دے دیئے تو اسے اپنا شاگرد بنا لے گا۔''

وہ شخص خوش ہو گیا اور سوچے سمجھے بغیر ہی اس کے سامنے جواب دینے کی حامی بھر لی

مربی نے پہلا سوال کیا ''ایک مکان کی چمنی ہے اس میں سے بیک وقت دو آدمی گرتے ہیں ایک کے کپڑے کالک لگنے سے خراب ہو جاتے ہیں جبکہ دوسرے کے کپڑوں پر کوئی داغ نہیں لگتا۔ بتاؤ لباس تبدیل کرنے کے لیئے کون جائے گا؟''

''ظاہر ہے کہ جس کے کپڑے خراب ہوئے ہیں وہی جائے گا!'' شاگرد نے بے حد خوشی سے آسان سے سوال کا آسان سا جواب دے دیا

''غلط!'' استاد نے کہا ''جس کے کپڑے خراب ہوئے ہیں وہ دوسرے کو دیکھے گا اور سمجھ جائے گا کہ چمنی سے گرنے کے باوجود اس کے کپڑے خراب نہیں ہوئے تو میرے کپڑے بھی خراب نہیں ہوئے ہوں گے' اس لیئے وہ مطمئن ہو جائے گا جبکہ دوسرا شخص

اسے دیکھے گا کہ اس کے کپڑے خراب ہوئے ہیں تو میرے بھی خراب ہوئے ہوں گے' یہ سوچ کر دوسرا شخص لباس تبدیل کرنے جائے گا''

شاگرد نے سمجھ کر سر ہلایا وہ سمجھ گیا کہ مجھ سے جواب دینے میں غلطی ہوئی ہے اس نے شرمندگی ظاہر کی اور بولا'' مجھے اعتراف ہے کہ میں نے سوچے سمجھے بغیر جواب دیا تھا اب ایسا نہیں ہوگا آپ دوسرا سوال کیجئے۔''

استاد نے دوسرا سوال کیا'' ایک مکان کی چمنی ہے اس میں سے بیک وقت دو آدمی گرتے ہیں ایک کے کپڑے کالک لگنے سے خراب ہوجاتے ہیں جبکہ دوسرے کے کپڑوں پر کوئی داغ نہیں لگتا۔۔۔۔۔''

'' یہ تو پہلے والا سوال ہے!'' شاگرد نے بات کاٹتے ہوئے حیران ہوکر توجہ دلائی۔

'' یہ دوسرا سوال ہے پہلے سوال کا جواب تم نے غلط دیا تھا '' استاد نے تحمل سے کہا'' اب بتاؤ! لباس تبدیل کرنے کے لیئے کون جائے گا؟''

'' جس کے کپڑے صاف ہیں وہ لباس بدلنے جائے گا، کیونکہ ۔۔۔'' شاگرد نے جواب دینا شروع کیا تھا کہ استاد نے ٹوک دیا '' غلط ۔۔۔ جس کے کپڑے خراب ہوئے ہیں وہ جائے گا''

'' کیوں؟ ۔۔۔۔'' شاگرد حیران ہوگیا۔ کیونکہ پہلے اس نے یہی جواب دیا تھا تو استاد نے غلط قرار دیا تھا۔

'' وہ یوں کہ گرنے کے بعد وہ دوسرے کو دیکھے گا تو اسے احساس ہوگا کہ چمنی سے گرنے کے باوجود ہمارے کپڑے خراب نہیں ہوئے ۔۔۔ پھر وہ اپنے لباس کو دیکھے گا تو اسے اپنا لباس خراب نظر آئے گا، اور وہ لباس بدلنے چلا جائے گا جبکہ دوسرا شخص بھی بے تحقیق کپڑے بدلنے نہیں جائے گا، بلکہ اپنے لباس کو دیکھے گا اسے اپنا لباس صاف دکھائی دے گا تو وہ لباس بدلنے نہیں جائے گا'' استاد نے وضاحت کردی۔

شاگرد نے اعتراف کیا کہ واقعی ایسے ہی ہوگا۔ اس نے وعدہ کیا کہ'' اب اس بار وہ غلطی نہیں کرے گا، تیسرا سوال کیجئے!''

مربی نے تیسرا سوال کیا'' ایک مکان کی چمنی ہے اس میں سے بیک وقت دو آدمی گرتے ہیں ایک کے کپڑے کالک لگنے سے خراب ہوجاتے ہیں جبکہ دوسرے کے کپڑوں پر کوئی داغ نہیں لگتا۔۔۔۔۔''

'' یہ تو وہی سوال ہے جو آپ پہلے بھی کر چکے'' وہ بے ساختہ چلایا۔

'' یہ تیسرا سوال ہے!'' مربی مدھم لہجے میں بولا'' دو سوالوں کے جواب تم غلط دے چکے ہو!!''

کچھ نہ سمجھتے ہوئے اس نے اثبات میں سر ہلایا اور بولا '' ٹھیک ہے آپ ٹھیک ہی کہتے ہیں بات پوری کیجئے۔''

'' ایک کے کپڑے کالے ہوجاتے ہیں اور دوسرے کے کپڑے کالے نہیں ہوتے، یہ بتاؤ کہ لباس تبدیل کرنے کون جائے گا؟''

وہ بے دلی سے بولا'' وہی جائے گا۔۔ جس کے کپڑے کالے ہوئے ہیں!''

'' غلط!'' استاد فوراً بولا'' دونوں جائیں گے'' پھر وضاحت کرتے ہوئے بولا'' چمنی سے گرنے کے بعد دونوں ایک دوسرے کو دیکھیں گے، پھر اپنے آپ کو دیکھیں گے، جس کے کپڑے خراب ہوئے ہیں وہ لباس بدلنے جائے گا، اور دوسرا یہ سمجھ کر لباس بدلنے جائے گا کہ اس کے کپڑے خراب ہوئے ہیں تو میرے بھی خراب ہوئے ہوں گے، یوں دونوں ہی لباس تبدیل کرنے جائیں گے''

شاگرد بننے کے امیدوار نے مایوسی سے سر ہلایا وہ سمجھ گیا کہ مربی اسے اپنا شاگرد بنانے سے انکار کرچکا ہے، اس لیئے ایسے سوال کررہا ہے جن کے جوابات کو وہ قبول ہی نہیں کررہا۔ پھر بھی ایک موہوم سی امید تھی کہ شاید اس بار میں درست جواب دے سکوں '' آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں، ایسا ہی ہوا ہوگا، اب کوئی سوال کیجئے، میں اس کا درست جواب دوں گا''

'' تم سے تین سوال کیئے ہیں۔۔۔۔۔''

اس سے برداشت نہ ہوا اور مربی کی بات کاٹ کر بولا ''آپ نے ایک ہی سوال تین مرتبہ کیا ہے!۔۔۔۔''

''میں نے تم سے تین سوال کیئے ہیں!'' مربی تسلیم نہیں کر رہا تھا۔

''اچھا یوں ہی سہی! اب کوئی سوال کیجئے میں بالکل درست جواب دوں گا۔''

''اچھا ٹھیک ہے اگر تمہارا اِصرار ہے تو ایک سوال اور کرتا ہوں لیکن اس کا جواب غلط دیا تو پھر کوئی بات نہیں ہوگی ۔۔۔ ٹھیک؟''

امیدوار نے وعدہ کیا کہ اسی طرح ہوگا۔

''ایک مکان کی چمنی ہے اس میں سے بیک وقت دو آدمی گرتے ہیں ایک کے کپڑے کالک لگنے سے خراب ہو جاتے ہیں جبکہ دوسرے کے کپڑوں پر کوئی داغ نہیں لگتا۔۔۔۔۔''

''یہ تو وہی سوال ہے!۔۔۔'' شاگرد نے تمام آداب بالائے طاق رکھتے ہوئے چلا کر کہا۔

''یہ نیا اور چوتھا سوال ہے'' مربی کھڑے کھڑے مکر گیا ''اس سے پہلے تین سوالوں کے جواب تم نے غلط دیئے ہیں۔''

''اب کیا جواب ہوگا اس کا؟ اب تو آپ نے دونوں کے لباس بھی بدلوا دیئے!'' وہ طنز سے بولا۔

''مجھے سوال پورا کرنے دو۔''

''یہ سوال میں نے سنا ہوا ہے۔ وہی سوال ہے ہر بار نیا کہہ کر مجھ سے پوچھ رہے ہیں۔۔۔ چلیں یہی سوال اگر میں آپ سے کروں تو اس کا کیا جواب دیں گے؟''

''دیکھو! ہم عالم ہیں، عالم کہلاتے ہیں۔ عالم سے سوال پوچھا جاتا ہے، کیا نہیں جاتا! ہمیں کوئی سوال پوچھنا ہو تو اپنے سے بڑے عالم کے پاس جاتے ہیں، کسی جاہل آدمی کو سوال کرنا ہو تو وہ ہمارے پاس آتا ہے'' ہمارا امتحان وہی شخص لے سکتا ہے، جو ہم سے بڑا عالم ہے، تم کوئی مسئلہ پوچھ سکتے ہو، کوئی سوال بطور معلومات کر سکتے ہو، لیکن ہمارا امتحان لینے کا تمہیں کوئی حق نہیں ہے، تم ہمارے استاد نہیں ہو!''

''نہیں! یہ جو آپ بار بار ایک ہی سوال مجھ سے کر رہے ہیں اور ہر بار اسی کو نیا کہہ کر کر رہے ہیں اور میرے جواب کو غلط قرار دے کر خود وہی جواب دے دیتے ہیں۔۔۔''

''میں نے تم سے کوئی سوال نہیں کیا!۔۔۔'' مربی ایسے مکر گیا جیسے اس نے اس پر سنگین الزام لگا دیا ہو۔

شاگرد بننے کے امیدوار کو اچانک غصہ آ گیا لیکن اس وقت غصے کا اظہار نقصان دہ تھا۔ بات بدلتے ہوئے اپنے لہجے میں چاپلوسی پیدا کی بولا ''عالم صاحب ایک مسئلہ ہے اگر حل کر سکیں تو مہربانی ہوگی!''

''ہاں پوچھو!''

''سوال یہ ہے کہ ایک مکان کی چمنی ہے اس میں سے بیک وقت دو آدمی گرتے ہیں، ایک کے کپڑے کالے ہو جاتے ہیں دوسرے کے کالے نہیں ہوتے، بتائیں اس صورت میں لباس تبدیل کرنے کون جائے گا۔''

''یہ تو نہایت ہی احمقانہ سوال ہے! ہمارے پاس ایسے احمقانہ سوالوں کے لیئے وقت نہیں ہوتا!''

''آپ نے تو چار بار یہ سوال مجھ سے کیا ہے۔''

''مجھے کیا ضرورت ہے ایسے احمقانہ سوال کرنے کی؟ بھلا کسی مکان کی چمنی اتنی بڑی ہو سکتی ہے کہ اس میں سے بیک وقت دو آدمی گر سکیں؟ چمنی تو صرف دھواں نکلنے کے لیئے بنائی جاتی ہے، اتنی بڑی تو ہوتی ہی نہیں کہ اس میں سے ایک آدمی بھی گزر سکے، بیک وقت دو آدمی کیسے گر سکتے ہیں۔۔۔ اور دوسری بات!۔۔۔ فرض کیا کہ کسی بہت بڑے مکان کا بہت بڑا آتش دان ہے اس کی بڑی سی چمنی ہے اس میں سے اگر کوئی گر ہی جاتا ہے تو وہ آتش دان میں ہی گرے گا اور یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک کے کپڑے کالک سے کالے ہو جائیں اور دوسرے کے نہ ہوں۔ اگر وہ آتش دان زیرِ استعمال ہے تو دونوں کے کپڑے کالے ہوں گے، اور اگر نئی چمنی ہے ابھی استعمال نہیں ہوئی تو دونوں کے کپڑے کالے نہیں ہوں گے۔ ایسے بے تکے سوال کرتے ہو جس کا سر پیر ہی نہیں ہے ۔۔۔ ہٹو ہمارا وقت بہت قیمتی ہے۔۔۔''

محمد اشفاق ایاز

بابا ملنگ

سردی کی طویل رات کا نصف پہر گزر چکا تھا۔ گلی کے کتے سردی اور بھوک سے تنگ بھونک بھونک کر نڈھال ہو چکے تھے۔ اور دیواروں کے ساتھ لگے آنکھیں بند کئے صبح کا انتظار کر رہے تھے۔ ماحول پر قبرستان کی سی خاموشی چھا چکی تھی۔ ایسے میں میرے موبائل کی گھنٹی بجی۔ اس وقت یہ آواز اتنی کرخت لگی جیسے چھت گر گئی ہو۔ یا گیس سلنڈر پھٹ گیا ہو۔ اگر یہ فون مجھے کسی نے چوری کر کے تحفے میں دیا ہوتا، میں نے خود کسی کا اٹھایا ہوتا یا کسی سسرالی رشتے دار کی طرف سے تحفہ میں ملا ہوتا، تو اسی وقت اسے دیوار پر پٹخ دیتا۔ لیکن یہ میری بیگم نے اپنی تین ماہ کی تنخواہ سے کٹوتی کر کے خرید کر مجھے دیا تھا۔ جو ہر روز صبح شام میری خیریت دریافت کرنے کی بجائے یہی سوال کرتی ہے ''موبائل کیسا ہے؟'' میں نے کال سننے سے پہلے نمبر دیکھا، یہ تو اپنا ارشاد تھا۔ جو اسی شہر کی دوسری نکر پر رہتا تھا۔ اس نے اطلاع دی کہ ہمارا مشترکہ دوست صوبیدار عنائت المعروف بابا ملنگ اس دنیا سے کوچ کر گیا ہے۔ اور کل صبح دس بجے اس کی نماز جنازہ ادا کی جائے گی۔ مجھے اپنے دوست صوبیدار عنائت المعروف بابا ملنگ کی اس بے وقت موت کا اس قدر صدمہ ہوا کہ نیند غائب ہو گئی۔ ابھی دو روز قبل ہی اس نے کہا تھا کہ اسے تین ماہ کی پنشن ملی ہے اور وہ میرے پینتیس ہزار واپس کرنا چاہتا تھا۔ جو اس نے ایک سال قبل بھینس خریدنے کے لئے ایک ہفتہ کے اندر لوٹانے کے اقرار پر لئے تھے۔ وہ اس انتظار میں رہا کہ یہ بھینس دودھ دے گی۔ کسی بچھڑے بچھڑی کو جنم دے گی تو وہ میرا قرض لوٹا دے گا۔ لیکن بھینسوں کا راجہ کسی نوسر باز سے سستی بھینس تو خرید لایا۔ مگر اس نے بھی عنائت کی طرح ایسی چپ سادھ لی تھی۔ کہ نہ اس سے دودھ حاصل ہو سکا تھا اور نہ یہ کوئی وارث پیدا کرنے کے قابل تھی۔ میں نے سوچا جہاں ایک سال بیت گیا چند دن مزید انتظار کر لیتے ہیں۔ میں دفتر سے چھٹی کے دن کا انتظار کرتا رہا کہ اس کے گاؤں جاؤں گا۔ پیسے تو مل ہی جائیں گے۔ کوئی گاؤں کی سوغات بھی لیتا آؤں گا۔ مگر خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اور وہ میرے پینتیس ہزار کا قرض لئے اللہ کی پناہ میں جا چکا تھا۔ میں اس ناگہانی موت کی آڑ میں اپنے پینتیس ہزار کی موت پر دھاڑیں مار مار کر رونا چاہتا تھا مگر اسی کمرے میں بیگم اور بچے بھی سو رہے تھے۔

صوبیدار عنائت المعروف بابا ملنگ ہمارا بچپن کا دوست تھا۔ وہ شہر سے دس گیارہ کلومیٹر دور ایک گاؤں میں رہتا تھا۔ وہ گاؤں کے سکول سے پانچویں کلاس پاس کر کے چھٹی کلاس میں داخلہ کے لیئے شہر آیا تو اسے ہمارے سکول میں ہماری کلاس میں داخلہ مل گیا۔ وہ دراز قد اور خوبصورت لڑکا تھا۔ عمر میں ہم سے چار پانچ سال بڑا ہی تھا۔ اس کے جواز میں وہ صرف اتنا کہتا کہ ''چاچے کو بہت دیر بعد خیال آیا کہ مجھے بھی سکول جانا چاہیئے''۔ ہم تو اس کی آمد کو شغل سمجھتے تھے اور پینڈو جان کر اسے شہری مار مارنا چاہتے تھے ۔مگر وہ معصوم ہونے کے ساتھ ساتھ ذہین بھی تھا۔ نہ کسی فالتو بات کا جواب دیتا نہ حصہ لیتا۔ ہم جو لطیفے سناتے ان کا اس پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ ہمارا خیال تھا کہ اس قدر آسان اور جامع لطیفوں پر کہیں وہ گھر جا کر تو نہیں ہنستا۔ اس کے گاؤں کا ایک لڑکا آٹھویں کلاس میں پڑھتا تھا۔ ایک دن اس سے پوچھ ہی لیا کہ ہم عنائت کو اتنے آسان اور جامع لطیفے سنتے ہیں مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ کہیں وہ گھر جا کر تو نہیں ہنستا۔ اس نے قسمیں اٹھا اٹھا کر ہمیں یقین دلانے کی کوشش کی کہ یہ گھر جا کر سوائے اپنی بھینس کے ساتھ کھیلنے کے اور کوئی کام نہیں کرتا۔ گویا اس کو لطیفے سنانا ایسا ہی تھا جیسے وہ خود بھینس کو سیف الملوک سنا رہا ہو۔

عنائت وقت کے ساتھ ساتھ کھلتا گیا۔ اور ہماری دوستی پکی ہوتی گئی۔ شہر میں اس کی ایک خالہ رہتی تھی۔ گرمیوں کی چھٹیوں کے بعد وہ اس کے گھر رہنے لگا۔ عجیب فلسفی طبیعت پائی تھی۔ گرمیوں کے آخر میں آگ تاپنا شروع کر دیتا۔ کہتا سردیاں آ رہی ہیں اس کی تیار کر رہا ہوں۔ اور سردی کے موسم کے عین بیچ میں دھوپ میں بیٹھنا بند کر دیتا کہ گرمیوں کی تیاری کرنی ہے۔ ہر وقت اپنے ہی خیالوں میں گم رہتا۔ بہت خوش ہوتا تو سیف الملوک کا کوئی شعر گنگناتا۔ قصہ ہیر رانجھا سے بھی اسے کچھ شعر یاد تھے۔ ایک دفعہ گرمیوں کی چھٹیوں میں اس نے ہمیں اپنے گاؤں آنے کی دعوت دی۔ اب مسئلہ یہ تھا اس کے گاؤں پہنچا کیسے جائے۔ یہ مسئلہ بھی اس نے خود حل کرا دیا۔ دن طے ہوا اور اس کا چچا زاد جو شہر میں تانگہ چلاتا تھا۔ وہ ہم چار دوستوں کو تانگے پر بٹھا کر گاؤں لے گیا۔ مختصر سا گاؤں۔ سڑک کے ایک طرف دور دور تک کھیت اور دوسری طرف ایک بڑا برگد کا درخت جس کے ساتھ مستطیل نما بڑا سا چھپڑ تھا۔ جس میں دو بچے قدرتی لباس میں ہر چیز سے بے نیاز غوطے لگا رہے تھے۔ ان کے ساتھ فاصلے پر چار پانچ بطخیں اور چند بھینسیں مشترکہ طور پر غسل فرما رہی تھیں۔ ایک بوڑھی خاتون چھپڑ کنارے برگد کے نیچے ان بھینسوں کی حرکات پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھی۔ چھپڑ کے ساتھ ہی کچے پکے مکانات تھے۔ ہم جب اس چھپڑ کنارے اترے۔ دو تازہ دم بھینسیں اس میں داخل ہو رہی تھیں اور دونوں ہی گوبر بھی اگل رہی تھیں۔ جیسے دونوں نے ہر کام اکٹھا کرنے کی شرط لگا رکھی ہو۔ ہمارے ایک ساتھی عامر نے جب ''سب کچھ'' چھپڑ کے پانی میں گرتے دیکھا تو منہ بسورنے لگا۔ تاہم اسے حوصلہ دیا کہ انہیں اپنا کام کرنے دو ہم نے کون سا اس چھپڑ سے پانی پینا ہے۔ تانگے والے نے زور سے عنائت کو آواز دی۔ اس کا گھر چھپڑ کے ساتھ ہی تھا۔ ایک گھر کا دروازہ کھلا۔ اس سے عنائت برآمد ہوا۔ ہم تک پہنچنے کے لئے اس چھپڑ کا طویل چکر کاٹنا پڑا۔ اس وقت دن کے بارہ بج چکے تھے۔ اور ہمیں بھوک بھی ستانے لگی تھی۔ عنائت بڑے تپاک سے ملا۔ کلاس میں اس کی زبان مشکل سے کھلتی تھی مگر گاؤں میں اس نے ہمیں نہ صرف سلام کیا بلکہ حال احوال بھی پوچھا۔ پھر وہ ہمیں بھی اسی برگد کی چھاؤں میں کھڑا کر کے گھر سے چارپائیاں لینے چلا گیا۔ اسے پھر ایک طویل چکر کاٹنا پڑا۔ چارپائیاں بچھا کر ہمیں بیٹھنے کا کہہ کر پھر چلا گیا۔ اب وہ ہمارے لئے گنے اٹھا لایا۔ ابھی ہم نے گنے شروع ہی کئے تھے۔ کہ وہ سینہ پھلائے چھپڑ کے عین وسط میں جگالی کرتی ایک بھینس کی طرف اشارہ کر کے بولا'' وہ ہے میری بھینس۔ شام کو چاچا اس کا دودھ دھوئے گا تو آپ لوگوں کو خالص دودھ پلائیں گے''۔ شام کا سن کر ہم چاروں چیخ اٹھے ''شام کو؟۔ نہیں بابا ہمیں شام سے پہلے گھر پہنچا دو۔ ورنہ ہمیں ساری عمر کے لئے بلیک لسٹ کر دیا جائے گا''

''نہیں جی یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ دو چار دن تو رکیں گے''۔ عنائت نے فیصلہ سنایا۔ ہمارے ہاتھ رک گئے۔ رفیق ہم سب

ایک دن ایک مولوی صاحب سرسید احمد خان صاحب کے پاس تشریف لائے اور کہنے لگے ”میں نے گزشتہ دنوں آپ کو بہت گالیاں دی ہیں اور اب بھی کئی بار اس گناہ کا ارتکاب کر چکا ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اپنے کیے پر نادم ہوں، آپ میری یہ خطا معاف فرما دیں۔“
سرسید احمد مسکرائے اور مسکرا کر فرمایا ”جائیے صاحب! میں نے نہ صرف آپ کی وہ گالیاں معاف کر دیں جو آپ نے پچھلے دنوں مجھے دیں تھیں بلکہ وہ بھی بخش دیں جو آپ آئندہ مجھے دینے والے ہیں۔“

میں چھوٹا تھا۔ وہ بے چارہ رونے لگا۔ ”میں تو گھر سے پوچھ کر نہیں آیا۔ میں تو گھر جاؤں گا“۔ اور یوں دودھ پینے کا پروگرام آئندہ کے لئے ملتوی کر دیا گیا ”بھئی گنے تو چوسو“۔ عنائت بولا۔ اس نے ہمارا موڈ تاڑ لیا تھا۔ وہ اتنا بھی پینڈو نہیں تھا۔ اس نے ہمارا دھیان بٹانے کے لئے کہا ”گرمی لگ رہی ہے آؤ نہائیں“۔
”چلو پھر پہلے نہالیں“۔ سب بولے۔ ”لیکن کہاں؟“
”اسی چھپڑ میں“ وہ بے نیازی سے بولا۔ ”میں تو روز اس میں نہاتا ہوں۔ بلکہ گاؤں کے سب بچے بڑے شوق سے نہاتے ہیں۔ تم دیکھنا دھوپ ذرا نیچے ہوتے ہی یہاں بچوں کا میلہ لگ جاتا ہے۔“
عامر جو بھینسوں کو چھپڑ میں گوبر کی کھاد ڈالتے دیکھ چکا تھا۔ اس کے چہرہ دیکھنے لائق تھا۔ باقی دوست بھی نہانے کی خواہش سے دستبردار ہو گئے۔ اور گنے وہیں چھوڑ واپسی کا مطالبہ کرنے لگے۔ اگر گاؤں دور نہ ہوتا تو دو چار بچ وہاں سے دوڑ لگا دیتے۔ اب ہمارا ایک ہی مطالبہ تھا کہ ہمیں کسی طرح شہر پہنچا دیا جائے۔ ہم نے گاؤں دیکھنا تھا دیکھ لیا۔ تانگے والا تو ہمیں چھوڑ کر کہیں اور نکل چکا تھا۔ اس سے قبل کہ سب بچے رونا شروع کر دیتے۔ اتفاق سے ایک خالی ٹریکٹر ٹرالی شہر کی طرف جا رہی تھی۔ کچھ عنائت نے اور کچھ ہم نے التجا کی اور ہم گنے وہیں چھوڑ، ٹرالی میں بیٹھے، اور شہر چلے آئے۔ کم از کم سکول دور میں ہم میں سے کسی کو عنائت کے گاؤں جانے کی ہمت نہ ہوئی۔

دسویں کا امتحان دے کر عنائت مستقل اپنے گاؤں چلا گیا تو ہماری ملاقاتوں میں لمبے وقفے آنا شروع ہو گئے۔ اسی دوران پتہ چلا اسے گاؤں کی ایک لڑکی سے ”کچھ کچھ“ ہونے لگا ہے۔ رضیہ نام تھا اس کا۔ ماشاء اللہ پوری ساتویں جماعت پاس تھی۔ اس کے بعد گھر والوں نے گاؤں کے رواج کے مطابق اسے بھینس کے لئے چارہ لانے، اپلے تھاپنے اور روٹی سالن پکانے پر لگا دیا۔ کسی کھیت کے کنارے ہی ان کی ملاقات ہوئی۔ اور بس۔ رضیہ جو پہلے بھینس کو چرانے میں بڑی بڑ بڑ کرتی تھی۔ اب بڑی باقاعدگی سے باہر جانے لگی۔ گاؤں کے کنارے پر ایک دربار بھی تھا۔ جو پیر ہرا ملنگ کے نام سے مشہور تھا۔ اس دربار پر کچھ ملنگ ہر وقت بیٹھے رہتے۔ بھنگ کا دور بھی چلتا۔ لوگ یہاں منتیں مانگنے آیا کرتے تھے۔ اور ساتھ ہی ان ملنگوں کی خدمت بھی کر دیا کرتے تھے۔ رضیہ اور عنائت نے بھی اس مزار پر جانا شروع کر دیا۔ عشق سلامت رہنے کا دھاگہ بھی باندھا۔ ان ملنگوں میں سے کسی نے رضیہ کے گھر مخبری بھی کر دی، مگر انہوں نے اس طرف دھیان نہ دیا۔ اور یوں تین چار سال اسی چھپا چھپی میں گزر گئے۔ عنائت کی عمر تیس سال کی حد عبور کرنے لگی تو اس کے دل میں بھی شادی کا خیال آیا۔ ماں کا سایہ بچپن میں اٹھ گیا تھا۔ اب صرف چاچا (گاؤں میں باپ کو اکثر چاچا ہی کہتے ہیں) تھا اور وہ یا ان کی اکلوتی بھینس۔ اس نے چاچا سے بات کی۔
”میرے پتر۔ تیری ماں تیرا رشتہ تیری شہر والی خالہ کے گھر کر گئی تھی۔ اب میں انہیں کیا منہ دکھاؤں گا۔“ چاچا بولا
”لیکن چاچا میں شادی رضیہ سے ہی کروں گا۔“
”اگر وہ نہ مانے تو؟“
”ٹھیک ہے نہ مانیں۔ میں پھر ایسے ہیں رہوں گا۔“ دھمکی کارگر رہی۔
”میں ایک دفعہ رضیہ کے گھر والوں سے بات کر کے دیکھوں گا؟“
عنائت خوش ہو گیا۔
ایک دن عنائت کا چاچا گاؤں کی تنگ گلی سے گزر رہا تھا۔

رضیہ کی ماں اس وقت اُپلے تھاپ کر گھر کی دیوار کو قدرتی ایندھن کی فیکٹری بنا رہی تھی۔ وہ گاؤں بھر میں منہ پھٹ اور لڑا کی مشہور تھی۔ عورتیں تو کیا مرد بھی اس سے کنی کترا کر گزرتے تھے۔ اسے ایسی ایسی گالیاں زبانی یاد تھیں جو شائد مرد بھی زبان پر لاتے ہوئے شرماتے تھے۔ چاچے نے ادھر ادھر دیکھا۔ کوئی اور نہ تھا۔ اس نے جھٹ رضیہ اور عنائت کے رشتے کی بات کی۔ رضیہ کی ماں ایک دم سیدھی ہوگئی۔ دائیں ہاتھ میں پکڑا تازہ اُپلا زور سے چاچے کو دے مارا۔ اور بولی ''اس نکھے سودائی سے، جو کام وام تو کرتا نہیں اور سارا دن سیف الملوک پڑھتا رہتا ہے۔ کسی عاشق کی اولاد''۔ اس سے قبل کہ رضیہ کی ماں دوسرا کچا اُپلا اٹھا کر چاچے کو دے مارتی وہ تیزی سے کھسک گیا۔ وہ ت وبھلا ہوا کہ رضیہ کے ماں نے کچے اُپلوں پر ہی اکتفا کیا۔ ورنہ گالیوں کی پٹاری کھُل جاتی تو اور زیادہ برا ہوتا۔ دراصل رضیہ کی ماں بھی سیانی تھی۔ وہ زبان کھول کر اپنی بیٹی کی مشہوری نہیں کرنا چاہتی تھی۔

چاچا وہاں سے سیدھا گھر پہنچا۔ عنائت گھر میں ہی موجود تھا۔ چاچا ایسے چارپائی پر گرا جیسے کوئی لاش پھینکتے ہیں۔ عنائت کے پوچھنے سے پہلے ہی چاچا نے اسے مذاکرات میں ناکامی سے آگاہ کر دیا۔ عنائت کو غصہ تو بہت آیا۔ لیکن اس گاؤں میں وہ اکیلا تھا۔ شام تک یہ خبر گاؤں میں پھیلنے کے ساتھ ساتھ رضیہ تک بھی پہنچ چکی تھی۔ وہ عنائت سے سیف الملوک اور ہیر رانجھا کا قصہ تو سنتی چلی آ رہی تھی۔ لیکن اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ خود کوئی کردار ادا کرتی۔ عنائت اس کی کمزوری سے واقف تھا۔ پھر بیٹھے بٹھائے پتہ نہیں کس کیڑے نے عنائت کے سر میں ڈنگ مارا کہ اس نے خود رضیہ کے بھائی سے بات کرنے کی ٹھانی۔ رضیہ کا بھائی شیدا اس کا واقف تو تھا ہی۔ جب برگد کے نیچے گاؤں کی محفل لگتی تھی تو شیدا ہی اسے سیف الملوک سنانے کی فرمائش کیا کرتا تھا۔ چند دن بعد ہی جب صبح ہی صبح شیدا اپنا بیل لے کر کھیتوں کی طرف جا رہا تھا۔ عنائت اس کے سامنے آ گیا۔ اور دونوں ہاتھ جوڑ کر اس سے دل کی بات کہہ دی۔ شیدا جو پہلے ہی گاؤں میں خر دماغ کے نام سے مشہور تھا۔ اس نے ہاتھ میں پکڑے ڈنڈے سے عنائت کی خوب پٹائی کی۔ عنائت بھی گاؤں کا پلا بڑھا تھا۔ مار کھاتا رہا۔ شیدے نے جب دیکھا کہ اس پر کوئی اثر نہیں ہو رہا اس نے پوری قوت سے ڈنڈا اس کے سر پر مارا۔ چند ثانیے اسے شیدے کی شکل نظر آئی۔ پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی۔ جب دماغ کی بتی میں ذرا سی لو ہوئی۔ اس وقت وہ گھر کی چارپائی پر پڑا تھا۔ چاچے کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اور ہاتھ میں دودھ کا پیالہ۔

''میرا پُترا۔ میں اس سے زیادہ اور نہ کچھ کر سکتا ہوں اور نہ دیکھ سکتا ہوں۔ اب بس کرو''

عنائت کسی نہ کسی طرح رضیہ سے ملاقات کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ یہ ان کی آخری ملاقات تھی۔ رضیہ کو شیدے کے ہاتھوں مار کا پتہ چل چکا تھا۔ اس دن بھائی نے اماں کو گھر آ کر بتایا کہ اس نے عنائت کا کام تمام کر دیا ہے۔ اس آخری ملاقات میں دونوں نے ایک دوسرے کے لئے جینے کی قسمیں کھائیں اور پھر جدا ہوگئے۔

عنائت کا چاچا ایک ڈیڑھ ماہ بعد عنائت کو اکیلا چھوڑ کر عنائت کی ماں کے پاس چلا گیا۔ اب عنائت گھر میں بھی اکیلا تھا اور دنیا میں بھی۔ اس نے وقت گزاری کے لئے اور اپنے دلی سکون کے لئے بابا پیر ہرا ملنگ کے دربار پر جانا شروع کر دیا۔ پہلے تو وہ یہاں مرادیں مانگنے آیا کرتا تھا۔ اب اس نے یہاں موجود ملنگوں کی محفل میں بیٹھنا شروع کر دیا۔ ملنگوں تک بھی اس کی ناکامئ عشق کے قصے پہنچ چکے تھے۔ لیکن وہ خود نکھے، کام چور، اور بھنگی مانے جاتے تھے۔ وہ رضیہ اور عنائت کے ملاپ میں کیا کردار ادا کرتے۔ پہلے ہی دن ایک ملنگ نے اپنا بھنگ کا آدھا پیالہ اسے پیش کیا تو اس پر عقدہ کھلا کہ وہ خواہ مخواہ ملنگوں کو برا بھلا کہتا تھا۔ اصل دنیا تو یہی ہے۔

ملنگوں کی محفل میں اس نے نہ صرف سیف الملوک کے کچھ باقی شعر یاد کئے۔ بلکہ قصہء ہیر رانجھا، سوہنی مہینوال، قصہ حضرت یوسف وزلیخا کے کچھ حصے بھی یاد کر لئے۔ ملنگوں نے اپنا سارا علم مع بھنگ کے اس میں انڈیلنے کی کوشش کی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ

عنائت خود بھی شعر جوڑنے لگا۔ وہ ان قصوں کے بعض شعروں میں گالیاں اس عبارت سے پیوست کرتا کہ لگتا اصلی شعر ہی یہی ہے۔ بھنگ کے اثر اور ملنگوں کے فیض سے جوڑے گئے ان شعروں میں رضیہ کی ماں، اس کے بھائیوں اور دیگر رشتہ داروں کی شان میں ایسے ایسے لفظ استعمال کئے جاتے کہ ہنس ہنس کر عام آدمی کے پیٹ میں بل پڑ جاتے۔ ان میں محاوروں، تلمیحات وغیرہ کی بجائے ایسے انکشافات بیان کرتا جس سے رضیہ کا خاندان اپنے اصلی پس منظر میں سامنے آجاتا۔ خاص طور پر یہ کہ رضیہ کی ماں لڑائی میں جو بے دریغ گندی زبان استعمال کرتی ہے۔ اس کے پیچھے کیا کہانی ہے۔

فیض رسانی کا یہ سلسلہ جاری رہتا لیکن ہوا یہ کہ انہی دنوں فوج کی بھرتی کی اطلاع آگئی۔ ملنگوں کے منع کرنے کے باوجود عنائت نے فوج میں جانے کی تیاری کی۔ اس کا قد کاٹھ، جسم وغیرہ اور تعلیم معیار پر پورا اُترتی تھی۔ یوں وہ فوج میں بطور نائب صوبیدار بھرتی ہوگیا۔ اس نے بھینس فروخت کر دی۔ گھر کو تالا لگایا اور فوج میں چلا گیا۔ فوج کی سخت ٹریننگ تک وہ سب کچھ بھول گیا۔ لیکن جب وہ اپنی یونٹ میں آیا اور کچھ فراغت ملی تو اس کے اندر پھر رضیہ جاگ اٹھی۔

اس کے شعری ذوق کے مطابق اسے کچھ قدردان اور ایک دو استاد بھی مل گئے۔ اسے یوں لگا جیسے سب اپنی اپنی رضیہ کا غم بھلانے فوج میں آئے ہیں۔ انہی دنوں وہ دو دن کی چھٹی پر گاؤں آیا۔ اسے گاؤں کی فضا عجیب عجیب سی لگی۔ دربار پر اپنے سنگی ساتھی ملنگوں کو ملنے گیا۔ وہیں اسے پتہ چلا کہ پچھلے ماہ رضیہ کہ شادی دوسرے گاؤں میں کر دی گئی تھی لیکن دوسرے ہی دن رضیہ پو پھٹنے سے پہلے خود گھر واپس آگئی۔ اور اعلان کر دیا کہ وہ اب کبھی اپنے سسرال نہیں جائے گی۔ اس کے بھائی نے اسے اتنا مارا کہ وہ بے ہوش ہوگئی۔ لیکن وہ اپنی ضد پر قائم رہی۔ یہ وہ مرحلہ تھا جب رضیہ کی ماں کو ہمیشہ کے لئے چپ لگ گئی۔

تیس سال بعد عنائت فوج سے ریٹائر ہو کر گھر آیا تو صوبیدار بن چکا تھا۔ پنشن سے کافی رقم ہاتھ آئی۔ کہاں وہ دن کہ اس کے باپ اور خود اس نے رضیہ کے لئے اتنی بے عزتی برداشت کی اور کہاں یہ دن کہ اس عمر میں بھی گاؤں کی دو خواتین اس سے شادی کے لئے تیار تھیں۔ اس کے لئے یہی کافی تھا کہ رضیہ نے بھی ابھی تک شادی نہ کی تھی۔ یوں صوبیدار عنائت نے بھی بقیہ زندگی اسی کی یاد میں گزارنے کا پکا ارادہ کر لیا۔ پنشن سے جو یکمشت رقم ملی اس سے اس نے گاؤں کی مسجد کو وسیع اور پختہ کرا دیا۔ اکیلی جان تھی، اس کی گزر بسر کے لئے پنشن ہی کافی تھی اور رہنے کے لئے پیر ہرا ملنگ کا دربار۔ یوں وہ صوبیدار عنائت سے بابا عنائت ملنگ مشہور ہوگیا۔

عروض اور زنداں

عرب شاعر ابونواس کی ہارون الرشید کے دربار تک رسائی تھی۔ ایک بار ہارون الرشید کی زوجہ زبیدہ نے اس خوددار شاعر ابونواس سے کہا کہ اس کے بیٹے شہزادہ امین کو شاعری کا شوق ہے اس لیے امین کو اصلاح دیدیا کریں۔ ابونواس شہزادے کی بدلحاظی سے واقف تھا لیکن وہ ملکہ زبیدہ کے اس شاہی فرمان سے انکار کیسے کرسکتا تھا۔ ایک روز امین نے اپنے چند اشعار ابونواس کو سنائے تو اُس نے اس کے اشعار کی عروضی غلطیوں کی نشان دہی کردی، امین کو غصہ آگیا اور اُس نے اُسی وقت ابونواس کو زندان میں ڈال دیا۔ امین کی اس حرکت کا خلیفہ ہارون الرشید کو علم ہوا تو اس نے ابونواس کی رہائی کا حکم دے دیا اور بات آئی گئی ہوگئی۔

ایک روز جب شہزادہ امین خلیفہ ہارون اور ابونواس اکٹھے بیٹھے تھے تو ہارون نے امین کو کہا کہ ”امین تمہارے استاد موجود ہیں، موقع سے فایدہ اٹھاؤ اور اپنے اشعار کی اصلاح کروالو۔“

امین نے چند اشعار پڑھے ابونواس نے غور سے سنے مگر چپ چاپ اٹھا اور چل دیا۔ ہارون الرشید نے حیرت سے پوچھا ”ابونواس کہاں چل دئے؟“

ابونواس نے امین کو معنی خیز نظروں سے دیکھا اور جواب دیا ”امیر المومنین! قید خانے میں!“

تاریخ اس بارے میں خاموش ہے کہ پینشن آنے کے بعد عنائت کی رضیہ سے کوئی ملاقات ہوئی یا نہیں لیکن ایک بات طے تھی کہ دونوں اپنے وعدے پر قائم رہے، نہ رضیہ نے شادی کی اور نہ عنائت نے۔ عنائت ملنگ کی موت کی خبر سن کر مجھے دلی دکھ بھی ہوا اور اس لحاظ سے اطمینان بھی کہ وہ جو خود اذیتی کی سزا بھگت رہا تھا۔ اس سے اسے نجات مل گئی تھی۔ حسب پروگرام ہم دوستوں نے ایک وین کرائے پر لی اور عنائت کے گاؤں پہنچ گئے۔ پتہ چلا جنازہ دربار سے اٹھایا جائے گا اور کچھ فاصلے پر واقع قبرستان میں دفنایا جائے گا۔ ہم جب دربار پر پہنچے تو جنازہ اٹھایا جا رہا تھا۔ ہماری وین کچھ فاصلے پر رک گئی۔ ہم تیرہ چودہ افراد وین سے اترے اور جنازہ کو کندھا دینے آگے بڑھے۔ وہاں اتنا رش نہ تھا۔ وہاں موجود لوگ ہمیں دیکھ کر بہت حیران ہوئے۔ کہ شہر سے لوگ کیسے اور کیونکر جنازے میں شریک ہونے آئے ہیں۔ ہم نے وہاں لوگوں سے ملنگ کے فوت ہو جانے پر افسوس بھی کیا اور اپنی دوستی کا حوالہ دیا۔ کچھ دوستوں نے کندھا دیا اور باقی جنازے کے آگے آگے چلنا شروع ہو گئے۔ جنازگاہ قبرستان کے اندر ہی تھی۔ جونہی ہم جنازگاہ میں داخل ہونے لگے دو سفید پوش اندر سے اٹھ کر باہر آئے۔ حیرت سے ہماری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ان میں ایک زندہ سلامت ہمارا صوبیدار عنائت ملنگ تھا۔ قریب تھا کہ جن دوستوں نے جنازہ کو کندھا دیا ہوا تھا وہ پرے ہٹ جاتے اور میت کو پھینک دیتے۔ عنائت ملنگ اپنی جگہ حیران اور گنگ بنا ہمیں دیکھ رہا تھا۔ اس نے بڑھ کر جنازے کو اندر لے جانے کے لئے سہارا دیا اور پوچھا ''آپ لوگ کدھر''۔ موقع کی نزاکت دیکھتے ہوئے میں نے کہا'' نماز پڑھ لیں۔ پھر بتاتے ہیں۔''

نماز جنازہ کے بعد لوگ میت لے کر تدفین کے لئے وہاں سے چلے گئے اب وہاں صرف ہم تھے اور ہمارا عنائت بابا ملنگ۔ کوئی اس کو چھو کر اس کے زندہ ہونے کی تصدیق کر رہا تھا تو کوئی پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ بابا عنائت خود حیران تھا۔ ''کچھ بولو بھی'' بابا ملنگ بولا۔ ہم نے اسے بتایا کہ رات اطلاع ملی تھی کہ بابا ملنگ فوت ہو گیا ہے۔ ہم تو تمہاری نماز جنازہ پڑھنے آئے تھے۔ اس پر ایک زوردار مشترکہ قہقہہ بلند ہوا۔ وہ تو شکر ہوا ہمارے آس پاس کوئی نہیں تھا۔ ورنہ توہینِ جنازہ کے تحت گاؤں والوں سے تادیبی کارروائی کا اندیشہ تھا۔

بابا عنائت ملنگ کو زندہ دیکھ کر ایک طرف مجھے قلبی سکون محسوس ہوا۔ میرے پینتیس ہزار ابھی مرے نہیں تھے۔ بابا عنائت نے انکشاف کیا کہ مزار پر جتنے بھی درویش رہتے ہیں انہیں ملنگ ہی کہتے ہیں۔ کل ہمارا ایک ملنگ زیادہ گھوٹا لگانے سے دنیا سے ہی گزر گیا تھا۔ اس کا گاؤں کی مسجد میں اعلان ہوا۔ سننے والے نے آپ کو اطلاع دی۔ آپ سمجھے شائد میں فوت ہو گیا ہوں۔ ''بھئی ایک بات کی مجھے بہت خوشی ہے'' بابا عنائت ملنگ بولا ''آپ لوگ میرے مرنے پر آئے ہیں۔ مجھے آپ پر فخر ہے۔ میں آپ کو اپنے جنازے پر تو نہیں دیکھ سکوں گا۔ اب اگر آپ میرے جنازے پر نہ بھی آئیں تو مجھے دکھ نہیں ہوگا۔ مگر اطمینان ہوگا کہ آپ لوگ میرا کس قدر خیال رکھتے ہیں۔''

قہقہوں کی اس گونج میں ہم نے رضیہ کا پوچھا۔ پتہ چلا دو ماہ قبل اس کا انتقال ہو گیا تھا۔ اب اسی قبرستان میں دفن ہے۔ اب وہ زیادہ وقت یہیں جنازگاہ میں گزارتا اور اگلے جہاں رضیہ سے جلد ملاقات کی دعا مانگتا ہے۔

اس دن بابا عنائت نے گھر سے پینتیس ہزار لا کر مجھے واپس کئے۔ شکریہ بھی ادا کیا۔ اور وعدہ کیا کہ گاؤں میں اس دفعہ بہت زیادہ تربوز اُگے ہیں۔ جونہی تیار ہوئے، بوری بھر کر آپ کو بھیجوں گا۔ پھر شہر میں تربوز آتے رہے لیکن ان میں کوئی بھی بوری میرے نام کی نہ نکلی۔

اس کے تقریباً چار ماہ بعد یونہی شہر کے بازار میں عنائت کے گاؤں سے آئے ایک شخص سے ملاقات ہوئی۔ میں نے اپنے ملنگ کا پوچھا۔ کہنے لگا'' آپ کو پتہ نہیں چلا؟۔ دو ماہ قبل اس کا بھی انتقال ہو گیا ہے۔''

میرے پاس اس سے پوچھنے لئے مزید کچھ نہ تھا۔

ڈاکٹر عزیز فیصل

بیل اور نہ بجائی جا سکی!

ویرانے میں چپکے سے بہار آنے اور بعد ازاں کھڑاکے دار انداز میں ''خزاں بی بی'' کی غیر متوقع آمد بھی کسی سفری روداد کا انجام ہو سکتا ہے۔ یہی کچھ ہمارے ساتھ بھی ہوا۔

وٹس ایپ پر اچانک ہی ٹاکرا ہوا، مختصر گپ شپ چلی اور ہم دونوں نے فوراً ایک دوسرے کو گھر کا پتہ دے دیا۔ ہم نے پہل کرتے ہوئے ملنے کا ارادہ ظاہر کیا تو سیّد ضمیر جعفری نے ملنے کا وقت عنایت کر دیا اور جائے ملاقات کا اتا پتا بھی سمجھا دیا۔ ایک جاننے والے ٹیکسی ڈرائیور سے بذریعۂ فون رابطہ ہوا اور فوری طور پر مقررہ مقام کی طرف روانگی کا پروگرام بنالیا۔ آناً فاناً ہم اس سفر کی تیاری میں لگ گئے۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد کالی ٹیکسی میں بیٹھ کر ہم ضمیر جعفری سے ملنے چل پڑے۔ ایک نامانوس سڑک پر سفر کرنا ڈراونا سا لگ رہا تھا۔ سڑک کے دونوں اطراف سنبل، سفیدے، بیری، کیکر، شریں، شیشم، چیڑھ اور چنار کے گھنے درختوں کو باادب اور ہوشیار پایا۔ کہیں کہیں امرود، انار، سٹابری، کنو، کیلے، لیچی، آم، چکوترے اور ناشپاتی کے پھلوں سے لدے درخت اور پودے بھی نظر آئے۔ اس سے پہلے کہ ہم موسمیاتی تضاد کے اس مظاہرے پر حیران ہوتے، سڑک کے کنارے ایک جہازی بورڈ پر ہمیں جلی حروف میں یوں لکھا دکھائی دیا ''بے موسمی اور موسمی پھلوں، پودوں اور درختوں کا جدید مصنوعی سائنسی باغ ۲۰۱۷''۔ ہماری حیرت کی ہمت پاکستان کرکٹ ٹیم کی طرح فوراً ہی دم توڑ گئی۔ جگہ جگہ بڑے بڑے پلیٹ فارم نظر آ رہے تھے جہاں دنیا کے مختلف کونوں سے لوگ فیکس ہو کر آ رہے تھے۔ دراصل یہ ایک بین الاقوامی جنگل تھا جہاں پوری دنیا کے لوگ ویزے اور پاسپورٹ کے بغیر سیر سپاٹے اور شاپنگ کے لیے آ سکتے تھے۔

کئی دلچسپ مناظر بھی نظر آ رہے تھے۔ مصنوعی قمقموں سے روشن اس مہیب جنگل میں ایک لومڑی بھی نظر آئی جو انگوروں کی کسی اونچی بیل پر جھپٹتے ہوئے چھلانگیں لگا رہی تھی۔ ہم نے محتاط فاصلے پر ٹیکسی رکوالی تاکہ یہ تصدیق کر سکیں کہ کیا لومڑی کوشش ناکام کے آخر پر ''انگور کھٹے ہیں'' کہتی ہے یا نہیں؟ لیکن یہ کیا؟ لومڑی نے تیسری ہی کوشش میں انگور کے بلند و بالا گچھے کو نیچے گرا دیا۔۔ لومڑی انگور کھاتی جاتی اور ایسا تاثر ظاہر کر رہی تھی کہ یہ انگور تو چمن انگوروں سے بھی زیادہ میٹھے ہیں۔ ہم زیادہ دیر وہاں کیا رُکتے کہ جعفری صاحب کا سرزنش بھرا ایس ایم ایس ملا کہ جلدی کرو، انور مسعود بھی پہنچ گیا ہے۔ ہم آگے چل پڑے۔ درختوں سے لٹکے

''لگژری گھونسلے'' بتا رہے تھے کہ آج کل پرندے اس ہاؤسنگ سوسائٹی کو بہت پسند کرتے ہیں۔ سانپ کی بلوں کے نشانات بھی نظر آرہے تھے بلکہ ایک ایسی جدید شاپ بھی نظر آئی جس کے ہتھے پر لکھا ہوا تھا '' یہاں آستینوں والے اژدہے ارزاں نرخوں پر دستیاب ہیں''۔ایسے لگتا تھا کہ ایک سدا بہار درختوں والا جنگل ہے جس میں بے موسمی پھل بھی کثیر تعداد میں کچی پکی شکل و صورت لیے ہم سے نگاہیں ''دو'' کر رہے تھے۔

شاپنگ مارٹ، کیش اینڈ کیری سنٹرز، پلازے، کمپیوٹرائزڈ ہیر سیلون، خلائی ٹریولنگ سنٹرز، جم وغیرہ بھی کثیر تعداد میں موجود تھے۔ یہ بات بھی اہم تھی کہ دکانیں تتر بتر ترتیب کا نمونہ پیش کر رہی تھیں۔ وقت کی تنگ دامانی اور جعفری صاحب کے ڈانٹوں سے لبریز فون کی وجہ سے یہ ممکن نہیں رہا تھا کہ ذرا سا رک کر اس سائنسی باغ سے لطف اندوز ہوتے۔

اچانک ہی ایک پگڈنڈی پر سرفراز شاہد صاحب نظر آگئے۔فوراً انھیں اپنے ساتھ گاڑی میں بٹھالیا۔ پوچھنے پر پتہ چلا کہ شوگر لیول ڈاون کرنے کے لیے وہ پیدل ہی ضمیر جعفری کے گھر جا رہے تھے جہاں میری صدارت میں ''ککل گاؤں'' مزاحیہ مشاعرہ برپا ہونے والا تھا۔

ہماری حیرت دوچند کرنے کو ایک بدحواس کوّا مارا مارا اڑتا نظر آرہا تھا جس کی چونچ میں تین چار کنکر بھی موجود تھے۔ وہ دیدے پھاڑے،شاید، پانی کے کسی کم سطح والے گھڑے کو ڈھونڈتا دکھائی دے رہا تھا۔ یقیناً اسے یہ یاد نہیں آ رہا تھا کہ وہ بدنام زمانہ گھڑا کہاں رکھا ہوا تھا جس میں اسے کنکریاں ڈالنی تھیں۔درختوں کے جھنڈ اور ان کے گہرے سائے کوّے کی بے چینی پر مسکرا رہے تھے اور ہم تینوں اس تلاش بسیار سے محظوظ ہو رہے تھے۔

''جی آیاں نوں'' کا بینر ایک خوبصورت سی کٹیا پر آویزاں دیکھ کر ڈرائیور نے گاڑی روک دی اور گہرے تفکر میں ڈوبی آواز نکالتے ہوئے مجھ سے کہنے لگا کہ فیصل جی یہ سارا انتظام آپ کی خاطر رچایا گیا ہے۔ کسی نے آپ کی اس طرف روانگی کو سیٹلائٹ ٹریک سسٹم سے سرچ کیا ہے اور اس کٹیا نما محل میں داخل ہونے کی دعوت دی ہے، لہٰذا آپ فوراً کٹیا میں جا کر اس خیر قدمی راز سے پردہ اٹھائیں۔ سرفراز شاہد نے بھی اس کی بے رحمانہ تائید کردی۔ مجھے چاروناچار گاڑی سے نیچے اترنا پڑا۔کٹیا کا گہرا دودھیا ڈسٹمپر اور اس کے چاروں جانب صنوبر کے دراز قامت اشجار کٹیا کی شان و شوکت بیان کر رہے تھے۔کٹیا کیا تھی، ایک جدید طرز کی کوٹھی تھی جس کا بڑا آہنی گیٹ بند تھا۔اچانک میری نظر اس گیٹ کے اوپر لکھے ''کاشانہ بشیراں'' پر پڑی تو دل۔باغ باغ ہوگیا۔وصال کے متعدد منصوبے پایہ تکمیل سے دوچار ہوتے محسوس ہونے لگے۔

میں دل ہی دل میں متوقع وصالیہ مکالمات پر غور کرنے لگ گیا۔دھک دھک کرتا دل نروس ہوتا گیا۔مدتوں بعد درِجاناں پر بیل بجانے کا شرف حاصل ہونے والا تھا۔نہ جانے لبوں پر لاحول کا ورد کیوں جاری تھا۔ خدا خدا کر کے بیل تک رسائی ملی۔ بیل بجانے کے لیے بٹن پر ہاتھ رکھنے ہی لگا تھا کہ بیگم کی آواز آئی ''کیا بات ہے آج تو صبح کی نماز بھی قضا کر بیٹھے ہو۔اب اٹھو اور ناشتے کے لیے لاہوری چھولے اور نان لے کر آجاو کیونکہ بچوں نے سکول جانا ہے اور آپ نے دفتر!''

صاحبو! ہم تو برسرِعام کہتے ہیں بلکہ ببانگ دہل کہتے ہیں کہ ”کہاں راجہ بھوج اور کہاں گنگو تیلی“ کہاں سکہ بند سفرنامہ نگاروں کی رام رام کی صدائیں اور کہاں ہماری راٹھ طوطے جیسی ٹیں ٹیں۔۔۔مگر حیرت انگیز طور پر ہمارے پچھلے سفر (کے-ٹو) کی ”ہڈ بیتی“ کو نہ صرف یاروں دوستوں بلکہ اُن کے آگے دوستوں کے دوستوں یعنی کہ ”لکڑ دادا شکڑ دادا“ قسم کے دوستوں کے آگے کے بھی دوستوں کے بھی آگے کے دوستوں تک ہمارا لکھا ہوا وہ ”کچ پچولا“ قسم کا سفرنامہ خاصا مقبول عام ہوا، حالانکہ وہ صرف ہماری ذاتی سفری یادداشتیں تھیں۔۔۔”اپنی اپنی ڈفلی اپنا اپنا راگ“ کے موافق پھر ہر طرف سے علیحدہ علیحدہ ردِعمل دینا بھی احباب کی طرف سے ضروری خیال کیا گیا جو کہ ۔

تھی داستاں دراز بھی اور دل گداز بھی
لیکن کہاں یہ دل کہ دیا جائے اس کو طول

مختصراً صرف اتنا عرض ہے کہ بعض نے ہمیں باقاعدہ بالمشافہ مل کر اور اکثریت نے فون کر کے خوب ہلاشیری دی (خدا اُن کا بھلا کرے) اور بعض نے تو ایک قدم بڑھاتے ہوئے باقاعدہ آرڈر جاری وساری کر دیئے کہ

اکیلے نہ جانا ہمیں چھوڑ کر تم

آئندہ ہمیں بھی لے کر جانا کہ ہم نے تو ابھی کے ابھی رختِ سفر باندھ لیا ہے بلکہ لائین میں بھی آن کھڑے ہوئے ہیں۔۔۔بس جناب ٹکٹ کٹوانے کی دیر ہے یا پھر آپ جناب کے بلاوے کی۔۔۔سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے چلے آئیں گے۔۔۔سر کے بل سرکار چلے آتے ہیں۔۔۔اور بھی اسی طرز کے نہ جانے کیا کیا آسمانی قلابے ملائے گئے۔ پہلے پہل تو دلِ ناداں شاد ہوا پھر ایک انجانی آواز کہیں میرے اندر سے آئی کہ صاحب۔۔۔اِن بھاڑے کے ٹٹوؤں، نابکار خچروں، کا کیا بھروسہ۔۔۔راستہ میں ہی کہیں رسی تڑوا کر ٹُمّم تخمی، ریشہ ختمی، انتا غفیل یا بگٹٹ خلاص گر ہو جائیں تو کوئی کیا کر سکے گا۔ ہاں ٹھنڈا پانی پی کر مر ضرور سکے گا۔۔۔لہذا اِس کان سے سنی اور اُس کان سے نکال دی۔۔۔ ہیں جی!!

اور بعض حضرات جو کہ معذرت کے ساتھ ذرا ”تھڑ دلے“ واقع ہوئے ہیں اور ہماری نظر میں اس مہم جوئی کا حوصلہ ہی نہیں رکھتے (اگر کوئی اس سارے گورکھ دھندے کو مہم جوئی تسلیم کر لے تو) اُنھوں نے فوراً سے پہلے ”توبہ میری توبہ“۔۔۔”توبہ میری توبہ“ کی قوالی باآوازِ بلند چلا دی۔۔۔سنا ہے کہ ان احباب کی ”پورے گھر والیاں“ بھی ہم پر خاصے خار کھائے بیٹھی ہیں کہ اب وہ بے چارے حضرات گرامی قدر ”مری“ جانے سے بھی کتراتے ہیں۔ جونہی کسی نے مری یا نتھیا گلی جانے کا نام بھی لیا تو فوراً سے پہلے ”توبہ میری توبہ“ کا ورد شروع کر دیتے ہیں اور بعض احباب نے تو حد ہی کر دی بلکہ حدنالوں جناب عالی ود کر دی اور اس ساری کھیڈ کو ”مردود کافروں“ کی کھیڈ قرار دے کر ہم پر گردن زنی

کا مطالبہ کر دیا اور فتویٰ جاری کر دیا کہ

وضع میں ہو تم نصاریٰ تو تمدن میں یہود
یہ مسلماں ہیں؟ جنھیں دیکھ کر شرمائے یہود

اور بھی اچھی خاصی گستاخیاں کر دی گئیں ہم نے ان گستاخیوں کو خاموشی سے پی لیا بلکہ دم بخود ٹائپ کی کوئی چیز بن کر چپ سادھ لی۔۔۔ کہ

بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا

لیکن صورت حال اُس وقت خراب ہوتے ہوتے رہ گئی جب ایک وکیل دوست نے حکومتِ وقت سے اس۔۔۔ مخل خرابی، آوارہ گردی بلکہ بدحالی۔۔۔ کہ جسکو عرف عام میں مہم جوئی یا پھر عمومی طور پر۔۔۔ سیر و سیاحت۔۔۔ کہتے ہیں پر ہی پابندی لگوانے کے لئے عدالت سے رجوع کرنے کا اپنا حتمی فیصلہ سنا دیا کہ نہ ہوگا بانس نہ بجے گی بانسری ہم نے جو وکیل صاحب سے کہا۔۔۔

ہم بھی منہ میں زباں رکھتے ہیں
کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

میاں وکیل صاحب! ایسی بھی کیا بے رخی کہ خواہ مخواہ میں ہی دل جلانے کی بات کرتے ہو، سیر و سیاحت پر پابندی لگوانے کی بات کرتے ہو۔۔۔ حالانکہ اللہ رب العزت خود قرآن میں فرماتے ہیں کہ۔۔۔ سیرو فی الارض۔۔۔ تو پھر قبلہ ہم پر ہی یہ قدغن کیوں؟۔۔۔ اور کچھ نہیں تو کچھ پرانی دوستی کا ہی لحاظ کر لیا ہوتا، کچھ پرانی لچھڑ قسم کی یاری کا ہی پاس ہو جاتا۔۔۔ یہ سننا تھا کہ وکیل صاحب یکدم ہی تڑخ کے بولے۔۔۔ ''رہنے دو میاں تم اپنی دوستی و دشمنی کو

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اُس کا آسماں کیوں ہو

میں نے نہایت عاجزی سے پھر کہا۔۔۔ ''حضرت جی! کچھ شکایت ہوتی ہے، کچھ تنگی ہوتی ہے، کچھ گلا ہوتا ہے، تب کہیں جا کر کچھ اعتراض ہوتا ہے۔۔۔ ہم سادھوں فقیروں سے ایسی بے رخی۔۔۔ کہ ہم تو۔۔۔

بدل کر فقیروں کا ہم بھیس غالبؔ
تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں

صاحب اِتنا غصہ۔۔۔ آخر کو سیر و سیاحت پر ہی کیوں اتنا غصہ۔۔۔ آخر کیوں ؟؟۔۔۔ تو وکیل صاحب یہ بڑی بڑی آنکھیں۔۔۔ لال سرخ اپنی تقریبا ساری ہی آنکھیں باہر کو نکالتے ہوئے غصے سے پھنکارتے ہوئے بولے۔۔۔ میاں اب آپ سے شکایتوں کے دفتر کھول کر اس کتے خصمی میں کون پڑے۔۔۔ اب تو آپ سے عدالت میں ہی بات ہوگی اور کیا خوب ہوگی، اپنی تیاری رکھ چھوڑیئے گا پھر نہ کہیے گا خبر نہ ہوئی۔۔۔ اُن کے یہ الفاظ آگ بن کر ہمارے پاؤں کے ناخنوں سے چڑھے اور خون کے ساتھ مل کر پلک جھپکنے میں دماغ تک پہنچ کر دماغ کو بھسم کر گئے، بلکہ دماغ کے سارے فیوز یکدم ہی اُڑ گئے۔۔۔ اچھا میاں وکیل صاحب۔۔۔ یہ سب اگر۔۔۔ کتے خصمی۔۔۔ ہے تو پھر کتے خصمی ہی سہی۔۔۔ جو جو تم سے بن پڑھتا ہے تم کر گزرو، ہرگز ہرگز ہماری یاری دوستی کا لحاظ مت کرنا، سر سے پاؤں تک کا زور لگا کر جو بنتا ہے وہ کر گزرو کہ ہم تو یہ سب چھوڑنے سے رہے کہ۔۔۔ چھٹتی نہیں کافر منہ سے لگی ہوئی۔۔۔۔۔ ہماری گرما گرمی نے اب کے جناب وکیل صاحب نے گرگٹ کی طرح رنگ بدلا اور بجائے جوابی گرما گرمی کر کے ماحول گرم کر کے تو تو میں میں پہ آتے۔۔۔ دھیرے سے مسکرائے اور میری اور جھکتے ہوئے بولے۔۔۔ میاں سیانوں سے سنا تھا کہ کتے کی دُم کو بارہ برس نلکی میں رکھا پھر دیکھا تو ٹیڑھی کی ٹیڑھی تھی۔۔۔ مگر آج اللہ کے فضل و کرم سے ان جیتی جاگتی آنکھوں سے یہ سب دیکھ بھی لیا۔۔۔ میاں ہم کو تم سے یہی امید تھی اور پھر جناب کا قصور بھی نہیں ہے کہ۔۔۔

یوں عشق میں ہر نقشہ الٹا نظر آتا ہے
مجنوں نظر آتی ہے، لیلیٰ نظر آتا ہے

وکیل صاحب نے نہایت متانت اور رحم طلب ہمدرد بھری نظروں سے ہمیں دیکھتے ہوئے مسکراتے ہوئے یہ جا وہ جا۔۔۔ ہم تو جیسے صاحب تلملا کر رہ گئے۔

(باقی باقی)

ارمان یوسف

لندن ایکسپریس

سورج نکلنے میں ابھی کچھ وقت باقی تھا۔ لاہور کے علامہ اقبال انٹرنیشنل ائرپورٹ پر موجود جہاز بھی اونگھ رہے تھے۔ ائرپورٹ کی پوری عمارت جگمگ جگمگ کر رہی تھی، چیک اِن میں ابھی خاصا ٹائم تھا۔ ہم اجمل بھائی، عادل نواز، خبیب گجر اور عثمان رانجھا کے ساتھ کافی شاپ پہ پہنچے۔ یہ حضرات ہمیں ائرپورٹ پر الوداع کہنے آئے ہوئے تھے، لاکھ سمجھایا کہ ہم اکیلے ہی چلے جائیں گے مگر کہنے لگے آپ کا کیا بھروسہ جہاز کی بجائے نیو خان پہ بیٹھ جاؤ۔ ہم دو روز قبل ہی لاہور پہنچے تھے، مگر یہ مت سمجھئے کہ کل ہی پیدا ہوئے، کیونکہ بزرگ فرماتے ہیں ''جنہیں لاہور نئیں ویکھیا او جمیا نئیں'' جبکہ ہم اس سے پہلے بھی سینکڑوں بار پیدا ہو کر سات جنم والے نظریئے کے دانت کھٹے کر چکے ہیں۔ گزشتہ دن ایک لحاظ سے بہت مصروف گزرا۔ کچھ وقت پی ٹی وی کے سابق ایگزیکٹو پروڈیوسر سلمان سعید کے ساتھ کیمپس پل پر فوٹوگرافی کرتے گزارا جبکہ داتا صاحب حاضری بھی دی اور حضرت اقبالؒ کو بھی سلام پیش کیا۔ مرتضٰی برلاس صاحب کی خدمت میں بھی کچھ دیر حاضر رہے۔ سرِ شام حافظ تجمل حسین، حافظ رمضان نیازی، وسیم خان بلوچ، عاصم رشید اور معظم حبیب سمیت چند دوستوں نے الوداعی پارٹی دی، گویا ہم لندن نہیں حج پہ چلے ہوں۔ وہاں بھی جائیں گے ایک روز، بلاوا تو آئے۔ سنا ہے کہ وہاں جانے کے لئے بلاوا ضروری ہے، صاحبِ حیثیت ہونا یا نہ ہونا دوسری بات ہے ۔

محبوب کی محفل کو محبوب سجاتے ہیں
آتے ہیں وہی جن کو، سرکار بلاتے ہیں

دن نکلتے ہی ائرپورٹ پر چہل پہل بھی بڑھنے لگی۔ ہم نے سوچا جاتے سے کچھ نوٹ ہی تبدیل کروالیں، قائد کے فوٹو والے کاغذی نوٹ دے کے ملکۂ برطانیہ والے لے لیں کہ وہاں یہی کام آئیں گے۔ کرنسی ایکسچینج پر پہنچے تو کاؤنٹر پر ایک لمبا جوان اور موٹی خاتون موجود تھی۔ بظاہر تو وہ کچھ کرتے نظر نہیں آ رہے تھے مگر نجانے کیوں اتنے مصروف تھے۔ مرد والے کاؤنٹر پر ایک کسٹمر ابھی ابھی پہنچا تھا جبکہ ہمارے حصے میں خاتون ہی آئی۔

''محترمہ نوٹ تبدیل کروانے تھے''

کوئی جواب، اشارہ یا حرکت نہ پا کر ہم نے ایک بار پھر گلا

صاف کرتے ہوئے قدرے اونچی آواز میں مدعا بیان کیا،مگر جواب ندارد۔

یا خدا یہ گونگے بہرے لوگ کہاں سے آ گئے!

اب کے ہم نے کچھ توقف کے بعد کاؤنٹر پر لگے شیشے کو انگلی سے بجاتے ہوئے عرضِ حال بیان کیا۔لگتا ہے مقبولیت کی گھڑی تھی۔محترمہ نے ایک ادائے بے نیازی کے ساتھ ہماری طرف دیکھا۔گویا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہی ہو، آیا ہم واقعی ایک شریف النفس اوراپنے کام سے کام رکھنے والے انسان ہیں یا محض نوٹ تبدیل کرنے کے بہانے سے چھیڑ خوانی کاارادہ رکھتے ہیں۔ہمارے چہرے کی معصومیت، جھکی ہوئی نگاہوں اور ہاتھ میں موجود نوٹوں کی گڈی سے محترمہ کو جب ہماری شرافت کا سرٹیفکیٹ مل گیا تو انہوں نے منہ سے ایک بھی لفظ ادا کئے بغیر سپاٹ چہرے کے ساتھ دایاں ہاتھ آگے بڑھایا اور پیسے وصول کئے۔بڑے آرام کے ساتھ گنتی کی اور بدلے میں ہمیں برطانوی پاؤنڈ پکڑا دیئے۔ہم نے نوٹ سنبھالے اور گنے بغیر ہی جیب میں ڈال لئے کہ ایسی بے ضرر سی عورت کہاں دھوکہ کر سکتی ہے۔ساتھ ہی ہم نے ہوا میں شکریہ ادا کیا اور چیک اِن کے لئے آگے بڑھ گئے۔ساتھ آنے والوں کو پہلے ہی الوداع کہہ چکے تھے۔اگرچہ وی آئی پی پروٹوکول کی آفر ایک حکومتی ذمہ دار شخصیت کی طرف سے مل چکی تھی مگر ہم نے شکریہ کے ساتھ انکار کر دیا تا کہ دیکھ سکیں نان وی آئی پی کے ساتھ کیا سلوک روا رکھا جاتا ہے۔

ہمارے سامنے پندرہ بیس لوگوں کی قطار لگی تھی اور کچھ آفیسر مسافروں کے بیگ کھول کر یہ دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے کہ کوئی ڈرگ وغیرہ ساتھ میں لے کے نہ جا رہا ہو۔ہم بھی لائن میں کھڑے ہو گئے اور اپنی باری کا انتظار کرنے لگے۔اِتنے میں ایک ڈرگ انسپکٹر ہمارے پاس آیا اور پوچھا ''کیا آپ کے پاس کوئی سگریٹ تو نہیں''

''صرف ایک ڈبہ ہے گولڈ لیف کا، کبھی کبھی پی لیتے ہیں''

''آپ جاسکتے ہیں''

یوں ہم محض اپنی شرافت کی بنیاد پر ابتدائی چیکنگ کے مراحل سے گزر گئے۔تھوڑا آگے شاید سکیورٹی کلیرنس کے جوان موجود تھے۔ہم سے پہلے ایک دیہاتی نوجوان جو ملازمت کے سلسلے میں دوبئی جا رہا تھا، کی چیکنگ کی جا رہی تھی۔اس کے بیگ سے سوہن حلوے کا ایک ڈبہ برآمد ہوا۔

''یہ کہاں لئے جا رہے ہو'' باوردی آفیسر نے پوچھا۔

''دوستوں کی فرمائش تھی بس انہی کے لئے ہے'' مسافر نے متانت سے جواب دیا۔

''اس میں کوئی چرس یا ہیروئن تو نہیں بھری ہوئی'' افسر نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔

''نہیں جناب! خالص دیسی گھی، شکر اور دودھ سے بنا ہے''

یہ سنتے ہی افسر کے منہ میں پانی بھر آیا، وہ کہنے لگا ''یار اِتنی دور ان کے لئے لے کے تو جا رہے ہو تھوڑا ہمیں بھی چکھا دو نا۔''

یہ کہتے ہی اس نے جیب سے پتلا سا ایک چاقو نکالا اور سوہن حلوہ کا ایک ٹکڑا کاٹ کر اپنی دراز میں رکھ لیا۔ساتھ ہی بولا ''تمہیں پتا ہے مٹھائی لے جانے کی اجازت نہیں ہوتی''

مسافر کچھ پریشان سا ہو گیا ''گھبراؤ نہیں، صاحب کو تھوڑا خوش کر دو''

اس نے اپنے ایک ساتھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔جواں سال مسافر سوچ میں پڑ گیا کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔

آفیسر پھر بولا ''صاحب بہت غصے والے ہیں سوچوں میں وقت ضائع مت کرو ورنہ خود بھی یہیں رہ جاؤ گے اور یہ مٹھائی بھی''

مسافر نے جلدی سے جیب میں ہاتھ ڈال کے پانچ سو روپے والا ایک نوٹ نکالا جو شاید مصیبت کی اس گھڑی میں کام میں لانے کو سنبھال رکھا تھا۔ہاتھ نیچے کئے آفیسر کی مٹھی میں وہ نوٹ اس راز داری اور احتیاط کے ساتھ رکھ دیا کہ فرشتوں کو بھی خبر نہ ہو۔اگلے ہی لمحے اسے کلیرنس مل گئی۔

اب ہماری باری تھی۔

''اس میں کیا ہے'' اس نے ہمارے معصوم سے بیگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''چند کتابیں، کپڑے، نیکر اور جرابیں ہیں، ایک ڈبہ سگریٹ کا بھی ہے''

ہم نے اپنے سامان کی تفصیل سے اسے آگاہ کیا۔
''سگریٹ آپ ساتھ میں نہیں لے جاسکتے'' یہ کہتے ہی وہ ہمارے بیگ کے اوپر جھک گیا اور بیگ کی زپ کھولنے لگا۔ ہماری طرف دیکھے بغیر ہی بولا ''صاحب جی کو مٹھائی کے پیسے دے دو ورنہ سیگریٹ نہیں جانے دیں گے''
ہم نے کچھ کہے بغیر آہستہ سے جیب میں ہاتھ ڈالا اور پرس نکالنے لگے۔ جونہی اس نے ہمارے ہاتھ میں موجود پرس کو دیکھا، بیگ کی ادھ کھلی زپ بند کرنی شروع کر دی۔ ہم نے جب دیکھا کہ چیکنگ ہوگئی ہے تو پیسے دیئے بغیر ہی پرس واپس جیب میں ڈال دیا۔اس نے بھی بیگ کی زپ دوبارہ کھولنی شروع کر دی اور بولا ''جلدی کرو پیسے نکال کے دے دو''
ہم نے دوبارہ جیب میں ہاتھ ڈالا۔اب کے اس نے بیگ کی زپ بند کر دی۔ ہم نے بیس روپے کا ایک نوٹ اسے دکھایا اور بولے کہ بس یہی ہے اور یہ بھی ہم نشانی کے طور پر ساتھ لئے جا رہے ہیں۔ یہ کہتے ہی ہم نے بیگ اٹھایا اور چل دیئے۔ چھ سات لوگ پیچھے قطار بنا چکے تھے،ان میں سے ایک چیکنگ کے لئے آگے بڑھ گیا۔خدا ہی جانے اگلے مسافر کے ساتھ کیا بیتی۔

انٹرنیٹ پر

ساس انٹرنیٹ پر ہے باس انٹرنیٹ پر
آگئی دُنیا کی ہر بکواس انٹرنیٹ پر

وہ کراچی سے جو منگھوپیر جا سکتے نہ تھے
جارہے ہیں آج کل ٹیکساس انٹرنیٹ پر

ایک چرواہے سے پوچھا آج کل کرتے ہو کیا
ہنس کے بولا بیچتا ہوں گھاس انٹرنیٹ پر

چیٹ کرتی تھی بہو اپنی سہیلی سے کہ "چپ
ہے ابھی تو میری اماں ساس انٹرنیٹ پر"

مے کشی ہو، عاشقی ہو، شاعری یا فیس بک
وقت کا ہوتا نہیں احساس انٹرنیٹ پر

کافی ہے اپنے لئے اسکرین اور "کی بورڈ" ہی
رکھ دیا ہم نے قلم قرطاس انٹرنیٹ پر

حسرت و بے چارگی کی ایک فوٹو ڈال کر
وہ جگاتے ہیں مرا احساس انٹرنیٹ پر

چار بچوں والی محبوبہ ہے بیوی آج کل
عشق ہم کو تو نہ آیا راس انٹرنیٹ پر

ہے بہت کچھ دوستو بازارِ حرف و صوت میں
آپ پتھر لیں کہ لیں الماس انٹرنیٹ پر

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

کوئی چارہ ساز ہوتا

شوکت جمال

ڈاکٹر کو مرا ہمدم جو، خدایا کرتا
ساتھ اس کے ہی میں دن رات بِتایا کرتا

میری راتیں بھی تصور میں گزرتیں اسکے
دن میں ملتا تو میں پھولا نہ سمایا کرتا

وہ امرجنسی میں ہوتا تو میں جاتا اکثر
لیٹ کر میز پہ حال اپنا سنایا کرتا

جب کبھی تیز محبت کی حرارت ہوتی
جا کے کیبن میں اسے نبض تھمایا کرتا

میل نرسوں کے حوالے وہ نہ کرتا مجھ کو
نرم ہاتھوں سے ہی اِبرہ وہ لگایا کرتا

نیوروسرجن جو وہ ہوتا تو میں مل کر اس سے
سر میں سودا ہے ترا، اس کو بتایا کرتا

سیکھ لی ہوتی اگر فزیوتھیراپی اُس نے
گردنیں میرے رقیبوں کی دبایا کرتا

ہوتا ڈینٹسٹ اگر وہ تو کلینک جا کر
منہ میں جو دانت بچے ہیں وہ دکھایا کرتا

وہ بلڈ بنک میں ہوتا تو لٹا کر مجھ کو
خون دشمن کا مرے، مجھ کو چڑھایا کرتا

سائکولوجی میں ہوتی اگر اس کو شُد بُد
میں علاج اپنے جنوں کا بھی کرایا کرتا

گائنی وارڈ میں جانا ذرا ہوتا مشکل
کارڈیالوجی میں ہوتا تو میں جایا کرتا

شعبۂ اس کا جو اَنستھیسیا ہوتا شوکتؔ
اُس کی بانہوں میں ہی میں ہوش گنوایا کرتا

تری برتھ ڈے پہ یہ ہے دعا
ترا دل خوشی سے نہال ہو
تری زندگی کا یہ دن صنم
کسی ورتھ ڈے کی مثال ہو
ترے روز و شب رہیں شائننگ
بڑا گولڈن ترا سال ہو
ترا رنگ روپ گلو کرے
ترے حسن کو نہ زوال ہو
تری شخصیت رہے چارمنگ
ترا فیسی نیٹ خیال ہو
رہے انّوسینٹ تُو اِس قدر
کوئی جیسے باربی ڈال ہو
تری زندگی کا ہر اِک کلر
سدا رین بو کی مثال ہو
ڈیئر اینجلک مری جانِ جاں
ترا اینڈ لیس یہ جمال ہو
نہ ہی شارٹ ہو تری ہیپی نس
نہ عروج میں کبھی فال ہو
جو پلانٹ گھر میں لگائے تُو
وہ ہر اِک درخت سے ٹال ہو
ہو فروٹ فل ترا یوں شجر
کہ ہر اِک جھکی ہوئی ڈال ہو
کرے یوں کلک ترا آئی ڈیا
وہی ہر کسی کا خیال ہو
تری ہسٹری ہے بیوٹی فل
سو فیوچر اور کمال ہو
تری ایج لانگ ہو اِس قدر
نہ کلنڈروں میں وہ سال ہو
تجھے سیڈ نس نہ ملے کبھی
سدا دور تجھ سے ملال ہو

ترے ذہن میں جو ڈریم ہے
وہ ری ایلیٹی میں فعال ہو
ترا رائی ول نہ رہے کوئی
سدا پیس شاملِ حال ہو
ترے ویل وشرز کثیر ہوں
ترے ارد گرد دھمال ہو
ترے فیصلوں کے اپوز کی
کسی شخص میں نہ مجال ہو
ترا ہر سفر ہو بریک لیس
تری رہ میں کوئی نہ وال ہو
تجھے ہر قدم پہ ہو وکٹری
ترا اور ہائی مرال ہو
جو بھی ڈس کنکٹ ہے ہو چکا
ترا رابطہ وہ بحال ہو
رہے اِس قدر تُو سپیریئر
کوئی ملنا ایسا محال ہو
رہے لگژری میں تُو عمر بھر
ترے پاس اتنا ریال ہو

ب پروف

احمد علوی

اک نجومی کو دکھایا ایک دن میں نے جو ہاتھ
اس نے فرمایا بتاؤں راز کی اِک تجھ کو بات
بند کر رکھے ہیں لفظِ ب نے سارے راستے
صرف ب خطرہ ہے تیری زندگی کے واسطے
وجہِ بربادی تری ب کے سوا کچھ بھی نہیں
زندگانی میں تری ب سے برا کچھ بھی نہیں
کچھ نہیں بگڑے گا تیرا تیر اور تلوار سے
بچ نہیں سکتا کسی بھی طرح ب کی مار سے
سانپ سے بچ جائے گا پر مار دے گا تجھ کو بوم
ب میں تیری موت ہے یہ کہتا ہے علم نجوم
علم کہتا ہے مرا بے بات کی باتوں سے بچ
ان چمکتی بجلیوں بادل سے برساتوں سے بچ
پہلی ہی فرصت میں دیدے نیک بیوی کو طلاق
مار ہی ڈالے گا تجھ کو بارہ بچوں کا فراق
بند گوبھی، اور بینگن کی محبت چھوڑ دے
فرش پر سو بیڈ اور بستر کی چاہت چھوڑ دے
برفی و بالائی اور بنگالی رس گلہ ہے زہر
جس پہ تو مرتا ہے بشرہ اور بسم اللہ ہے زہر
خیریت چاہے اگر باجی کے گھر بمبئی نہ جا
زہر ہے تیرے لئے بکرے کی بریانی نہ کھا
دور رہنا ہے اگر تجھ کو اندھیری قبر سے
بکل اتساہی سے بچنا اور بشیر بدر سے
ب سے اتنا ڈر گیا ہوں بولنا بھی بند ہے
گفتگو لکھ کر کروں منھ کھولنا بھی بند ہے
ب کو جب سوچا تو ب ہی کا بس پھیلا ہے جال
ب ہی ب چاروں طرف ہے ب تو ہے پورا وبال
ب سے بیٹی ب سے بیٹا ب سے ہی بنتا ہے باپ
سوچئے کیا زندگی میں ب سے بچ سکتے ہیں آپ
کیا کہوں بیوی کے اک بوسے سے بھی ڈرتا ہوں میں
بیوی کو وائف سمجھ کر کس کیا کرتا ہوں میں
ایک ہیں میرے لئے بدشکل ہوں یا بیوٹی فل
باغ میں بلبل کے نغمے موت کا میری بگل
بیسویں بائسویں تاریخیں مجھ پر ہیں گراں
اک قیامت بن کے آتا ہے مہینہ بارہواں
ب سے بم بارود اور بندوق بھی ب سے بنیں
ب سے برتن ب سے بچے ان سے کس طرح بچیں
ب سے بچتے بچتے مولا بن گیا ہوں بے وقوف
ب سے ناممکن ہے بچنا کردے مجھ کو ب پروف

نشتر امروہوی

گوشت کا شکوہ

کیوں غلط کام کروں فرض فراموش رہوں
کیوں نہ فرض اپنا ادا کر کے سبکدوش رہوں
طعنے بیگم کے سنوں اور ہمہ تن گوش رہوں
ہمنوا میں کوئی بدھو ہوں کہ خاموش رہوں
جرأت آموز مری تابِ سخن ہے مجھ کو
شکوہ سرکار سے خاکم بدہن ہے مجھ کو

چاپ کی اور نہاری کی خیالی دنیا
بٹ کلیجی سے ہوئی پائے سے خالی دنیا
گوشت غائب ہوا سبزی نے سنبھالی دنیا
ساگ شلجم سے ہی کرتی ہے جگالی دنیا
مشکلیں آن پڑی ہیں انہیں آساں کردے
جنسِ نایاب کو پھر سے یہاں ارزاں کردے

گوشت خوری کے لئے ملک میں مشہور ہیں ہم
پچھلے کچھ روز سے ہی بیکس و مجبور ہیں ہم
قورمہ ہی نہیں بریانی سے مہجور ہیں ہم
تکّے کھانے سے کبابوں سے بھی معذور ہیں ہم
"اب ذرا شکوۂ اربابِ وفا بھی سن لے"
خوگرِ گوشت سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے

ہے نہ کچھ تیغ زنی اپنی حکومت کے لئے
سر بکف ہم نہیں کچھ مال کے دولت کے لئے
ہم سیاست کے لئے ہیں نہ عداوت کے لئے
ہم تو جیتے ہیں فقط گوشت کی چاہت کے لئے
یوں صبح و شام روایت یہ نبھائی ہم نے
دال سبزی بھی بنا گوشت نہ کھائی ہم نے

اب تو اُس شہر میں ہی گوشت ہوا ہے نایاب
گوشت خوروں کی جہاں حد ہے کوئی اور نہ حساب
ہو گئے ہیں یہاں کچھ ایسے ہی حالات خراب
کوفتے روٹھے ہیں ناپید ہیں ٹُنڈے کے کباب
گوشت ملتا نہیں اس واسطے سب پاگل ہیں
اب دہی پھلکی ہے بڑیے ہیں کڑھی چاول ہیں

گوشت کے واسطے ہر دن سحر و شام پھرے
کچھ بھنڈیلے پھرے میراثی و حجّام پھرے
کہیں خدّام پھرے اور کہیں حکّام پھرے
اور جہاں بھی گئے ہر کوچے سے ناکام پھرے
اینٹ ماری کبھی پتھر کبھی روڑے ہم نے
رات میں جنگلی کبوتر بھی نہ چھوڑے ہم نے

کس قدر جلوے تڑپتے ہیں ہر اک سینے میں
لطف کھانے میں ہے باقی نہ مزا پینے میں
خود کو ہی کوستے رہتے ہیں سب آئینے میں
کیا مزا آئے بھلا گوشت بنا جینے میں
آج بیگم نے بہت دن میں یہ کی ہے تدبیر
کچھ نہاری کے مسالحے میں بنایا ہے پنیر

آگیا ہے کوئی مہمان جو گھر میں بالخیر
اب میسّر ہے نہ مرغا نہ ہی تیتر نہ بٹیر
دال کھاتا نہیں بزدل ہو کہ ہو کوئی دلیر
لاکھ بھوکا ہو مگر گھاس نہیں کھائے گا شیر
گوشت خوری کی ہوس ایسے مٹائی ہم نے
مرغی دربے سے پڑوسن کے چرائی ہم نے

گوشت ملتا تھا تو ہر بات کی آسانی تھی
چاپ کھالیتے تھے اسٹو کبھی بریانی تھی
جمعہ کو گوشت نہ ملنے پہ بھی حیرانی تھی
ساری دنیا ہی میاں گوشت کی دیوانی تھی
اب نہ تکّے نہ نہاری نہ یہاں پائے ہیں
مرغ و مچھلی میں کسے روز مزے آئے ہیں

اب تو یہ کہتے ہوئے مجھ کو بھی آتا ہے حجاب
مرغ و ماہی سے شکم ہو نہیں سکتے سیراب
ٹکّی آلو کی نظر آئی ہمیں مثلِ کباب
گوشت سے جیسے خفا ہوگئے سارے قصاب
اب تو ہر حال میں رسوائی ہے، ناداری ہے
کیا ترے شہر میں رہنے کے عوض خواری ہے

ایک نئی سائنسی تحقیق

ڈاکٹر عزیز فیصل

نیوٹن نے جس سیب کو گرتے دیکھ کر
کششِ ثقل کا نظریہ پیش کیا
جدید ترین گروپ ریسرچ کے مطابق
وہ سیب
حسب ونسب میں نہ تو
ہڑی، فرانسی، کنگ اسٹار، کشمیری، باسوٹی، سوٹہ یا کالا کولا
تھا
نہ ہی اس سیب کے آبا واجداد
ایسی سرزمین کے باشندے تھے
جہاں
رئیل گالا، سمریٹ، گالا ماس اور مونڈی گالا
جیسے سیب
مصنوعی یا قدرتی طریقوں سے کاشت کیے جاتے تھے،
یہ تصور کرنا بھی کھلی جہالت کے مترادف ہوگا
کہ اس تاریخی سیب کی رشتے داری کے ڈانڈے
گاجرہ، ریڈ چپس وغیرہ سے ملتے ہیں
یا اس کے ددھیال اور ننھیال میں سے کوئی
مالوچی اور وطنی نسل کے سیبوں کا فیس بک فرینڈ رہا ہے
بلکہ
نئے دستیاب ڈیٹا او بچے کھچے نمونے کے تجزیے سے
ثابت ہوا ہے
کہ وہ سیب، دراصل
سیب جیسا حلیہ رکھنے والی
آئرلینڈ کی ایک ایسی ناشپاتی تھی
جس کی نسل جنگِ عظیم اول کے زمانے میں
صفحۂ ہستی سے نیست ونابود ہو چکی ہے۔
اور اب
اسی ناشپاتی اور سیب کی پیوند کاری سے
نئے پھل بنانے کی تجرباتی مشق
ایک سائنسی تجربہ گاہ میں جاری وساری ہے

بددعائیں

اسحٰق وردگ

اے ٹرمپ۔۔۔!
اللہ کرے تجھے تاحیات ہچکیں لگے
اور جعلی ڈاکٹر تجھے غلط انجکشن لگائے
اور جس سے تیری جنس تبدیل ہو جائے
اور پھر گوجرانوالہ کے کسی پہلوان سے تیری شادی ہو
جو نسلاً کشمیری ہو
اور وہ تجھ سے چن چن کے بدلے لے
اللہ کرے
فٹے منہ ٹرمپے۔۔۔!
تیرا خربوزہ، آم، خوبانی، آلوچہ، چاکلیٹ، کیک سب
پھیکے نکلیں
ٹرمپو۔۔۔!
تیری بیٹی کسی سردار کے ساتھ بھاگ جائے
اور تو کھوتے جیسا منہ لے کے اسے دردر ڈھونڈے
تیرے وائٹ ہاؤس کی بجلی کا انتظام واپڈا کے ہاتھ چلا
جائے
اور تو بغیر استری کے کپڑے پہننے پر مجبور ہو
اندھیرے میں چیخ چیخ کے پریس کانفرنس کرے
تو نہانے جائے اور اپنے پیڑے منہ پر صابن لگائے
تو نلکے میں پانی نہ آئے
تجھے عمر شریف اپنے شو میں بلا کر ذلیل کرے
تو افریقہ کے جنگلوں میں کھو جائے اور پھر تجھے پاگل
بندروں سے واسطہ پڑے
تو ان بندروں کو گوری اور موٹی بندریا کی طرح دکھائی
دے
وہ بندر ذہنی، جنسی، جلدی ہر طرح کے مریض ہوں
تیری بیوی کسی خلائی مخلوق کے ساتھ بھاگ جائے
تیری کرسمس ایسے ہی خراب ہو جیسے تو نے ہماری عید
خراب کی
تیرا کرفیو کے دن گلو بٹ سے واسطہ ہو
تو الطاف بھائی کے ساتھ کمرے میں بند ہو جائے
اور وہ تجھے اپنی ساری تقریریں جملہ مدہوشی و بدحواسی
کے ساتھ سنائے
ظفر اقبال تجھ پر ایسا کالم لکھے کہ تو شرم کے مارے نالہ
لئی کے سیلابی ریلے میں کود جائے
اللہ کرے تجھے بھی امریکا میں عمران خان جیسا پاگل
اپوزیشن لیڈر مل جائے جو تیرے سر پر بیٹھ کر تیرے یہ
منحوس بال نوچ کر دھرنا دے
اللہ کرے کوئی افغانی پٹھان زبردستی تجھے دوستی پر مجبور
کرے
تجھے مودی گائے کے پیشاب والی چائے پلائے
تجھے ایسے مشیر ملیں جو نواز شریف کو ملے ہیں۔۔۔جو
تجھے رسوا کر دیں
اور تیرے بھی گو ٹرمپ گو کے نعرے لگیں
اللہ کرے تو مائیک بن جائے۔۔۔اور شہباز شریف
کے ہتھے چڑھ جائے!

دوستو تم آج کے دن مجھ سے ملنا چاہتے ہو تو ذرا اپنی ہی ذمہ داری پر آؤ کہ میں روزے سے ہوں
میرے گھر والوں کا کہنا ہے کہ آتا ہے کڑک مرغی سے بھی بڑھ کر مجھے ہر شخص پر تاؤ کہ میں روزے سے ہوں

حسن اب بھی سرسراتے آنچلوں کی اوٹ میں سے جھانک کر اکثر مجھے دیتا ہے نظارہ گناہِ دید کا
اس ستمگر سے کوئی کہہ دے خدارا آج تو میری نگاہوں کو کن انکھیوں پر نہ اکساؤ کہ میں روزے سے ہوں

جب بھی ان کو شغلِ چاٹا چوٹی میں مصروف پاتا ہوں تو سگریٹ کی طلب کر دیتی ہے پاگل مرے احساس کو
اپنے ان معصوم لولی پاپ کھاتے بچوں کو میری نظر کے سامنے سے دور لے جاؤ کہ میں روزے سے ہوں

مہربانو! تم کو کس کالی زباں والے نے دی جھوٹی خبر کہ میں دیانت داری کی بیماری میں ہوں مبتلاء
میں یہ چاہتا ہوں کہ رشوت میں سے جو حصہ ہے میرا وہ مجھے تم بعد میں ارسال فرماؤ کہ میں روزے سے ہوں

توند یہ میری دلاری توند جس کو اس گرانی کے زمانے میں بھی پالا پوسا ہے میں نے نہایت مان سے
عرصۂ افطار تک اس کو جمالِ زردہ و بریانی کی روح افرا باتوں سے نہ تڑپاؤ کہ میں روزے سے ہوں

جاؤں تو دفتر میں میری روز کی چائے سموسے کھانے کی عادت کو پڑ جاتی ہے میری پرسشِ احوال کی
خیریت میری مسلمانی کی تم کو چاہئے تو مجھ کو بستر سے زبردستی نہ اٹھواؤ کہ میں روزے سے ہوں

تم کو تو معلوم ہے کہ گرمیوں میں سولہ گھنٹے روزے کو بہلائے رکھنا کوئی خالہ جی کا گھر ہوتا نہیں
وقت کتنا ہو گیا مشکل تو آ جاؤ مرے گھر اور ہاں اک تاش کی گڈی بھی لے آؤ کہ میں روزے سے ہوں

ابّے کی فریاد

محمد عارف

مُثلث ، مُسدس ، مربع بنوں گا
بنائے گا جو ، میرے ربا بنوں گا
پر اگلے جنم میں نہ ابا بنوں گا
مسائل تمھیں دوستو کیا بتاؤں
کہاں تک سُنو گے کہاں تک سُناؤں

انھیں دال روٹی میسر نہیں ہے
مہینوں میں بوٹی میسر نہیں ہے
بدن پر لنگوٹی میسر نہیں ہے
بتاؤ تمھی ، ان کو کیسے پڑھاؤں
کہاں تک سُنو گے کہاں تک سُناؤں

مرے پیٹ پر ایک لیٹا ہوا ہے
تو دوجے کو میں نے لپیٹا ہوا ہے
یہ آواز آئی کہ بیٹا ہوا ہے
بیک وقت میں تین جھولے جھلاؤں
کہاں تک سُنو گے کہاں تک سُناؤں

سنبھلتے نہ تھے اپنے شیطان بچے
اور اُوپر سے آئے ہیں مہمان بچے
سو اب ہیں بہ دست و گریبان بچے
کسے روکوں، کس کس کو آنکھیں دکھاؤں
کہاں تک سُنو گے کہاں تک سُناؤں

گئے وقت میں کس قدر تھا توانا
کوئی پوچھتا ہی نہ تھا آنا جانا
بہت یاد آتا ہے گزرا زمانہ
نصیبوں پہ اپنے میں آنسو بہاؤں
کہاں تک سُنو گے کہاں تک سُناؤں

انجینئر محمد عادل فرازؔ

نشتر امروہوی

کی طنزیہ شاعری کا پوسٹ مارٹم

آج کے اس دور میں ہم جس ماحول میں جی رہے ہیں اور سانس لے رہے ہیں وہ ذہنی الجھنوں اور کشمکش سے لبریز ہے۔ ایسے پُر آشوب دورِ حیات میں ایک ذرا سی خوشی یا مزاحیہ جملہ بھی ہم کو کچھ لمحے کے لئے ایک پُر سکون دنیا میں لے جاتا ہے اور فضا خوشگوار کر کے ذہنی الجھنوں میں تسکین کا سبب بنتا ہے۔ گویا کہ مزاح کا سہارا لے کر قلبی سکون حاصل کیا جاسکتا ہے اور اگر کسی عمل یا جملے میں مزاح کے ساتھ طنز بھی شامل ہوجائے تو مئے دو آتشہ کا کام کرتا ہے۔ یعنی طنز و مزاح کے توسل سے انسان اپنی جملہ تکالیف اور پریشانیوں کو بھول کر ان کا علاج اپنے آس پاس تلاش کرتا ہے اور اگر طنز و مزاح کسی فن پارے پر مشتمل ہو خواہ وہ نثر کی صورت میں ہو یا نظم کے پیرائے میں یہ طنز و مزاح دیر تک اور دور تک اپنا عمل انجام دے کر حیاتِ انسانی کو خوشگوار بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ سماج میں فلاح اور بہبود کو روا رکھنے کے لئے بھی انتہائی کارآمد ہوتا ہے کیونکہ ایک اچھا فنکار بحیثیتِ مصلح ہوتا ہے۔

ابتداء سے لیکر آج تک اردو ادب میں نہ جانے کتنے طنز و مزاح کے شعراء آئے ان میں سے کچھ وقت کی قبر میں معدوم ہوگئے تو کچھ زمینِ طنز و مزاح پر آج بھی گل و لالہ کی مانند مثلِ خوباں اپنے حسنِ فن کی خوشبو بکھیر رہے ہیں۔ یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہے کہ کوئی بھی صاحبِ قلم کتنا ہی سنجیدہ مزاج رکھتا ہو وہ زندگی میں بغیر طنز و مزاح کے نہیں رہ سکتا یعنی تخلیق کار کی تخلیق میں کہیں نہ کہیں طنز و مزاح کا رنگ نظر آتا ہے۔ یہ رنگ ان لوگوں کے یہاں وافر مقدار میں ملتا ہے جو طنز و مزاح کو اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کی آماجگاہ بناتے ہیں۔

ہم دیکھتے ہیں خواہ وہ قلی قطب شاہ ہوں، ولیؔ ہوں، سراجؔ اورنگ آبادی ہوں یا شمالی ہند کے شعراء ان کے یہاں کہیں نہ کہیں

طنز و مزاح مل جاتا ہے سامنے کی مثال کے لئے غالبؔ کو لیا جاسکتا ہے۔ان کے خطوط ہوں یا ان کی شاعری شوخی وظرافت کے ساتھ ساتھ طنز کی نمایاں مثالوں سے پُر ہے۔ مثلاً غالبؔ اپنے ہم عصر شاعر ذوقؔ کو اپنی شاعری میں اکثر طنز و مزاح کا مرکز بنا کر ان سے شکوہ بھی کرتے ہیں اور ان کا مذاق بھی اُڑاتے ہیں جس بات کا ثبوت ان کی فی البدیہہ کہی ہوئی غزل ہے ۔

تمہیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے
ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے

یہ طنز و مزاح غالبؔ کے بعد بھی خوب پروان چڑھا کیونکہ عوام نے اس میں اپنی دلچسپیوں کی بہت سی صورتوں کی نمود پائی۔ یہ فنِ ظرافت جب اکبرؔ الہ آبادی کی بارگاہ میں پہنچا تو اس میں ایک نئے رُخ سے وسعتوں کے چراغ روشن نظر آئے۔ان کے بعد بہت سے شعراء نے اس گلشن کو سرسبز و شاداب رکھنے کی حتی الامکان کوشش کی یعنی مزاحیہ شاعری میں اپنے فن کے ایسے جوہر دکھائے جو انتہائی قابلِ ستائش قرار دئے گئے۔ان شعراء میں سرِ فہرست مجیدؔ لاہوری، سید ضمیرؔ جعفری، ظریفؔ لکھنوی، ماچسؔ لکھنوی، ناظرؔ خیامی، راجہ مہدی علی خاں، دلاور فگارؔ، رضا نقوی واہیؔ اور ساغرؔ خیامی وغیرہ نے کافی مقبولیت حاصل کی۔

جب سے مشاعرے یا شعری نشستیں وجود میں آئیں طنز و مزاح کی ترویج کا بہت بڑا حصہ انھیں کے مقدر میں آیا۔ان شعری مجلسوں نے جہاں سنجیدگی کو اپنا طرۂ امتیاز بنایا وہیں طنز و مزاح کے زیور سے بھی خود کو آراستہ رکھا۔دورِ حاضر میں بھی یہ کام مشاعروں اور شعری نشستوں کے ذریعے سے کیا جارہا ہے۔موجودہ دور میں طنز و مزاح کے جن شاعروں نے مقبولیت حاصل کی ہے ان میں ڈاکٹر نشترؔ امروہوی کا نام سرِ فہرست ہے۔

امروہہ کی مردم خیز سرزمین سے تعلق رکھنے والے شاعر ''ڈاکٹر نشترؔ امروہوی'' آج کے دور میں محتاجِ تعارف نہیں ہیں۔ان کی شاعری کی ابتداء ۱۹۷۲ء میں ہوئی اور اس راہ پر وہ آج تک مستعد ہیں۔انھیں مختلف تنظیموں کی جانب سے مختلف القاب و خطابات اور اوارڈ سے بھی نوازہ گیا جن میں ''تیرِ قلم'' اور ''دلاور فگار ایوارڈ'' قابلِ ذکر ہیں۔ان کی شاعری غم کی اندھیری چھاؤں میں احساسِ سرخوشی کی مشعل ہاتھ میں لیکر افسردگی اور اندوہ ناکی سے اعلانِ بغاوت کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔وہ اپنے اندر مختلف دلکش رنگوں کو سمیٹ کر جس کے ماحول میں قوسِ قزاح کی مانند اپنی جاذبیت کا جادو بکھیرتی ہے اور عالمِ شعور سے وابستہ انسان کی جمالیاتی حس کو بیدار و متحرک کرنے کا عمل انجام دیتی ہے۔

جہاں آج کل کے شاعر لطیفہ سازی اور نازیبا الفاظ کو بھی شاعری میں پیش کرنے سے گریز نہیں کرتے وہیں موصوف کی شاعری ان چیزوں سے اپنا دامن بچاتی ہوئی صحنِ ادب میں گل کاری کے عمل میں سرگرداں و سفر پیرا دکھائی دیتی ہے۔وہ ایک ایسی فضا عام کرنا چاہتے ہیں جس کو پڑھنے اور سننے کے بعد افراد اپنے مستقبل کی راہ ہموار کرسکیں اور اپنی کمیوں اور خامیوں کا تجزیہ کر سکیں۔ان کو سماج میں ہورہی تبدیلیوں، تغریات، حادثوں، پریشانیوں، کرب اور بے چینی کو بیان کرنے کا خوب صورت ہنر آتا ہے۔وہ الفاظ کا ایک ایسا جادو بکھیرتے ہیں کہ ایک پورا منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے اور قاری خود کو اسی دنیا میں پاتا ہے۔مثال کے لئے ان کی مقبول ترین نظم ''دعوتِ ولیمہ'' پیش کی جاسکتی ہے۔جس میں انھوں نے ایک ولیمہ کی دعوت کا منظوم ذکر کیا ہے۔اس نظم کا ایک بند دیکھیں:

میزوں پہ تھی سجی ہوئی ہر چیز بر محل
خوشبو بڑھا رہی تھی بہت بھوک کا عمل
بریانی قورمہ وہیں روٹی اغل بغل
چٹنی اچار رائتہ اور چاٹ کے تھے پھل
اسٹال میں سجی ہوئی ہر شئے عظیم تھی
کوفی تھی، کولڈرنگ تھی، آئس کریم تھی

اس بند کو دیکھنے کے بعد نشترؔ صاحب کے قدرتِ کلام اور ان کے فنِ پیکر تراشی پر بے ساختہ داد دئے بغیر کون رہ سکتا ہے۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ میر انیسؔ کے ہنرِ منظر کشی کے نقشِ قدم پر قدم رکھ کر محاکات کی ایک نئی دنیا آباد کر رہے ہیں۔ اس نظم کو پورا پڑھیں تو اس سلسلے سے مزید ثبوت فراہم ہوں گے کہ وہ ایک مصور

کی حیثیت سے شاعری کی دنیا میں اپنے تخیل کے زور سے اپنی انفرادیت قائم کرنے میں سرگرم عمل ہیں۔

ان کی نظم ''نان گوشت'' بھی پڑھنے کے لائق ہے جس میں وہ نان گوشت کا قصیدہ پڑھتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

جب بھی ہمارے سامنے آتا ہے نان گوشت
خوشبو سے اپنی دل کو لبھاتا ہے نان گوشت
ایسا دل و دماغ پہ چھاتا ہے نان گوشت
کھانے میں چار چاند لگاتا ہے نان گوشت
یوں تو مٹن ہے اور چکن بے حساب ہے
کھانے میں نان گوشت مگر لاجواب ہے

نشتر امروہوی نے علامہ اقبال سے بھی استفادہ کیا ہے۔انھوں نے علامہ اقبال کی نظم ''شکوہ'' اور ''جوابِ شکوہ'' کی طرز پر نظمیں لکھیں۔جس میں وہ بیگم سے شکوہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔مثال کے طور پر ''شکوہ'' کا یہ بند دیکھیں۔

کیوں غلط کام کروں فرض فراموش رہوں
کیوں نہ فرض اپنا ادا کر کے سبکدوش رہوں
طعنے دنیا کے سنوں اور ہمہ تن گوش رہوں
ہمنوا میں کوئی بدھوں ہوں کہ خاموش رہوں
جرأت آموز مری تابِ سخن ہے مجھ کو
شکوہ بیگم سے یہ خاکم بدہن ہے مجھ کو

''شکوہ'' پڑھ کر بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کا ذہنِ رسا کس قدر بلند پرواز ہے۔اُس کے بعد ''جوابِ شکوہ'' بھی لاجواب اور نہایت متاثر کن نظم ہے۔

آہ جب دل سے نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
گلشنِ زیست جلانے کو شرر رکھتی ہے
توپ تلوار نہ یہ تیغ و تبر رکھتی ہے
بنتِ حوا کی طرح تیز نظر رکھتی ہے
اِتنا پُر سوز ہوا نالۂ سفاک مرا
کر گیا دل پہ اثر شکوۂ بے باک مرا

کسی بھی بڑے شاعر سے اس طرح فیض اُٹھانا کہ انفرادیت

معروف انگریزی ادیب ''ایچ جی ویلز'' جب سخت بیمار ہوا اور زندگی کی کوئی رمق باقی نہ رہی تو اس کے رشتہ دار دوست احباب اور لواحقین کی خواہش تھی کہ اس کے منہ سے کچھ ایسے الفاظ نکلیں کہ جو بطور یادگار ہمیشہ یاد رکھے جائیں۔جب لوگوں نے بار بار اس عظیم مصنف کو تنگ کیا تو اس نے اپنی خاموشی کا قفل توڑتے ہوئے نہایت تلخ لہجے میں جواب دیا ''تم لوگ دیکھ نہیں رہے کہ میں اس وقت مرنے میں مصروف ہوں۔''

برقرار رہے مشکل کام ہے لیکن وہ یہاں کامیاب نظر آتے ہیں۔انھیں مشہور مصرعوں پر تضمین کرنے کا فن بھی خوب آتا ہے۔ مثلاً:

بیٹے کو ساتھ لے گئے اک مہ جبیں کے گھر
عاشق تو ہو ہی جاتے ہیں پیدل دماغ سے
بیٹے نے ماں سے کہہ دیا سارا معاملہ
''اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے''

وہ جگہ جگہ ازدواجی زندگی کو بھی طنز کا نشانہ بناتے ہیں۔مثلاً ان کی نظم ''بیویاں'' اس سلسلے سے پیش کی جا سکتی ہے۔

شادی کے بعد گھر میں جب آتی ہیں بیویاں
شرم و حیا کا ڈھونگ رچاتی ہیں بیویاں
پہلے تو شوہروں کو پٹاتی ہیں بیویاں
تگنی کا ناچ پھر یہ نچاتی ہیں بیویاں
ہر شب شبِ برات بناتی ہیں بیویاں
کچھ دن کے بعد چھکے چھڑاتی ہیں بیویاں

ان کی ایک نظم ''بیگم اور شاعری'' بھی قابلِ تعریف ہے۔

ایک دن مجھ سے یہ فرمانے لگی بیوی میری
میری سوتن بن گئی ہے آپکی یہ شاعری
سوچتی ہوں کس طرح ہوگا ہمارا اب نباہ
مجھ کو روٹی چاہئے اور آپ کو بس واہ واہ

پوری نظم پڑھ جایئے بیگم اور شاعری کا تصادم قہقہہ لگانے پر بار بار آمادہ کرتا ہے اسی طرح ''شادی سے پہلے'' اور ''شادی کے بعد'' بھی اپنی مثال آپ ہیں۔

منیر نیازی ایک دفعہ کراچی پہنچے تو جون ایلیا نے انہیں کہا
''منیر خان تمہارے تو سارے بال سفید ہوگئے ہیں!''
منیر نیازی نے برجستہ جواب دیا ''بچو! جو مجھ پر گزری ہے تم پر گزرتی تو تمہارا خون سفید ہوجاتا۔''

نشتر صاحب طنز و مزاح کے پردے میں بڑے سلیقے سے اصلاح کا کام انجام دیتے ہیں۔ وہ عورتوں کے پردے کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

بہن ہو بیٹی ہو بیوی ہو یا کہ پھر ماں ہو
کوئی بھی روپ ہو لیکن حیا ضروری ہے
بتا رہا ہے یہ ہم کو غلاف کعبہ کا
جو محترم ہیں انھیں کو ردا ضروری ہے

یعنی ان کا کمال یہ ہے کہ وہ جہاں اپنی شاعری میں طنز و مزاح کے نشتر سے وار کرتے ہیں وہیں سنجیدگی کی تیغ کا بھی لوہا منواتے ہیں۔

انھوں نے متوسط طبقے کے حالاتِ زندگی کو بھی ہنرمندی کے ساتھ بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ نظم ''ابھی پے نہیں ملی'' وہ اپنی بیگم سے مخاطب ہو کر سماج کی تلخ حقیقت کو دلکش پیرائے میں منظم کرتے ہیں۔

تو پرس مت نکال ابھی پے نہیں ملی
اور دیکھ میرا حال ابھی پے نہیں ملی
پچکے ہوئے ہیں گال ابھی پے نہیں ملی
ہوں قربِ انتقال ابھی پے نہیں ملی
کر بند قیل و قال ابھی پے نہیں ملی
کیوں کا ہے کیا سوال ابھی پے نہیں ملی

ایک دوسری نظم ''ابا کا چالیسواں'' بھی اسی موضوع پر ہے کہ ایک مڈل کلاس شخص پریشانیوں اور دقتوں کے باوجود قرض لے کر زیادہ سے زیادہ روپیہ پیسا خرچ کر کے اپنے والد کا چالیسواں کراتا ہے۔

بوڑھے غریب باپ کے مرنے پہ دفعتاً
بیٹے نے سوچا کیسے کروں دفن اور کفن
اپنے یہاں تو موت میں خرچ کا ہے چلن
غم سے نڈھال بیٹے کے ماتھے پہ تھی شکن
جو کچھ تھا پاس دفن و کفن میں اٹھا دیا
خرچے نے پھر تو موت کا صدمہ بھلا دیا

موصوف کی نظر سماج کے تقریباً تمام مسائل پر بہت گہری ہے الیکشن سے متعلق ان کی نظم پڑھ کر جہاں ان کی سیاسی سوچ کا اندازہ ہوتا وہیں ان کا کرب بھی ظاہر ہوتا ہے۔

زندگی ہارے ہوئے بوڑھوں پہ بچپن آگیا
خشک رخساروں پہ جیسے پھر سے روغن آگیا
لوٹ کر واپس خزاں میں جیسے ساون آگیا
ہر گلی کوچے پہ اور کھمبے پہ جوبن آگیا

ان کا طنز و مزاح نہ صرف سماج کی بگڑتی ہوئی تصویر پر کاری وار کرتا ہے بلکہ وہ خود اپنے آپ کو بھی اس کا شکار بناتے ہیں۔

جو اپنے عیب چھپانے ہوں تم کو اے نشتر
تو عیب جوئی سے پھر اتفاق مت کرنا
ہر اک جواب میں تھوڑا سا زہر ہوتا ہے
نہ پی سکو تو کسی سے مذاق مت کرنا

وہ ہر چھوٹی بڑی شے یا مخلوق کو بھی اپنے کلام میں جگہ دیتے یہاں تک کہ انھوں نے مچھر کو بھی فراموش نہیں کیا۔

ہمیں نہ ٹین نہ چھپّر عجیب لگتا ہے
نہ گھر کا خالی کنستر عجیب لگتا ہے
وہ کاٹتا ہے تو گھٹنوں کھجانا پڑتا ہے
ہمیں تو صرف یہ مچھّر عجیب لگتا ہے

ان کی شاعری کو پڑھ کر پورے یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اس راہ میں دور تک اپنا سفر قائم اس صورت میں رکھیں گے کہ لوگ نہ صرف ان سے متاثر ہوں گے بلکہ ان کی شاعری کے رنگ میں اپنی کاوشوں اور شعری صلاحیتوں کو رنگنے کی کوشش کریں گے۔

مزاح نگار خاتون
عارفہ صبح خان
سے چند سوال

بعض شخصیات اس قدر پہلو دار ہوتی ہیں اور ان کی شخصیت کے ہر پہلو سے اس قدر رنگ پھوٹتے ہیں کہ دیکھ کر آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔ ڈاکٹر عارفہ صبح خان بھی ایک ایسی ہی ہمہ جہت شخصیت ہیں۔ ایک مستند خاتون مزاح نگار ہونے کے علاوہ انہوں نے زندگی کے دیگر پیشہ ورانہ شعبوں میں بھی بھرپور کردار ادا کیا ہے ،جس کا ایک اجمالی خاکہ آپ آنے والے صفحات پر ملاحظہ فرما سکیں گے۔وہ نہ صرف اولین مزاح نگار خاتون ہیں بلکہ ایک معلمہ، ایک منجھی ہوئی صحافی خاتون، ایک متحرک سماجی کارکن، ایک مصلح، ایک ادیبہ، ایک شاعرہ، ایک نقاد کی حیثیت سے بھی ایک منفرد حیثیت کی حاملہ ہیں۔ ایسی شخصیات نئی نسل کے لئے خوابوں کے نئے جہاں تراشنے کا موجب بنتی ہیں۔ ادارہ ان کا شکر گزار ہے کہ انہوں نے ہمارے چند سوالوں کے جوابات دینا منظور کر لیا۔ مجھے امید ہے کہ جس طرح ہم ان کی مقناطیسی شخصیت کا احوال سن کر متاثر ہوئے ہیں، آپ کے لئے بھی ان کی جیون کتھا بہت دلچسپ ہو گی۔

سوال: آپ کا نام اور تخلص/قلمی نام کیا ہے؟

جواب: عارفہ ادریس خان۔ عارفہ صبح خان قلمی نام ہے، صبح میرا تخلص ہے۔

سوال: جائے پیدائش اور تاریخِ پیدائش۔ کہاں پیدا ہوئیں؟ علاقائی پسِ منظر؟

جواب: میں دس دسمبر ۱۹۷۰ء کو لاہور میں پیدا ہوئی۔ میں لاہور کے سب سے خوبصورت ترین مقام پر پیدا ہوئی۔ یہ علمی، ادبی، ثقافتی، سیاسی اور کئی حوالوں سے نہایت تاریخی اور مشہور و معروف جگہ ہے۔ میں لاہور کے دِل ''ہال روڈ'' پر پیدا ہوئی۔ یہ لاہور کی سب سے بڑی اور مشہور الیکٹرانک مارکیٹ ہے۔ انتہائی مصروف جگہ ہے۔ ہماری بلڈنگ اور میاں نواز شریف کے ماموں عبدالحمید بٹ کا مکان ساتھ ساتھ واقع ہے۔ نواز شریف اور شہباز شریف کو ہم اپنے بچپن سے دیکھتے آ رہے ہیں۔ میری دادی جان مبلغہ اور عالمہ تھیں، اس لئے اُنہیں تبلیغی اجتماعات اور قرآن خوانی کے موقع پر میاں نواز شریف کی والدہ بیگم شمیم شریف بہت عقیدت سے بلاتی تھیں۔ آپ کا درسِ خطبہ بڑی اہمیت کا حامل ہوتا تھا۔ میرے چچا اور کزنز وغیرہ بھی کرکٹ کھیلنے اُن کے ہاں جاتے تھے۔ نواز شریف کا یہ سیاسی حلقہ بھی تھا۔ بلڈنگ میں موجود میرے والد، چچا اور تمام خاندان کے افراد مسلم لیگ (ن) کے لئے انتخابات میں اہم کردار ادا کرتے تھے۔ ہال روڈ اور لکشمی مینشن ساتھ ساتھ ہیں۔ اس علاقے میں میاں نواز شریف کی آمدو رفت کے ساتھ ساتھ ملک معراج خالد کی رہائش بھی تھی۔ سعادت حسن منٹو، مستنصر حسین تارڑ، بیگم خورشید احمد، سلمان خورشید اور بیشمار نامور شخصیات یہاں رہتی تھیں۔ بیڈن روڈ سیاسی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ ہال روڈ، بیڈن روڈ، کوپر روڈ، ریگل، رائل پارک، مال روڈ، چیرنگ کراس، میکلوڈ روڈ، جی پی او، انارکلی، یہ تمام مشہور مقامات ہال روڈ سے متصل تھے۔ میرا بچپن ان سب گلیوں اور سڑکوں پر بھاگتے دوڑتے گزرا ہے۔ ان سب علاقوں کے ایک ایک انچ پر میرے قدموں کے بیشمار نشانات ہیں۔ لارنس گارڈن، چڑیا گھر، واپڈا ہاؤس، سیمنٹ مینار، پنجاب اسمبلی، الحمرا، فیروز سنز، پینوراما، مسجدِ شہداء، جی پی او، ہائی کورٹ، سٹیٹ بینک، شیزان فلیٹیز، آواری، پی سی، نظریۂ پاکستان، تمام مشہور شاپنگ سینٹرز، پلازے، ہوٹل، سینما، سکول، کالجز، یونیورسٹی، ادبی سیاسی ثقافتی مرکز کا یہ گڑھ ہے۔ میں ان سب علاقوں میں کہیں نہ کہیں اپنے بابا، امی، بہنوں، انکل اور کزنز کے ساتھ گھومتی پھرتی تھی۔ یہاں سے آپ میری علمی، ادبی، ثقافتی تربیت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ میرا علاقہ انتہائی زرخیز، متمول، گہما گہمی اور سرگرمیوں کا مرکز رہا ہے۔ اسی لئے اسے لاہور کا دل کہا جاتا ہے۔ ایک تو یہاں کا علاقہ انتہائی پُرکشش، دلاویز تھا، پھر میری فیملی بھی بہت زیادہ علمی، ادبی، مذہبی، ثقافتی اور سیاسی لحاظ سے مضبوط و توانا تھی۔ میں نے اپنے انتہائی بچپن سے بڑی بڑی شخصیات کو دیکھا ہے۔ علاقہ انسانی شخصیات کی تعمیر و تشکیل میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ پھر میرا خاندانی پسِ منظر بھی شاندار ہے۔ اس لئے میرے اندر بہت رنگ ہیں۔

ذاتی کوائف

نام: ڈاکٹر عارفہ صبح خان
تاریخ پیدائش: ۱۰ / دسمبر ۱۹۷۰ء
مقامِ پیدائش: لاہور پاکستان
تعلیم و تربیت: اردو ادب میں پی ایچ ڈی (امور خانہ داری میں ڈی لٹ)
ذات خاندان: یوسف زئی پٹھان۔ علمی ادبی سیاسی خاندان
حیثیت مراتب: صحافی، استاد، ادیبہ، شاعرہ نقاد محقق، دانشور، اینکر، ڈرامہ رائٹر، مزاح نگار، کالم نویس، تجزیہ کار
ایوارڈ شیلڈز: ۱۰ گولڈ میڈلز، ۵۵ ایوارڈز، ۲۰ شیلڈز

سوال: آپ کا ابتدائی تعلیمی پسِ منظر اور اعلیٰ تعلیمی مدارج کیسے طے ہوئے؟

جواب: ہم پانچ بہنیں ہیں۔ میرا بھائی نہیں ہے جبکہ خاندان میں ایک بھی فیملی یونٹ نہیں ہوتا تھا کہ جس کے گھر میں صرف بیٹی ہو، بیٹا نہ ہو بلکہ اکثر فیملیوں میں لڑکیاں کم اور لڑکے زیادہ تھے۔ مثلاً

مصروف ہوگئی کہ تین چار بار اپنی پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کی جاب بھی چھوڑ دی۔ مین اپنی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کرنے والی پہلی طالبہ کا اعزاز رکھتی ہوں۔

سوال: ازدواجی زندگی کسی ہے؟ کیا آپ کو اپنا آئیڈیل ملا؟ محبت ا ورشادی دو مختلف چیزیں ہیں، آپ کا تجربہ کیسا رہا؟؟

جواب: میں ہر چیز میں خوبصورتی تلاش کرتی ہوں۔ لائف میں بہت رومینٹک ہوں، اس لئے میری سہیلیاں، کزنز، کولیگز سمجھتے تھے کہ میں شائد لو میرج کروں گی مگر میں رومینٹک ہونے کے ساتھ ساتھ بہت حقیقت پسند بھی ہوں اس لئے بیشمار مواقع اور پیشکشوں کے باوجود میں نے یہ معاملہ اللہ اور اپنے والدین کے سپرد کر رکھا تھا۔ میری شادی مکمل طور پر ارینج میرج تھی۔ میرے شوہر کو میری فیملی نے پسند کیا تھا، مجھ سے میری پسند پوچھی گئی تھی۔ میرے لئے کئی پروپوزلز تھے لیکن جب میری فیملی نے میرے شوہر کو پسند کرلیا تو میں نے بھی اوکے کر دیا۔ میری ازدواجی زندگی ماشا اللہ انتہائی شاندار ہے۔ میرا اور میرے شوہر کا مزاج بالکل مختلف ہے۔ شادی سے پہلے مجھے جن دوستاروں سے چڑ تھے، وہی دونوں ستارے میری زندگی میں چمکنے لگے۔ یعنی شوہر اور بیٹی کا ستارہ۔ میرے شوہر ایک فیصد بھی رومینٹک نہیں ہیں لیکن وہ ہر لحاظ سے ایک مکمل، ذمہ دار، تابعدار اور شاندار انسان ہیں۔ وہ مجھے اس قدر چاہتے ہیں کہ شادی کے بعد انہوں نے مجھے ایک دن بھی میرے میکے میں نہیں رہنے دیا۔ وہ مجھے محبت کے ساتھ بہت عزت دیتے ہیں۔ بہت مخلص اور با اعتماد ہیں۔ میں ان سے محبت ہی نہیں، اُن کی بے پناہ عزت بھی کرتی ہوں۔ کسی اور کی بات نہیں مانتی لیکن اپنے شوہر کی بات مان لیتی ہوں۔ ذائقہ بدلنے کے لئے لڑ بھی لیتی ہوں۔ ماشا اللہ ہماری بہت آئیڈیل لائف ہے۔

سوال: کیا آپ کے ادبی حوالے میں خاندانی پس منظر کا عمل دخل ہے؟

جواب: یقینی طور پر ہے۔ میرا خاندان علمی، ادبی، سیاسی طور پر بڑا فعال اور شاندار ہے۔ علم وادب ہماری میراث ہے۔ مجھے فخر ہے کہ میں ایک نامور خاندان کی بیٹی ہوں۔ یہ بہت بڑا فخر اور اعزاز ہوتا ہے کہ آپ معتزز خاندان کے فرد ہوں۔ مجھے بہت ناز ہے کہ میرے اندر اعلیٰ خون ہے۔ میں نجیب الطرفین ہوں۔ میرے والد کے ماموں مرزا احسن رضا بیگ مسلم لیگ کے صدر اور قائد اعظم کے قریبی ساتھی تھے۔ میرے پرداد ایس ایس پی تھے۔ میرے دادا جج تھے۔ میرے والد مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری تھے۔ میرے والد کی تحریکِ پاکستان اور تعمیرِ پاکستان میں بہت خدمات ہیں۔ اُنھوں نے جان و مال کی قربانیاں دی ہیں۔ بابائے اُردو مولوی عبدالحق میری پردادی کے فرسٹ کزن تھے۔ ہاپوڑ میں دونوں اکٹھے رہتے تھے۔ میرے والد، اُن کے ماموں مشاعروں اور علمی مجالس کا اہتمام کیا کرتے تھے۔ میرے والد علم وادب کے شیدائی اور علم کا سمندر تھے۔ وہ لاہور میں منعقد ہونے والے مشاعروں، علمی و ادبی سیاسی محافل میں جاتے بھی تھے اور اہتمام بھی کرتے تھے۔ میں سکول کے زمانے میں بابا کے ساتھ اُن تقاریب میں جایا کرتی تھی۔ ہم جس بلڈنگ میں رہتے تھے، یہ میرے والد نے پورے خاندان کو الاٹ کرا کے دی تھی۔ یہاں چھ فیملیاں رہتی تھیں۔ تاش، شطرنج، کرکٹ کے علاوہ

اعزازات

- ☆ پاکستان کی پہلی مزاح نگار خاتون ہونے کا اعزاز
- ☆ پاکستان کی پہلی کرائم لیڈی رپورٹر
- ☆ پاکستان کی پہلی پولیٹیکل لیڈی رپورٹر
- ☆ سات بار مسلسل بہترین صحافی کا ایوارڈ
- ☆ مزاح نگاری پر مختلف ادبی تنظیموں سے سات مرتبہ ایوارڈز
- ☆ تین سال مسلسل گولڈ میڈلز میں ہیٹ ٹرک کرنے کا اعزاز
- ☆ پانچ سال مسلسل لگاتار صدر ویمن جرنلسٹ پریس کلب لاہور
- ☆ تین سال متواتر، سال کی پہلی کتاب کی اشاعت، تینوں شاعری کی کتب
- ☆ چوتھی جماعت سے لکھنے اور چھپنے کا اعزاز، سب سے کم عمر میں لکھنے کا شرف

بکثرت ادبی محفلیں جمتی تھیں۔ ہمارے ہاں بات چیت بہت شائستگی، نرمی اور تمیز تہذیب سے ہوتی ہے۔ سب کا پڑھنے لکھنے کی طرف رجحان تھا۔ اس کے اثرات یقیناً ہیں لیکن ظاہر ہے کہ اگر خاندان میں چالیس پچاس لڑکیاں یا ساٹھ ستر لڑکے تھے تو اُن میں سے صرف ایک میں نے ہی یہ سارے کام کئے۔ پانچوں بہنوں میں سے اپنے بابا کا نام میں نے ہی زندہ رکھا اور آج بھی اُن کا نام میرے نام کے ساتھ ہر ڈاکومینٹ میں چلتا ہے۔ میری یہ صلاحیت تو خداداد ہے لیکن اچھے علمی ادبی خاندان میں ہونے سے اس میں نکھار اور توازن آ گیا۔

سوال: آپ کی پہلی ادبی تخلیق؟

جواب: میری پہلی ادبی تخلیق تو چوتھی جماعت میں ہوگئی تھی جب میں نے نظم، کہانی اور مضمون لکھا تھا۔ البتہ میری پہلی کتاب ''عکس زن'' ۲۰۰۰ء میں منظرِ عام پر آئی۔

سوال: آپ کی تصنیفات کی تعداد، نام اور اُن کے موضوعات کیا کیا ہیں؟

جواب: میری تصانیف کی تعداد چودہ ہوگئی ہے۔ میری پہلی کتاب ''عکس زن'' ہے جو ۲۰۰۰ء میں آئی تھی۔ ''عکس زن''، ''اماں حوا سے اماں کونسلر تک''، ''شٹ اپ''، ''مابدولت''، ''ادبی ستارے''، ''صبح ہو گئی جاناں''، ''عشق بلاخیز''، ''سیاستدانوں کے سائڈ افیکٹس''۔ میں نے تقریباً سبھی موضوعات کو چھیڑا ہے۔ خواتین کے مصائب و مسائل، ہیومین رائٹس، سوشل ایشوز، پالیٹکس، کالم نویسی، تنقید، شاعری، افسانہ، انٹرویوز، مزاح، شاعری، غرضیکہ اکثر موضوعات میرے احاطۂ تحریر میں آئے ہیں۔ صحافت میں رہ کر میں نے کوئی موضوع نہیں چھوڑا۔ ادب میں ناول، سفرنامہ اور کودنوشت قلمبند نہیں کی۔ آج کل موقع ملا ہے تو اپنی آٹو بائیوگرافی پر تھوڑا سا کام شروع کیا ہے۔

سوال: کن کن مزاح نگاروں کا مطالعہ کیا ہے۔ کس مزاح نگار نے اس حد تک متاثر کیا ہے کہ آپ نے شعوری طور پر اُن کے اسلوب کو اپنانے کی کوشش کی؟

جواب: میں نے مزاح تو نصاب کے علاوہ ہی پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ گھر میں ادبی رسائل، اخبارات اور ڈائجسٹ آتے تھے۔ مجھے بچپن سے پڑھنے کی عادت تھی۔ سیارہ ڈائجسٹ اور اُردو ڈائجسٹ بھی پڑھتی تھی جس مین کوئی نہ کوئی مزاح پارہ ہوتا تھا۔ میں اُسے پڑھ کر بہت انجوائے کرتی تھی۔ پہلے مزاح نگار غالباً ''کرنل محمد خان'' تھے جن کی نصاب میں ''قدرِ ایاز'' پڑھی تو بابا سے کہہ کر اُن کی کتابین منگوائیں اور پڑھیں۔ اس کے بعد پطرس بخاری کو پڑھا۔ مرزا فرحت اللہ بیگ، عظیم بیگ چغتائی، مشکور حسین یاد، شفیق الرحمن، مشتاق احمد یوسفی، ابنِ انشاء، عطا الحق قاسمی، ڈاکٹر یونس بٹ وغیرہ سبھی کو جستہ جستہ پڑھا۔ مجھے مزاح نگاروں میں سب سے اعلیٰ اور برتر پطرس بخاری لگے اور پرانے مزاح نگاروں میں مرزا فرحت بیگ اور کرنل محمد خان کا دھیما مزاح بھی اچھا لگا۔ مجھے ایک مکمل، بھرپور اور زندہ دل مزاح نگار صرف اور صرف پطرس بخاری لگتے ہیں۔ میری مزاح نگاری کا باقاعدہ آغاز اُس وقت ہوا جب میں نے ابھی کسی بھی مزاح نگار کو نہیں پڑھا تھا۔ میں ساتویں جماعت میں ابھی آئی تھی کہ سکول میں بزمِ ادب ہوا۔ میں نے تقریر میں بھی حصہ لیا تھا، نظم سنانے میں بھی اور ٹیبلو میں بھی۔ میری سہیلی کو بھی شوق چڑھا کہ وہ میری طرح سٹیج پر جائے۔ اُس نے مجھے کہا کہ تم میرے لئے کچھ لکھ دو۔ میرے ذہن میں ایک خاکہ ابھرا۔ میں نے ایک مزاحیہ سیاسی چوکشن بنائی جس کے کچھ حصے نثر میں تھے اور کچھ اشعار یا گانوں میں تھے۔ یہ پانچ صفحات کا

صحافتی سرگرمیاں

پرنٹ میڈیا سے تعلق: روزنامہ جنگ، روزنامہ نوائے وقت، پاکستان، انصاف، (فرسٹ آپشن، قومی ڈائجسٹ، اخبار خواتین، سائبان، صدائے وطن)

الیکٹرانک میڈیا سے وابستگی: پی ٹی وی، رائل چینل، ایس ٹی این، سٹار ایشیا۔

حیثیت، عہدے پرنٹ: میگزین ایڈیٹر، کالم نگار، لیڈی رپورٹر، فیچر رائٹر، اسسٹنٹ ایڈیٹوریل، انچارج ادبی، سیاسی، تعلیمی اسلامی، ہیلتھ اوور سیز اور خواتین ایڈیشنز

الیکٹرونک: ڈرامہ رائٹر، سکرپٹ رائٹر، اینکر، ریسرچر، تجزیہ کار

سکرپٹ تھا۔ میں سب کے سامنے گانا گانے سے شرماتی تھی اور شرماتی ہوں۔ دوسرے میرے پاس پہلے ہی تین آئٹمز تھے، اس لئے میں نے وہ سکرپٹ لکھ کر اپنی سہیلی کو دے دیا بلکہ اُسے خوب ریہرسل بھی کروائی۔ جب اُس نے یہ سکرپٹ پڑھا تو پورا سکول قہقہوں سے گونج اُٹھا۔ حد تو یہ ہے کہ ہماری ہیڈ مسٹریس جنہیں کسی نے مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا تھا، سب نے پہلی بار اُنہیں ہنستے اور قہقہے لگاتے دیکھا۔

آپ اس سے اندازہ لگایئے کہ کسی نے مجھے گائیڈ نہیں کیا تھا۔ نہ میرا پہلے مزاح لکھنے کا کوئی تجربہ تھا۔ یہ میرا پہلا مزاح پارہ تھا جس سے مجھے بے انتہا شہرت ملی اور میں سکول کی پاپولر سٹوڈینٹ بن گئی۔ میری عمر، میری کلاس کے لحاظ سے یہ بہت بڑا کام تھا۔ میرے سامنے کوئی مثال بھی نہیں تھی۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ مزاح میرے اندر قدرتی ہے۔ شعر کی طرح مزاح میں بھی آمد ہوتی ہے۔ ہمارے اکثر مزاح نگاروں کا مزاح آورد کا نتیجہ ہے۔ میں شعوری اور لاشعوری طور پر کسی کا اتباع نہیں کرتی۔ کسی کی پیروکار نہیں، کسی کی مقلد نہیں۔ میرا مزاح خالصتاً میرا ہے اور اس میں میں نے ایک اسلوب وضع کیا ہے۔ میرا مزاح دیگر تمام مزاح نگاروں سے یکسر مختلف ہے۔ میں ساتویں جماعت سے مسلسل مزاح لکھ رہی ہوں۔ آٹھویں، نویں دسویں جماعت میں بچوں کے رسائل و اخبارات میں کئی مزاح پارے لکھے۔ اُنہی دِنوں روزنامہ جنگ لاہور سے شروع ہوا تھا۔ میرے آرٹیکلز بڑے طمطراق سے شائع کئے جاتے تھے۔ کسی کے فرشتوں کو بھی اندازہ نہیں تھا کہ یہ مزاح تخلیق کرنے والی کوئی چودہ پندرہ سال کی نوعمر بچی ہو سکتی ہے۔ مجھے پندرہ سال کی عمر میں ڈاکٹر شفیق جالندھری نے روزنامہ جنگ میں سب سے پہلے جاب کی آفر کی تھی۔ اُن دنوں وہ بچوں کے صفحے کے انچارج تھے۔ ان کا خیال تھا کہ میں کالج کی اٹھارہ بیس سال کی طالبہ ہوں گی۔ میں خط بھی اس قدر دلچسپ لکھتی تھی کہ مجھے تقریباً سبھی ایڈیٹرز بہت انہماک سے پڑھتے تھے اور جواب بھی دیتے تھے۔ میں کالج میں آئی تو تب تک بہت مشہور ہو چکی تھی اور میرے بہت سے فین تھے۔ لائبریری میں جاتی تو جس دن میرا آرٹیکل چھپتا تھا، لڑکیاں اخبار جھپٹ کر پڑھا کرتی تھیں۔ کالج آ کر میں نے اپنا نام عارفہ صبح خان کر لیا تھا جبکہ کالج میں سب مجھے عارفہ ادریس کے نام سے جانتی تھیں، اس لئے وہ اکثر میرے ہاتھ سے انتہائی بدتمیزی سے اخبار چھین کر مجھے ہی پڑھنے لگتی تھیں۔ مجھے ہنسی آتی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ سب کو پتہ چل گیا کہ یہ میں ہی ہوں۔

بتانے کا مقصد یہ ہے کہ مزاح نگاروں کو باقاعدہ پڑھنے سے پہلے ہی میرے مزاح کا جادو چلتا تھا۔ مین نے پطرس بخاری کو تھرڈ ائیر میں پڑھا۔ البتہ کرنل محمد خان کو سب سے پہلے پڑھا۔ اُنہوں نے ہی مجھے "خواتین کی پطرس بخاری" کا خطاب دیا تھا۔ یہ میرے لئے باعثِ اعزاز ہے لیکن میری فطرت میں نہیں ہے کہ کسی کے

علمی، ادبی، ثقافتی کارنامے

تدریسی فرائض: الیگزر اکیڈمی، سٹینڈرڈ کالج، فضائیہ کالج برائے خواتین، یونیورسٹی آف پنجاب، یونیورسٹی آف ساؤتھ ایشیا

بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی، لاہور کیمپس، یونیورسٹی آف لاہور، یونیورسٹی آف مینجمنٹ اینڈ ٹیکنالوجی لاہور۔

عہدیدار: چیئرپرسن انجیل لٹریری سوسائٹی، لاہور

صدر وویمن ونگ، پی ایف یو سی لاہور۔

نان آفیشل ویزیٹر آف پنجاب جیل۔

سینئر جرنلسٹ روزنامہ نوائے وقت لاہور۔

لائف اور اعزازی ممبر، پریس کلب لاہور۔

ممبر نظریۂ پاکستان ٹرسٹ، لاہور۔

نائب صدر، اقبال دوست سوسائٹی، لاہور۔

ممبر ادبی بیٹھک، الحمرا سینٹر لاہور۔

ممبر خواجہ فرید سنگت پاکستان، لاہور۔

سابق ایگزیکٹو ممبر خواتین کیخلاف انسداد تشدد کمیٹی قائم کردہ وزیرِ اعلیٰ ۱۹۹۸ء

نقشِ قدم پر چلوں۔ میں ہمیشہ اپنے نقوش قائم کرتی ہوں اور متاثر ہونا میری نیچر کے خلاف ہے۔ احترام کرتی ہوں لیکن اپنا راستہ خود متعین کرتی ہوں۔

سوال: آپ کا رجحان طنز کی طرف زیادہ ہے یا مزاح کی طرف اور ایسا کیوں ہے؟

جواب: ابتدا میں تو خالصتاً مزاح ہی لکھتی تھی، جوں جوں فہم و ادراک کی سیڑھیاں چڑھتی گئی، معاشرے میں پھیلی گھٹن، ناانصافی، استحصال، جھوٹ، مکر و فریب، دغا، دھوکہ اور منافقت کے ساتھ ساتھ تنگ نظری، تعصب اور تعفن زدہ ذہنیتیں دیکھ کر خوبخود قلم میں کاٹ آتی گئی۔ اب مزاح کے ساتھ طنز بھی لکھتی ہوں اور میری تحریریں خالصتاً طنز و مزاح پر مبنی ہوتی ہیں۔ دنیا کا ہر حساس اور باشعور انسان تقسیمی عمل میں تو صبر کر لیتا ہے لیکن تادیبی، تکذیبی اور تخریبی عمل سے اُس کے اندر بغاوت پیدا ہو جاتی ہے۔ تعلیم یافتہ انسان اس کا کیتھارسز مستحسن انداز میں کرتا ہے۔ مزاح اس کی بھرپور صورت ہے۔

سوال: آپ کی طنز و مزاح نگاری کن محرکات کی پیداوار ہے۔ آپ طنز و مزاح سے کیا مراد لیتی ہیں؟ کیا عہدِ حاضر میں اس کی ضرورت ہے؟

جواب: جیسا کہ میں نے پہلے بتایا، عدم مساوات، بھونڈے رویے اور مکروہ کردار مسائل کو جنم دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر نظامِ حکمرانی سے لے کر طرزِ غلامی تک اِتنے مضحکہ خیز سلسلے ہیں کہ سمجھ نہیں آتی آدمی ہنسے یا روئے۔ عہدِ حاضر میں خوشامد، چاپلوسی، چرب زبانی اور قصیدہ خوانی نے اِتنی ترقی کر لی ہے کہ اب آپ کی ہر ترقی میں یہ فنون کلیدی کردار ادا کر رہے ہیں۔ سچ بولنے والا احمق سمجھا جاتا ہے۔ ایماندار آدمی کو عقل سے پیدل جانا جاتا ہے۔ مصنوعات کے ڈھیر نے ماحول کو مصنوعی اور بناوٹی بنا کر رکھ دیا ہے۔ ایسے ایسے لوگ حکمران، وزیر، مشیر، چیئرمین، وی سی، ڈی سی بن بیٹھے ہیں کہ جن کو پرچون کی دکان کھولنی چاہیئے تھے یا لسی سے مکھن نکالنا چاہیئے تھے۔ عالم کا رتبہ گھٹ گیا ہے، ظالم راشی منافق اور ابن الوقت کا مرتبہ بڑھ گیا ہے۔ یہ سب محرکات ہی طنز و مزاح کے عوامل ہیں۔ آج اِتنی ٹینشن ڈیپریشن اور فریسٹریشن ہے کہ اس سے نجات کے لئے مزاح ٹانک کا کام دیتا ہے۔

سوال: آپ کی کتاب ''کر کرے کردار'' میں معاشرے کے بہت سے دلچسپ کرداروں کے خاکے ہیں۔ کیا ان کرداروں کی فکاہی تجسیم میں آپ کے ذاتی تجربے کو عمل دخل رہا ہے یا یہ مشاہدے کا شاخسانہ تھے؟

جواب: ''کر کرے کردار'' کی پسندیدگی کی وجہ یہ ہے کہ اس میں معاشرے کے زندہ چلتے پھرتے کردار ہیں جو آپ کے اردگرد پھیلے ہوئے ہیں اور حقیقی ہیں۔ یہ کردار تجربے اور مشاہدے کی پیداوار ہیں۔ آپ کو یہ کردار اپنے گھر اور دفتر میں باآسانی مل جاتے

سماجی خدمات

چار جلے ہوئے غریب بچوں کی خبر۔ ۲/ اکتوبر ۱۹۹۸ء کو نوائے وقت میں شائع کر کے چار لاکھ روپیہ اکٹھا کر کے امریکہ بھجوایا۔ دسمبر ۱۹۹۹ء کو بچے کامیاب سرجری کے بعد امریکہ سے آئے۔

۲۹/ اگست ۱۹۹۹ء کو ۶ اپاہج بچوں کے لئے پاکستان بیت المال سے تاحیات وظیفہ لگوایا۔

۱۸/ مارچ ۱۹۹۹ء کو نیچہ جو کہ بری طرح جھلس گئی تھی بیرون ملک علاج کے لئے وزیر اعظم نواز شریف سے ۳۶ لاکھ علاج کے لئے دلوائے۔

۱۴/ جولائی ۱۹۹۸ء کو اپنے کالم پر وزیر اعلیٰ شہباز شریف سے خواتین کیخلاف تشدد کی روک تھام پر اعلیٰ سطحی کمیٹی بنوائی اور سینکڑوں عورتوں کی مدد کی۔

۴/ دسمبر ۱۹۹۹ء کو جاوید اقبال نامی نفسیاتی مریض نے ۱۰۰ بچوں کو قتل کیا اور اغوا کیا۔ اس خبر پر جاوید نامی بچہ اپنے والدین کو واپس مل گیا۔

۲۰/ اپریل ۱۹۹۹ء کو زہرہ نامی بچی کا چلڈرن ہسپتال میں دل کے سوراخ کا مفت علاج کروایا۔

ہیں۔ یہ کردار اس قدر مقبول ہوئے ہیں کہ مجھے خود کبھی کبھی حیرت ہوتی ہے۔ یہ کردار میں نے خود چلتے پھرتے عجلت میں لکھے تھے لیکن ان کرداروں نے ملک بھر میں پذیرائی حاصل کی اور ہر کردار نے داد پائی۔اس کی وجہ کردار کی اوریجنیلٹی ہے۔

سوال: آپ ایک حقیقی اور بلند مزاح نگار خاتون ہیں، آپ نے شاعری کے پیرایۂ اظہار کے لئے طنز و مزاح کا انتخاب کیوں نہیں کیا؟

جواب: اپنی شاعری کی کتاب ''عشق بلاخیز'' مجھے ذاتی طور پر اس لئے پسند ہے کہ اس کتاب سے مجھے خود کو منوانے کا موقع ملا ہے۔اس کتاب کی ایک خصوصیت جہاں یہ ہے کہ اس میں شاعری کی تمام اصناف موجود ہیں وہاں کتاب کا ایک حصہ مزاحیہ شاعری پر مبنی ہے۔میں مزاح میں جبر، زبردستی، صارفیت، مارکیٹنگ کی قائل نہیں۔ میں مزاح میں آمد کو ترجیح دیتی ہوں کیونکہ وہی مزاح دیرپا اور اعلیٰ درجے کا ہوتا ہے۔سوچ سوچ کر مزاح تخلیق کرنا یا اُسے روایتی ہتھکنڈوں سے مزاح کا لبادہ اوڑھانا غلط ہے۔

سوال: آپ کو تنقید میں بھی درجہ کمال حاصل ہے۔آپ نے جاندار اور بھرپور تنقید کی ہے۔آپ کی تنقید کی پہلی کتاب '' اُردو تنقید کا اصلی چہرہ'' ایک کامیاب اور جامع تجربہ ہے۔کیا تنقید کو بھی آپ کی فطرت سے مناسبت ہے؟

جواب: یہ کتاب میرا ایم فل کا مقالہ ہے اور جب میں خود پی ایچ ڈی کر رہی تھی تو یہ میرا ایم فل کا مقالہ پی ایچ ڈی کے سٹوڈینٹ پڑھتے تھے۔آج بھی ایم اے سے پی ایچ ڈی تک کے طلبہ و طالبات اسی کتاب کو پڑھ کر امتحان پاس کرتے ہیں۔ یہ موضوع میں نے خود منتخب کیا ہے اور ایک طرح سے تنقید کی مکمل تاریخ اور جہات نظریے قلمبند کردیے ہیں۔ یہ سب میں نے اپنے بل بوتے پر کیا ہے۔میرے اندر تنقیدی حِس بہت تیز ہے۔

سوال: تنقید کے میدان میں بھی آپ نے خود اپنا راستہ اور اپنی منزل بنائی ہے۔تنقید میں آپ نیا یک نئے اسلوب اور رجحان کو جنم دیا ہے۔ آپ کو اُردو تنقید کہاں کھڑی نظر آتی ہے؟

جواب: میں نے بتایا ناں کی میں فطرتاً اجتہاد پسند ہوں۔ میرا مزاج کھوج طلب ہے۔ میری نظریں اُفق کے پار رہتی ہیں۔ ہمارے ہاں تنقید میں نقالی ہے۔نظریہ سازی کا شدید فقدان ہے۔ میں نے بیشمار نقادوں کو پڑھا ہے لیکن کسی کے ہاں کمال نظر نہیں آیا۔ اکثر مغرب کے خوشہ چین نکلے ہیں۔ اُردو تنقید میں جو نظریات سازی ہوئی ہے وہ انتہائی معذرت کے ساتھ، لنڈے کے کپڑوں جیسے ہیں۔ ہمارے ہاں غور وفکر اور تحقیق کی عادت نہیں ہے۔ کچھ ناقدین نے اچھا کام بھی کیا ہے۔ ان کے ہاں تازگی، حرارت، عظمت بھی ہے لیکن ان کی تعداد بہت کم ہے۔ سچ پوچھیے تو اُردو ابھی تک بقول انتظار حسین کے ایک ٹانگ پر کھڑی ہے۔

سوال: آپ کی شاعری میں رومانویت کا عنصر غالب ہے، ایسا کیوں ہے؟

جواب: وہ تو ہے۔۔۔شاعری ہوتی ہی رومانیت ہے۔ دنیا کا ہر شاعر رومان پرور ہوتا ہے یا اُسے رومان پرور ہونا چاہیئے۔ میں ہر چیز ، ہر کام، ہر بات میں رومان پرور ہوں۔ مجھے حسن بھاتا ہے،خوبصورتی میری کمزوری ہے۔ کوئی بھی کام ہو میں اُسے پورے یقین، محنت، خوبصورتی اور دل سے کرتی ہوں۔

سوال: سُنا ہے کہ آپ غصے کی بھی تیز ہیں اور کام اپنی مرضی سے کرتی ہیں؟

جواب: یہ تو درست ہے کہ مجھے غصہ آجاتا ہے اور مین اس کا برملا اظہار بھی کردیتی ہوں لیکن اس کی وجہ ہے کہ ہر غیرت مند انسان کو نامعقول بات پر غصہ آتا ہے۔غصہ آنا نارمیلٹی کی بات ہے۔ ہاں غسہ نہ آنا ابنارمیلٹی کی نشانی ہے۔ میں اپنا ہر کام ڈسپلن سے، وقت پر اور بہترین طریقے سے کرتی ہوں لیکن جب لوگ اُس کے باوجود مسائل پیدا کرنے کی کوشش کریں یا منافقت اور خباثت دکھائیں تو غصہ آنا فطری عمل ہے، جو میں بھی کرتی ہوں۔ بہت ایمانداری سے کرتی ہوں۔ ہر رشتے کو آخری حد تک انتہائی خلوص اور محبت سے نبھاتی ہوں۔شائد میرے جیسے انسان دنیا میں بہت کم ہوں کیونکہ آجکل جھوٹ بولنا ایک آرٹ اور سچ بولنا بیوقوفی ہے لیکن میں کسی بھی حالت میں جھوٹ نہیں بولتی سوائے ایسی بات کے جس

میں فساد کا ڈر ہو لیکن آج کل لوگ سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ مانتے ہیں۔ میں بناوٹ، ڈپلومیسی اور مصنوعی رویوں سے دور ہوں۔ رہی مرضی سے کام کرنے کی بات تو میں چیزوں کو دوسروں سے بہتر طریقے سے کرتی ہوں اور مجھ میں دوسروں سے زیادہ صلاحیت ہے۔ میری قوتِ فیصلہ مضبوط ہے تو میں خود کو بھولا، معصوم ظاہر کر کے کسی سے کیوں پوچھوں۔ میرے فیصلے مستحکم اور پائیدار ہوتے ہیں۔ اس لئے جو بہتر سمجھتی ہوں، وہ کرتی ہوں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں ہر وقت من مانیاں کرتی ہوں۔ میں دوسروں کے فیصلوں اور رائے کا بھی احترام کرتی ہوں لیکن کسی کٹھ پتلی کی طرح مصلحتاً یا منافقت سے ''جی جی'' نہیں کرتی۔

سوال: کیا موجودہ ادبی روش سے مطمئن ہیں؟

جواب: ادب کی تازہ ترین صورتِ حال آپ کے سامنے ہے۔ معاشرے میں عزت، مرتبہ، مقام اور شہرت کے لئے کافی غیر ادیب شاعر اس قبیلے میں گھس آئے ہیں۔ کسی بھی پروفیشن میں دو نمبر لوگ گھس آئیں گے تو اس کی ساکھ ضرور بگڑے گی۔ لوگ بدگمان ہوں گے بلکہ متنفر ہوں گے۔ دو نمبر لوگوں کے آنے سے کریڈیبلیٹی پر داغ آتا ہے۔ پی آر شپ کے ذریعے سے خود کو شاعر، ودیب، دانشور کہلوانے والے اپنے وقت پر تو بے پناہ مفادات حاصل کر لیتے ہیں لیکن وقت کی طناب کھنچتی ہے تو وقت کی چھلنی اُنہیں چھان بورے کی طرح جھاڑ پھینکتی ہے۔ پی آر شپ اور کنزیومر پروڈکس سے ادب کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچ رہا ہے۔

سوال: ادب کو بے ادب لوگوں سے کیسے بچایا جائے؟

جواب: آج ادب صارفیت کے بازار میں کھڑا ہے۔ پبلشر کو پیسے دے کر بیش قیمت کاغذ پر مخملیں، دلآویز آرائشی گرد پوش کے ساتھ کتاب چھپوالی جاتی ہے۔ یہ کتابیں زیادہ تر لوگ تحفوں میں بانٹتے دکھائی دیں گے۔ اس کے بعد کسی فائف سٹار ہوٹل میں یا کسی بڑے ادارے میں پی آر شپ پر کتاب کی تقریب رونمائی کرالی جاتی ہے۔ سفارشی طور پر کالم لکھو لئے جاتے ہیں۔ اور تعلقات کے زور پر توصیفی کلمات کہلوا لئے جاتے ہیں۔ جب اس طرح کا ادب سامنے آتا ہے تو لوگ ادب پڑھنے اور ادب کی طرف راغب ہونے کے بجائے ادب کو مجہول شے سمجھتے ہیں۔ جینوین اور یجنل لوگ اَنا والے بھی ہوتے ہیں اور اپنے علم واَدب کے معاملے میں بااعتماد، پر یقین بھی ہوتے ہیں۔ ان کی خودداری اُنہیں ایسے اوچھے ہتھکنڈوں سے دور رکھتی ہے لیکن ان کا ذہن اُنہیں نقصان ہی پہنچاتا ہے۔ وہ مزید پس منظر میں چلے جاتے ہیں۔ اس کی روک تھام تو ادبی اداروں کی توسط سے ممکن ہے مگر وہاں بھی سفارش کلچر عام ہے، اس لئے بے ادب لوگوں سے نجات کا کوئی طریقہ فی الحال تو ایجاد نہیں ہوا۔

سوال: ادبی اداروں کی کارگردگی پر کافی لوگ شاکی ہیں، آپ نے بھی سوالیہ نشان کھڑا کیا ہے۔ ادبی اداروں کی کارکردگی ناقص کیوں ہے اور اس کا کیا حل ہے؟

جواب: ادبی اداروں میں دو طرح کے سربراہ تعینات ہیں۔ ایک وہ جو سفارش اور تعلقات کے بل پر ان اداروں پر قابض ہیں، دوسرے وہ ادیب شاعر ہیں جو جینوین ہیں لیکن خاصے بزرگ ہیں، ان میں سے اکثر ساٹھ سال کی عمر سے زیادہ کے ہیں۔ اس عمر تک آ کر انسان تھکنے لگتا ہے اور ستر سال کی عمر میں تو بیزار ہو جاتا ہے لیکن اپنے آپ سے ہر کوئی محبت کرتا ہے۔ جب اِتنے تھکے ہارے لوگ ادبی اداروں کے سربراہ ہوں گے تو وہ صرف اپنی پروجیکشن، اپنی تنخواہ، اپنے پروٹوکول اور اپنے آرام پر دھیان دیں گے۔ اِتنے بڑے ادبی اداروں میں چالیس سے ساٹھ سال کی عمر کے لوگ رکھنے چاہئیں۔ ان لوگوں میں میچورٹی بھی ہوتی ہے، جذبہ بھی اور توانائی بھی۔ جو سربراہان بیٹھے ہیں اُنہیں تو یہ بھی نہیں پتہ کہ کون کون لوگ ادب میں کیا کارہائے نمایاں کر رہے ہیں۔ یہ لوگ تھکے ہارے سیمینار کرا دیتے ہیں، وہی گھسے پٹے مخصوص لوگوں کا ٹولہ چھایا رہتا ہے۔ وہی باسی خیالات، فرسودہ نظریات اور بے جان باتیں کر کے کروڑوں روپیہ گارامٹی کر دیتے ہیں۔ اس سے ادب کو کیا فائدہ پہنچ رہا ہے لیکن زنگ آلود اذہان یہ کب سوچتے ہیں۔

ادارہ: آپ کے قیمتی وقت کا بہت بہت شکریہ۔

نیرنگ خیال

یکے از خواجگان

شہر اقتدار سے شہر زندہ دلان بسلسلۂ روزگار منتقلی نے مجھے شب کا مسافر بنا دیا تھا۔ اور اس شاہراہ پر میرے ساتھ بہت کم ہی مسافر تھے۔ یوں سمجھئے، راقم القصور ہی ان اوّلیں لوگوں میں سے تھا جنہوں نے ادارۂ مذکورہ میں شب بیداری کی اہمیت پر روشنی ڈالی اور سفرِ شب کے رموز وفوائد آشکار کیے۔ طلب سچی اور راہ سیدھی ہو تو کارواں بنتے دیر کب لگتی ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے نوجوان شب بیداری کے اس سفر میں ہمسفر بننے لگے۔ رات کو دن کا سماں رہنے لگا۔ اُنہی دنوں میری ملاقات خواجہ صاحب سے ہوگئی۔ "خواجہ" لفظ سے میری عقیدت کوئی ڈھکی چھپی نہیں۔ بزرگان دین کے ناموں کے ساتھ لگے اس لفظ نے ذہن پر ایک ان دیکھی سی چادر تان رکھی تھی۔ پردہ تصور اس لفظ سے ہمیشہ سادگی وانکساری کا پیکر ابھرتا۔ چشم تصور میں اس لفظ کے ساتھ ہی نیکی، انسانیت اور محبت کے ایک ایسے وجود کی تصویر ابھرتی، جسے الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں۔ لیکن بھلا ہو یکے بعد دیگرے ملنے والے خواجوں کا۔ جنہوں نے اس تصور کو سبوتاژ کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ پہلے پہل تو ایک آدھے "خواجہ" کو اپنے خیالی تصور سے یکسر مخالف سمت میں پایا تو یہ کہہ کر دل کو تسلی دی "پسر نوح با بداں بہ نشست خاندان نبوتش گم شد" لیکن بات جب ایک دو سے بڑھ چلی تو محسوس ہوا، جانے انجانے یہ عقیدت اس لفظ سے کم سے ہو چلی ہے۔

چھوٹے قد، چھوٹے بالوں میں، چھوٹا چہرہ لیے، چھوٹے سے خواجہ صاحب کو جب راقم نے پہلی بار دیکھا تو دل میں یہ خیال آیا کہ وہ "خواجہ" جن کا وجود آج کے گمراہ دور میں خیال ٹھہرا ہے؛ مجسم ہو کر ہمارے سامنے آ گیا ہے۔ پرانے چند ناخوشگوار واقعات کے سبب عقیدت نے ہماری آنکھوں پر پٹی نہیں باندھی لیکن دل نے ایک تھپکی ضرور دی۔ مورکھ! دیکھ کیا رہا ہے۔ پائے لاگو کر لے۔ دل کو کسی طور سمجھا لیا۔ کہ چند دن، چند دن۔ خواجہ صاحب سے کچھ دل کی باتیں کریں۔ مرشد کامل ہوا تو ہم نے پلہ کیوں چھوڑنا۔ ارادت مندوں میں تو زبردستی شامل ہو جائیں گے۔ ہائے۔۔۔ یہ گناہ گار ذہن اور معاشرے کا چلن۔ کیسے نیک نیک لوگوں کے بارے میں کیسے کیسے گمان ذہن میں آ جاتے ہیں۔

خواجہ صاحب تشریف لاتے۔ ایک چادر میز کے کونے پر

نان بخوردی خانہ برو

حضرت نظام الدین اولیاء کے ہاں ایک سیاح فقیر مہمان ہوئے۔ رات کو دستر خوان پر بیٹھے اور کھانے کے بعد باتیں شروع ہوگئیں۔ سیاح نے گفتگو کے ایسے ایسے دفتر کھولے کہ رات گئے تک ختم نہ ہوئے۔ حضرت جی نے بہت انگڑائیاں جمائیاں لیں لیکن وہ سادہ لوح کسی طور نہ سمجھا۔ حضرت جی مہمان کی دل شکنی کے خیال سے کچھ نہ کہہ سکے اور مجبوراً بیٹھے رہے۔ امیر خسرو بھی وہاں موجود تھے مگر حضرت کے احترام میں وہ بھی چپکے بیٹھے رہے۔ اِتنے میں آدھی رات کی نوبت بجی (نقارہ بجا)، حضرت جی نے پوچھا ''کیا بجا ہے؟'' امیر خسرو نے جواب دیا ''آدھی رات کی نوبت بجی ہے۔'' حضرت جی نے پوچھا ''اس میں سے کیا آواز آتی ہے؟'' امیر خسرو اُن کا مشورہ سن کر بولے ''سمجھ تو یہی آتی ہے کہ۔

نان بخوردی خانہ برو خانہ برو خانہ برو

نہ کہ بدست تو کردم خانہ گرو خانہ گرو

کھانا کھا لیا ہے اب گھر جائیے گھر جائیے، میں نے آپ کے پاس اپنا گھر گروی نہیں رکھ دیا گھر جائیے گھر جائیے۔''

آپ کے کلام کا یہاں خاص نکتہ یہ ہے کہ حرف حرف کی چوٹ کو نوبت کے طریقے پر ادا کیا۔

ٹکاتے۔ ایک ٹوپی بھی تھی شاید۔ جو کسی نے خواجہ صاحب کو بھلے وقتوں میں پہنا دی تھی اور خواجہ صاحب اس یاد کو سر پر سجائے رکھتے تھے۔ سیٹ پر تشریف رکھتے۔ ایک ادائے بے نیازانہ سے اپنے کام کا آغاز کرتے۔ ہم جیسے راندہ درگاہ قسم کے لوگوں کی باتوں سے بچنے کے لیے ہیڈ فون لگا لیتے۔ کچھ منقبت وغیرہ سنتے ہوں گے۔ اللہ لوگوں کے بھید کون کھول پایا ہے۔ رات کا پہلا پہر ڈھلنے کے بعد تشریف لاتے۔ اور دوسرا پہر ڈھلنے سے قبل غائب ہو جاتے۔ چادر بھی غائب ہو جاتی۔ کیا منظر ہوتا تھا۔ اللہ اللہ۔ مدتوں اسی کافرانہ گمان کا شکار رہے کہ کسی خالی کمرے میں جا کر چادر اوڑھ کر سو جاتے ہوں گے۔ یہ خیال ایسا کوئی ذاتی بھی نہ تھا۔ لوگ کہتے ہیں تو کیا بے سبب کہتے ہوں گے مصداق ہم نے اس پر کچھ کچھ یقین بھی کر لیا مگر بغیر تحقیق کیے ایسے کافرانہ خیالات رکھنا یقینی طور پر ایک قابل گرفت عمل ہے۔ اور راقم الحروف تو بزرگی کے منصب پر بھی فائز نہیں تھا کہ یہی کہہ کر جان چھڑا لے خطائے بزرگاں گرفتن خطا است۔

یوں تو خواجہ صاحب سے آتے جاتے ہم چونچیں لڑایا ہی کرتے تھے مگر جب وہ مصروف ہوں تو اس وقت ان کو چھیڑنے کا ایک الگ سے لطف ہوتا تھا۔ ایک دن جب خواجہ صاحب کام میں گھٹنوں گھٹنوں مصروف تھے راقم نے ہمت کر کے گفتگو کا آغاز کیا اور خواجہ صاحب سے ان کی دنیا اور اس کے بعد پھر اس ادارے میں آمد کے متعلق سوال پوچھا۔ جواب میں خواجہ صاحب نے پنجابی ایک فصیح و بلیغ گالی سے نوازا۔ ایسا نہیں کہ زندگی میں مجھے کسی نے گالی نہیں دی مگر مسئلہ یہ تھا کہ یہ کام بہت بے تکلف دوست ہی کیا کرتے تھے۔ ٹھنڈے دل سے جملے میں جب الفاظ و گالیوں کے تناسب پر غور کیا تو محسوس ہوا کہ یہ گالیاں جملے میں اثر انگیزی کے لیے ٹانکی گئی ہیں۔ تاہم کچھ اس قدر زیادہ تعداد میں ٹانک دی گئی تھیں کہ اصل جملہ قریب غائب ہو چکا تھا اور صرف اثر انگیزی رہ گئی تھی۔ مجھے احمد اقبال صاحب کا جملہ بے اختیار یاد آ گیا۔ کہ ''اگر بھورے ماموں کی دھوتی کے سوراخوں کا رقبہ جمع کیا جائے تو دھوتی غائب ہو جاتی ہے۔'' مختصر گفتگو فرماتے۔ مختصر سے مراد یہ ہے کہ جملہ تو کافی طویل ہوتا۔ تاہم اس میں اصل عبارت بیحد مختصر ہوا کرتی تھی۔ ہر قسم کے قومی نظریے کے مخالف تھے اور خود کو قوم پرست بھی سمجھتے تھے۔ یہ ایک عجیب تضاد تھا جس کا راز آج تک راقم پر نہیں کھلا۔ خود ہی نیشنلزم، کیپٹلزم اور سوشلزم پر درس دیتے۔ خود ہی سوال کر کے جواب دیا کرتے تھے۔ اور پھر خود ہی ان نظریات کو رد کر کے کہہ دیا کرتے تھے کہ خطیب کیسا بیوقوف آدمی ہے۔ اور ہمارے پاس سوائے ہاں میں ہاں ملانے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہوتا تھا۔ رفتہ رفتہ میں خواجہ صاحب کو اور خواجہ صاحب مجھے سمجھنے لگے۔

ایک دن جوش خطابت میں مسلم حملہ آوروں کو برا بھلا کہہ رہے تھے۔ دورانِ خطاب فرمانے لگے یار دیکھو ہمارے اسلاف کی معصومیت، اچھے بھلے اونچی ذات کے برہمن تھے، مسلم ہو کر

شوور ہوگئے۔ ہم نے عرض کی حضور، آپ کے اسلاف کو بھی چاہیے تھا کہ بحث کرتے۔ کہتے ادھر سے مندر چھوڑیں گے تو ادھر پیری کی مسند پر بیٹھیں گے، سر جھٹک کر فرمانے لگے ''اس وقت یہ راز کب کھولے تھے انہوں نے۔۔۔۔ یہ رمزیں تو کہیں بعد جا کر پتا چلیں۔ دھوکے سے لٹ گئے۔''

اس سے احباب اگر یہ اندازہ لگائیں کہ خواجہ صاحب پرانے مذہب کے لیے کوئی نرم جذبات رکھتے تھے تو آپ سراسر غلطی پر ہوں گے۔ مذہب وغیر مذہب الغرض تمام حلقوں کے لیے ان کا رویہ ایک ہی تھا۔ ایک دن عالم وجد میں راقم سے فرمانے لگے۔ بھلے مانس! زندگی میں کبھی کسی مولوی کی بات پر اعتبار نہ کرنا۔ عرض کی۔ سیدی! آپ کے بارے میں کیا حکم ہے۔ تو ایک عارفانہ ہنسی کے ساتھ بولے۔ خدا گواہ ہے کہ تم میری کسی بات کا یقین نہیں کرتے۔ راقم نے عقیدت میں اس بات سے بھی انکار نہ کیا۔ لیکن مدعا عرض کیا کہ روحِ سوال یہ تھی ''خود رافضیحت، دیگران رانصیحت''۔ تو ہنستے ہوئے کہنے لگے ''ہر کس سلیقہ ای دارد''۔ ہم کج فہم بھی ہنس پڑے، بھید نہ پا سکے۔

خواجہ صاحب ہر اُس بات کے خلاف تھے جو ایک عامی کے معیارِ عقل وشعور پر پوری اترتی تھی۔ پہلے پہل راقم کو خیال گزرا کہ شاید یہ مخالفت بہت زیادہ علم وعملیات کے سبب ہے۔ تاہم خواجہ صاحب نے اس خوش فہمی میں بھی زیادہ عرصہ نہ رہنے دیا۔ ایک دن گفتگو کے دوران ایک معروف کتاب پر بحث چھڑ گئی۔ لائبریری میں وہ الماری، جس میں کتاب دھری تھی، اس کے سامنے سے راقم کا بارہا گزر ہوا تھا۔ ادھر خواجہ صاحب کے ایک دوست نے وہ کتاب باقاعدہ پڑھ رکھی تھی۔ الغرض دونوں ان مسائل پر بہت دیر تک بات کرتے رہے جن کا اس مصنف کو کما حقہ ادراک نہ تھا۔ ایک دن فرمانے لگے۔ مجھے دو قسم کے لوگ بہت برے لگتے ہیں۔ ایک وہ جو سرِ ورق دیکھ کر کتاب کے بارے میں ثقیل وطویل تبصرے کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ دوسرے وہ سوشل میڈیائی جو قول کا ذائقہ چکھ کر کتاب کے بارے میں بے لاگ تبصرہ فرماتے ہیں۔ راقم نے ڈرتے ڈرتے عرض کی کہ درحقیقت آپ ایک ہی قسم کے لوگوں کے بارے میں بات کر رہے ہیں۔ تو کہنے لگے ''نہیں میاں! دو مختلف باتیں ہیں۔ تم کو غور وفکر سے کام لینے کی ضرورت ہے۔''

ہم نے کافی غور کیا مگر کوئی خاص فرق معلوم کرنے سے قاصر رہے۔ تادم است غم است۔

مالِ دنیا کے مآل سے واقف تھے سو ظاہری ہیئت کی چنداں پرواہ نہ کیا کرتے۔ ایک جینز اور ٹی شرٹ جو میلی ہوتی تو الٹی کر کے پہن لیتے۔ فرماتے ''میاں! مالِ دنیا چرک دست است۔'' راقم نے عرض کی ''تو ساری میل ہاتھ پر ہی جمع رکھیں گے۔ کچھ اتار بھی پھینکئے۔'' اس پر غصہ میں آگئے۔ بڑی دیر غصہ رہے۔ لیکن اگلے دن بھی اسی حلیے میں دیکھ کر عرض کی ''کل کے غصے کا کیا ہوا۔'' فرمانے لگے کہ تمہارا غصہ ان بیجان چیزوں پر کیوں اُتاروں۔ ان کو خود سے دور کیونکر کروں۔

شاعر آدمی تھے اور پیٹر تخلص کرتے تھے۔ مخطوطات بھی زبانِ فرنگ ہی میں تھے۔ جن میں اکثریت بنیادی اخلاقیات کے لیے زہر قاتل تھے۔ خود فرماتے تھے کہ میری گزارشات ناپختہ ذہن کے لیے موت ہیں اور پختہ کے لیے مخطور۔ واللہ کیا کیا راز کھولا کرتے تھے۔ ایک دن راقم نے پوچھ ہی لیا کہ ''پیٹر'' ہی کیوں۔ کہنے لگے'' ایک تو اس سے ''انٹیلیکچوئل پنے'' کا گمان ہوتا ہے دوسرا اس لیے کہ دیارِ فرنگ کے بیشتر ناموں سے ہمارے ہاں یہی معروف ہے۔'' توجیح اچھی تھی، راقم نے بھی اعتراض نہ کیا۔ خود اپنی جان سے ہاتھ دھونے کا اندیشہ نہ ہوتا تو ان کا کوئی مخطوطہ ''فی سبیل اللہ فساد'' کے لیے ضرور شریک کرتے۔ بلکہ تحریر کیا۔ ان کا تو ایک آدھا قول ہی ہمیں وجود سے عدم کی طرف منتقل کرنے کو کافی ہے۔

خواجہ صاحب کی ذات باکمال کے متعلق بالا گفتگو تو مشتے نمونے از خروارے ہے۔ زندگی رہی تو خواجہ صاحب کی رمز بھری زندگی سے کچھ سنہرے واقعات عوام کی ہدایت اور عبرت کے لیے کبھی پیش کیے جائیں گے۔

نوٹ: اس خاکے کے تمام کردار تخیلاتی ہیں۔ کسی بھی قسم کی سو فیصد مشابہت محض اتفاقیہ ہوگی۔

نادر خان سرِ گروہ

قدیم خاں اَزَلی......! نام سن کر یہ گمان ہوتا ہے کہ اُن کی عمر کم اَز کم ایک ہزار سال تو ہوگی اور عمر کی یہ تحدید بھی اس بنیاد پر کی ہے کہ ہم کسی انسان کی اس سے زیادہ عمر کا تصوّر نہیں کر سکتے۔ خیبر آباد کو خیر باد کہہ کر سعودی عرب میں اپنی جوانی ضائع کرنے والے اِس مہاجر تاجر نے نہ معلوم کتنے اُلجھن کے کاروبار کیے۔ اُن کا اصل کاروبار خواب بیچنا ہے۔ اِس کے علاوہ بھی متعدّد کاروبار میں ہاتھ مارتے ہیں، پھر کچھ دنوں بعد۔۔۔لات!

اَزَلی کا ظاہری قد کرۂ ارض کے انسانوں جیسا ہی ہے، لیکن شخصیت کا قد پوچھیں تو ناپنا اِتنا آسان نہیں کہ وہ بڑھتا گھٹتا رہتا ہے۔ اَزَلی سعودی عرب میں بیشتر لوگوں کو قریب سے جانتے ہیں۔ اِسی لیے تھوڑے اُن کے دوست ہیں اور دشمن زیادہ۔ کسی اَدیب کے لیے دشمنوں سے زیادہ نقادوں کی تعداد سُود مند ثابت ہوتی ہے۔ اَزَلی پر زبانی تنقید کرنے والے تو بہت ہیں، مگر تحریری طور پر شاید ایک بھی نہیں۔

مزاح کا عنصر اُن کی طبیعت میں شامل ہے۔ اُن کی سنجیدہ گفتگو بھی سامع کو مسکرانے پر مجبور کر دیتی ہے۔ مجھے یہ علم نہیں کہ مزاح اُن کا اوڑھنا بچھونا بھی ہے یا نہیں، مگر اِتنا جانتا ہوں کہ وہ ایک کھاتے پیتے مزاح نگار ہیں۔ اپنے مزاح کے ''جیم'' کا نقطہ نکال کر اپنی تحریر میں مزاح بھرتے ہیں۔ اور جب تقریر کرتے ہیں تو ایسی کہ۔۔۔پھول جھڑ جاتے ہیں۔

اکثر چین جاتے ہیں، مگر جیسے جاتے ہیں ویسے ہی پلٹ آتے ہیں! یعنی اِتنا بھی نہیں ٹھہرتے کہ علم میں کچھ اضافہ کر سکیں۔ اُن کے پاؤں میں چکّر ہے۔ ایک سفر سے لوٹے نہیں کہ اَگلے سفر کا قصد کیا۔ سفر سے لوٹتے اِس لیے ہیں کہ تھک جاتے ہیں۔ پھر رختِ سفر باندھتے ہیں کہ تھک کر بیٹھنے کے عادی نہیں۔ اُنھیں برسوں سے جانتا ہوں (پرسوں سے نہیں! برسوں سے) لیکن کبھی غصّے کی حالت میں نہیں دیکھا۔ البتہ اکثر پان پر غصہ اُتارتے ہوئے دیکھا ہے۔ پان سے اُنھیں سخت نفرت ہے۔ چبا چبا کر پان کا خون کر دیتے ہیں۔ پھر کوئی مناسب جگہ دیکھ کر غصّہ تھوک دیتے ہیں۔

جناب کی ایک خاص بات یہ ہے کہ وہ کبھی تعلقات نہیں

توڑتے۔ آپ چاہیں گے تب بھی وہ نہ توڑیں گے۔ آپ تنگ آ جائیں گے، تب بھی نہیں۔ نوجوانوں کی حوصلہ افزائی میں کوئی کسر باقی نہیں رکھتے، یہ اور بات ہے کہ نوجوانوں میں کوئی نہ کوئی کسر رہ جاتی ہے۔ SMS کا جواب فوراً دے دیتے ہیں۔ کبھی کبھی شک گزرتا ہے کہ کہیں اُردو کے ناقدین اور تبصرہ نگاروں کی طرح، بغیر پڑھے ہی جواب نہ دے دیا ہو۔ نماز میں خشیتِ الٰہی کا پاس ہے ورنہ وہ حالتِ قیام میں بھی SMS کا جواب دیتے۔

اَزؔلی تقاریب میں سانس لینے والے آدمی ہیں۔ اگر کسی وجہ سے وہ آپ سے چھپتے پھر رہے ہوں تو پریشان نہ ہوں۔ صرف مقامی تقاریب پر اپنی نظر رکھیے۔ کسی نہ کسی تقریب میں، ڈائس پر یا اگلی نشست میں آپ اُنہیں اَدب میں رنگے ہاتھوں پکڑ سکتے ہیں۔ ہر تقریب سے پہلے کہتے ہیں کہ آج بہت اچھا پروگرام ہے اور ہر تقریب کے بعد کہتے ہیں کہ اچھا بھلا وقت ضائع ہوا۔ اِسی اُدھیڑ بُن میں ایک عمر گزار دی کہ کبھی بھی کچھ اچھا نہیں ہوا اور کبھی تو کچھ اچھا ہوگا۔ دراصل اَزؔلی ایک ایسی تڑپتی مچھلی ہے جو پانی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی اور نہ پانی سے باہر آئے بغیر جی سکتی ہے۔

ہر تقریب میں اپنی شرکت سے ظلم ڈھاتے ہیں۔ اُس پر کبھی نظامت کی کمان سنبھال کر ظلم کی انتہا کر دیتے ہیں۔ اَزؔلی کا نام اِتنا چل گیا ہے کہ وہ کسی محفل یا جلسے میں اپنے مضمون میں حاضرین کو بُرا بھلا بھی کہیں تو حاضرین نہ اَزؔلی کو بُرا سمجھیں گے اور نہ خود کو۔ وہ جواباً یہی کہیں گے، ''کیا اچھا کہا ہے'' ۔۔۔ ''کیا اچھا کہا ہے؟''

اَزؔلی اپنی تحریروں اور تقریروں میں لطیفوں کا فیاضانہ استعمال کرتے ہیں۔ اِس معاملے میں اُن کا منہ اُن کے ہاتھ کی طرح کُھلا ہے۔ لوگ اُن کے لطیفے سننے میں اِتنے مشاق ہو چکے ہیں کہ لطیفہ شروع ہوتے ہی لوگوں کے کان ہنسنے لگتے ہیں۔

اُردو کا دَم بھرنے والے بیشتر لوگ تقاریب میں شریک ہو کر یا کچھ پڑھ کر یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے اپنی ذمّہ داری نبھالی۔ لیکن وہ یہ بات بھول جاتے ہیں، یا پھر چشم پوشی کرتے ہیں کہ لفظوں کی جادوگری کے علاوہ نوٹوں سے بھری مٹھی بھی تقاریب کے انعقاد کے لیے ضروری ہے۔ اَزؔلی اکثر تقریبات کو ایسی ہی بند مٹھی سے

> **بدکردار شعراء**
>
> ڈاکٹر اعجاز حسین الٰہ آباد یونیورسٹی میں غزل پڑھ رہے تھے۔ فراقؔ گورکھپوری بھی وہاں موجود تھے۔ اُنہوں نے ڈاکٹر اعجاز حسین سے پوچھا ''ایسا کیوں ہوتا ہے کہ غزل گو شعرا عام طور سے بدکردار ہوتے ہیں؟''
>
> اعجاز صاحب برجستہ بولے ''اُن کے سامنے آپ کی مثال رہتی ہوگی۔''
>
> پوری یونیورسٹی میں بڑے زور کے قہقہے گونجے اور فراقؔ صاحب کی آواز قہقہوں میں دب کر رہ گئی جو ابھی کچھ کہنا چاہتے تھے۔

مُکّے مار مار کر آگے بڑھاتے ہیں۔

لکھنا اَزؔلی کا شوقِ فضول ہے۔ اگر فکرِ معاش نہ ہوتی تو وہ صرف لکھتے اور بس لکھتے۔ تب لکھنا اُن کا ذریعۂ معاش ہوتا۔ فضلِ خداوند ہے (ہم پر) کہ لکھنا اُن کا ذریعۂ معاش نہیں، ورنہ اُس معاش میں فکر نہ ہوتی۔ اَزؔلی نے لاکھ کوشش کی کہ اُردو کو ذریعۂ معاش بنایا جائے، لیکن ہزاروں، لاکھوں ادیبوں کی طرح وہ بھی دو دو کشتیوں میں سوار رہے۔ نہ اِدھر دونوں ٹانگیں رکھ پائے نہ اُدھر۔ آخر اقلم کشی کر کے اَدب کے اُس اُفق پر اُبھرے، جس کے متعلق اُردو کا قاری اِس کشمکش و پیچ میں رہتا ہے کہ ۔۔۔ زمین اُوپر اُٹھ گئی ہے یا فلک نیچے آ گیا ہے۔

مزاح نگاری، افسانہ نویسی، معاشرتی، معلوماتی اور تفریحی مضامین اور جز وقتی شاعری اُن کے زورِ قلم کا عتاب سہنے والی اصناف ہیں۔ اَزؔلی کے پاس موضوعات کی کمی نہیں۔ موضوعات اُڑ اُڑ کر اُن کے پاس آتے ہیں، لیکن وہ اِتنے مصروف ہیں کہ اُڑ اُڑ کر آنے والے اُن موضوعات میں سے بہت کم کو اپنی مٹھی میں کر پاتے ہیں۔ سچ پوچھو تو اَزؔلی خود ایک اُڑتا ہوا موضوع ہے جو کبھی کسی کی مٹھی میں نہیں آتا۔ جب بھی وقت نکال کر لکھنے بیٹھتے ہیں تو بس لکھتے ہی چلے جاتے ہیں۔ ایک ہی بیٹھک میں دس بیس صفحات پر کسی موضوع کو قلمبند کر کے ہی قلم ۔۔۔ بند کرتے ہیں۔

اِتنی تیزی سے مضامین لکھتے ہیں کہ لکھنے سے پہلے اُنھیں سوچنا نہیں پڑتا۔ لکھنے کے بعد تو بالکل ہی نہیں سوچتے۔ بقول اُن کے یہ کام قارئین کا ہے۔ اُن کی تحریروں میں اپنے ملک سے اُن کا پیار صاف جھلکتا ہے۔ وہ اپنے ملک کو کبھی نہیں بھولتے۔ اِسی لیے تو جب چین کا سفرنامہ لکھتے ہیں تو کہیں بھی دیوارِ چین کا ذکر نہیں کرتے۔ بلکہ یہ کہتے ہیں کہ وہاں خیبر آباد کا قدیم قلعہ نہیں ہے۔ مگر افسوس! وہ اپنی تحریروں کو حفاظت سے نہیں رکھتے۔ اَزؔلی کو اگر خون کے آنسو رُلانا ہو تو بس اِتنا کافی ہے کہ اُن تمام مسودوں کو جلا کر راکھ کر دیا جائے۔ یہ بات میرے اور آپ کے بیچ ہی رہے تو اچھا ہے۔ اگر سب کو خبر ہوئی تو جلانے کو میرے اور آپ کے حصے میں کچھ بھی نہ آئے گا۔

اَزؔلی نے ایک عمر جہیز کے خلاف مُہم میں جھونک دی، بلکہ خود کو بھی اِس مُہم میں اُس عمر میں جھونک دیا تھا جب اُن کو یہ پتا بھی نہیں تھا کہ شادی کا لڈّو کیا چیز ہوتی ہے۔ لیکن جب پتا چل گیا تو (جہیز نہ لینے کی عملی مثال پیش کرنے کے لیے) دو۔۔۔ دو شادیاں کیں۔ جہیز کے خلاف اَزؔلی کی مہم ہنُوز جاری ہے۔ خدا خیر کرے! عملی مثال پیش کرنے کے مزید امکانات باقی ہیں، یعنیٰ دو خانے اب بھی خالی ہیں۔

جہیز کے موضوع پر اِتنا لکھا کہ ایک کتاب مرتب ہو گئی، جس میں اُنھوں نے مردوں کو غیرت دلائی ہے۔ مُردوں کو نہیں! مَردوں کو! یوں بھی ایسے مَردوں کو مُردہ کہنا بے جا نہ ہوگا، جو جہیز کے بدلے اپنے ضمیر کو۔۔۔ اور اپنی رُوح کو بیچ دیتے ہیں۔ انھوں نے جوڑا جہیز کے علاوہ ازدواجی مسائل پر بھی لکھا اور بطور کونسلر متعدّد شادی شدہ جوڑوں کے مسائل (جو حقیقتاً ہوتے نہیں ہیں) بھی حل کرنے کی کوشش کی۔

اَزؔلی ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ سماجی کارکن بھی ہیں، لیکن وہ کبھی کسی گروہ کا حصہ نہیں بنتے، بلکہ ہر گروہ میں اپنے حصے کر دیتے ہیں یا ہر گروہ کے حصے بخرے کر دیتے ہیں۔ ہر کام بنفسِ نفیس کرنا چاہتے ہیں۔ کام بانٹنا اور سونپنا اچھا نہیں سمجھتے، اِسی لیے اِس کام میں، اُس کام میں خود بٹ کر رہ جاتے ہیں اور غیر ضروری مصروفیات میں مصروف رہتے ہیں۔ غنیمت ہے کہ اِن کی دو ہی ٹانگیں ہیں، ورنہ اُن کے رکھنے کے لیے کشتیاں کم پڑتیں۔ سنا ہے کہ اب وہ اپنا کاروبار اپنے بیٹے کو سونپ کر جھاڑ پھونک کا کام کریں گے۔ یعنی۔۔۔ فلسفہ جھاڑیں گے اور اپنی جمع پونجی پھونکیں گے۔

اَزؔلی قوم کی حالت دیکھ کر ہمیشہ فکرمند رہتے ہیں۔ قوم کے مسائل پر کھل کر بولتے ہیں اور ویسا ہی لکھتے بھی ہیں۔ رات کو یہ سوچ کر سوتے ہیں کہ صبح جب میں اُٹھوں تو قوم کی حالت یکسر بدل چکی ہو۔ پھر جب اُٹھتے ہیں تو سوئی ہوئی قوم کی حالت مزید اَبتر دیکھ کر یہ عزم کرتے ہیں کہ کچھ ایسا کیا جائے کہ آج کا سورج غروب ہونے سے پہلے سب کچھ بدل جائے۔ وہ ہر بڑے کام کی شروعات ایک بڑے قدم سے کرنا چاہتے ہیں۔ یوں تو بڑا قدم اُٹھانے کو وہ ہمہ وقت تیار ہیں، لیکن بڑا قدم اُٹھاتے اُٹھاتے اُس بڑے کام کی ہیئت بدل جاتی ہے۔ یعنی کوئی دوسرا بڑا کام ذہن میں آ جاتا ہے۔

اِس کام میں مصروف، اُس کام میں مشغول۔ اِدھر موجود، اُدھر موجود، اَزؔلی تقریباً پندرہ ملکوں کی فضا میں سانس لے چکے ہیں۔ لیکن اُنھوں نے شاید ہی کبھی جدہ کے بحرالاحمر کے کنارے اپنی تیز رفتار زندگی کو بریک لگا کر پارک کِیا ہو اَور پتلون کے پائینچوں کو گھٹنوں تک اُٹھا کر کھاری پانی میں پاؤں ہلکے کیے ہوں۔ پھر ڈُوبتے سورج کے انتظار میں، ریت کے فرش پر کسی کروَٹ لیٹ کر، انگلیوں سے آڑی ترچھی لکیریں کھینچی ہوں اور اپنی اُلجھن سلجھائی ہو۔

اچھی خاصی عمر کرۂ ارض پر گزارنے کے بعد اَزؔلی اب ایک اور زندگی کے خواہش مند ہیں۔ ایک بار۔۔۔ صرف ایک بار اِس دنیا میں آنے کا ایک موقع اور مل جائے تو قدیم خاں اَزؔلی اُس زندگی کو بڑی احتیاط سے خرچ کریں گے۔ پچھلی زندگی میں کی گئیں غلطیوں کو نہیں دُہرائیں گے، بلکہ نئے سِرے سے نئی نئی غلطیاں کریں گے۔ اَزل سے یہ فطرتِ خاکی رہی ہے۔ اور۔۔۔ یہ خاکی اپنی فطرت میں۔

عقرب ادیبوں ،شاعروں ،صحافی دانشوروں اور بڑھاپے کا ساتھ چلا آرہا ہے، ماضی میں یہ سب سے طویل عمر پاتے تھے اور کتابوں کے ڈھیر لگا کر اگلے جہان سدھار جاتے تھے دراصل ان کے پاس وقت ہی بہت زیادہ ہوتا تھا مشاعرے پڑھنے اور لکھنے لکھانے کے سوا کوئی کام نہیں کرتے تھے اب تو عمر کی اوسط کم ہونے کے علاوہ شعروادب تخلیق کرنے والوں کو ساتھ سرکاری یا نجی شعبے میں کوئی ملازمت بھی کرنا پڑتی ہے، ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر نے اگلے وقتوں کے ان شاعروں کو یونہی خوش نصیب قرار نہیں دیا تھا۔۔۔

کس قدر خوش نصیب ہوتے تھے
اگلے وقتوں کے شاعرانِ کرام
رات دن نغمہ ہائے چنگ و رباب
روز و شب گردشِ پیالہ و جام
ایک جانب رقیب بدکردار
ایک پہلو میں ساقیِٔ گلفام

حفیظ جالندھری بڑھاپے کے قائل ہی نہیں تھے غالباً یہی وجہ تھی کہ وہ آخری عمر تک شادیاں کرتے رہے تھے یہ الگ بات ہے کہ اولادِ نرینہ سے محروم ہی رہے تھے غالباً بڑھاپے میں انہیں کسی نے باباجی کہہ دیا ہوگا جس پر انہوں نے وہ مشہور نظم کہہ ڈالی تھی جسے ملکہ پکھراج اور ان کی صاحبزادی طاہرہ سید نے گا کر امر کر دیا ہے۔۔۔

یہ کیا گماں ہے بدگماں
سمجھ نہ مجھ کو ناتواں
خیال زہد ابھی کہاں
ابھی تو میں جوان ہوں

عام انسان کے مقابلے میں شاعروں کے جذبے سدا جواں رہتے ہیں اور وہ زندگی کے ہر مرحلے میں عشق لڑانے پر تیار رہتے ہیں ایسے ہی ایک دل پھینک پنجابی شاعر نے کہہ رکھا ہے ۔

دل ہونا چاہیدا اے جوان
تے عمراں وچ کیہ رکھیا

مردوں کے مقابلے میں خواتین کی عمر زیادہ ہوتی ہے اور یہ اصول ادب میں بھی رائج ہے البتہ صحافت میں یہ اصول نہیں چلتا، ادیب، شاعر، دانشور عام طور پر پہلے فوت ہوجاتے ہیں اور ان کی جیون ساتھی کو بیوہ بن کر زندگی کے کٹھن دن تنہا بسر کرنا پڑتے ہیں، محبت کی شادی کرنے والے لاہور میں مقیم معروف ادیب، شاعر شہرت بخاری، اے حمید، احمد راہی، اصغر بٹ، یوسف کامران، منیر نیازی وغیرہ کو انتقال کئے برسوں گزر چکے ہیں انکی بیوگان فرخندہ بخاری، ریحانہ قمر، نثار عزیز، کشور ناہید اور ناہید نیازی ابھی تک اپنے اپنے محبوب شوہر کی یادوں کے سہارے بڑھاپا کاٹ رہی ہیں۔

ادیبوں، شاعروں کے برعکس کالم نگاروں، صحافی دانشوروں کو عموماً زندگی مین جیون ساتھی کی جدائی کا صدمہ برداشت کرنا پڑتا ہے مثال کے طور پر عبدالقادر حسن، اصغر ندیم سید، خالد مسعود خان، رؤف طاہر کے نام لئے جاسکتے ہیں خالد مسعود خان اور رؤف طاہر نے اہلیہ کے بچھڑنے پر قومی اردو اخبار میں جذباتی کالم لکھے تھے (جنہیں پڑھ کر شدت غم سے ہماری آنکھیں بھی نم ہوگئی

تھیں) البتہ اصغر ندیم سید چونکہ ڈراما نگار بھی ہیں اس لئے انہوں نے جیون ساتھی کی جدائی کے حوالے سے ٹی وی سیریل لکھ ڈالی تھی جس میں ان کا کردار فلمسٹار ندیم نے ادا کیا تھا ، ڈراما سیریل کی کامیابی کے بعد اصغر ندیم سید نے دوسری شادی کر لی تھی، ہمارے خیال میں قلمکاروں کو جیون ساتھی کی جدائی پر دوسری شادی ضرور کر لینی چاہیے ورنہ ان کی حساس شخصیت بکھر جاتی ہے۔

بیشتر دانشور اہلیہ کی وفات کے بعد محض اولاد کی خاطر دوسری شادی نہیں کرتے ، اولاد سے محروم بیشتر ادیب ، شاعر اور صحافی دانشور بھی پہلی بیوی کی ناراضگی کے ڈر اور معاشرے کے جبر کی

مردوں کی نسبت خواتین لکھاری بڑھاپے میں زیادہ چڑچڑی ہوجاتی ہیں، طنز ومزاح میں ویسے ہی خواتین کا بہت کم حصہ پایا جاتا ہے، بوڑھے مرد تو پھر بھی تاش کھیل، کرکٹ میچ دیکھ اور سگریٹ پی پی کر وقت گزار لیتے ہیں لیکن بوڑھی عورتوں کیلئے وقت کاٹنا مشکل ہوجاتا ہے۔

وجہ سے دوسری شادی کی ہمت نہیں کرتے اور جو لاولد دانشور لے پالک بچے بھی نہیں رکھتے ان کی شخصیت سخت گیر قسم کی ہوجاتی ہے چوہدری محمد حسین ملک نے برسوں قبل اپنے کالم میں اس موضوع پر کافی روشنی ڈالی تھی، مجرد زندگی بسر کرنے والے ادیب، شاعر اور صحافی دانشور بھی عموماً کھردری شخصیت کے مالک ہوتے ہیں اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نفسیاتی عوارض میں مبتلا ہوتے جاتے ہیں بڑھاپے میں پہنچ کر بیشتر لوگ مکمل نفسیاتی مریض بن جاتے ہیں انہیں عام افراد اور عام لوگوں کو ان سے کوئی دلچسپی نہیں رہتی۔

بیشتر کنوارے ادیب، شاعر بڑھاپے میں پہنچ کر مزاح کی حس سے بھی محروم ہوجاتے ہیں جس کی وجہ سے وہ ہر چیز کو انتہائی سنجیدگی سے لیتے ہیں، محرومیوں کی زندگی گزارنے کے باعث ان کا مزاج ہر وقت تلخ بلکہ برہم رہتا ہے، خود تو ہنسنا مسکرانا بھول چکے ہوتے ہیں دوسروں کو بھی ہنستے مسکراتے نہیں دیکھ سکتے ، مردوں کی نسبت خواتین لکھاری بڑھاپے میں زیادہ چڑچڑی ہوجاتی ہیں، طنز ومزاح میں ویسے ہی خواتین کا بہت کم حصہ پایا جاتا ہے، بوڑھے مرد تو پھر بھی تاش کھیل، کرکٹ میچ دیکھ اور سگریٹ پی پی کر وقت گزار لیتے ہیں لیکن بوڑھی عورتوں کیلئے وقت کاٹنا مشکل ہوجاتا ہے، بڑھاپے کو اگر دل سے قبول نہ کیا جائے اور زندہ دلی کا مظاہرہ کیا جائے تو یہ کچھ نہیں کہتا لیکن اگر دل چھوڑ دیا جائے تو پھر جلد وہ نوبت آجاتی ہے کہ بقول طارق کامران ۔

اُٹھنے کی اب سکت نہیں ہے، رہ گئی چارپائی
اور کس کو کہتے ہیں بڑھاپا میرے بھائی

جواں سالہ ادیبہ، شاعرہ اور کالم نگار ڈاکٹر شاہدہ دلاور شاہ بزرگوں سے بہت عقیدت رکھتی ہیں، بزرگ ادیب، شاعر اور صحافی دانشور بھی ان پر بہت شفقت فرماتے ہیں جس کا عملی مظاہرہ پریس کلب میں ادبی کمیٹی کی تقریبات کے دوران ہم دیکھتے رہے ہیں بالخصوص اقبال بخاری اور طارق کامران ان کا بہت خیال رکھتے ہیں وہ بھی دونوں کا دلی احترام کرتی ہیں، ڈاکٹر شاہدہ دلاور شاہ نے گزشتہ دنوں اپنے کالم میں بزرگوں کو بڑھاپا اچھے طریقے سے گزارنے کے چند گر بتائے تھے۔

ہمارے خیال میں ڈاکٹر شاہدہ دلاور شاہ کو یہ کالم عالمی یوم صحت بلکہ بزرگوں کے عالمی دن پر شائع کروانا چاہیے تھا اسے یوم اطفال کے قریب چھاپ کر انکے اخبار نے شاید صحافت مین نئی بات کی ریت ڈالی ہے، انصاف کا تقاضا تھا کہ کالم میں بزرگوں کو سیر شروع کرنے کے ساتھ ساتھ تمبا کو نوشی چھوڑنے کا مشورہ بھی دیا جاتا، اس تمبا کو نوشی کی وجہ سے بزرگ خود ہی نہیں اپنے قرب وجوار میں موجود جوانوں کو بھی دل، پھیپھڑے اور سانس کے مختلف امراض میں مبتلا کرتے رہتے ہیں، ہمیں امید تو نہیں کہ ڈاکٹر شاہدہ دلاور شاہ تمبا کو نوشی کیخلاف کالم لکھ کر بزرگوں کو ناراض کریں گی تاہم بقول عدم۔

ہم کو شاہوں سے عدالت کی توقع تو نہیں
آپ کہتے ہیں تو زنجیر ہلا دیتے ہیں

اُسے بچپن سے ہی محسوس ہوتا کہ وہ بڑا ہو کر کوئی ایسا کام کرے گا جس میں کھپ شپ زیادہ ہو گی۔ اُسے رات خواب میں روشنیاں نظر آتی تھیں کبھی یہ روشنیاں کیمروں میں بدل جاتیں اور کبھی آپریشن تھیٹر کی روشنیوں میں، وہ بچپن سے ہی کوئی بھی واقعہ ایسے بیان کرتا تھا جیسے وہ اس کا عینی شاہد ہو۔ اُردو کی کلاس میں ہلاکو خان کی قتل وغارت اور ہولناکیوں کا ذکر کرتے وہ اپنی بھاری بھرکم آواز سے بہت سے کمزور دل طالب علموں کو خوف سے رلا دیتا تھا انہیں یہی محسوس ہوتا تھا کہ وہ اسکول سے نکلیں گے تو ہلاکو خان اور اس کی خونخوار فوج ان کو پکڑ لے گی، وہ بہت سے چھٹی کے وقت گیٹ سے باہر جھانکتے کمزور دل طالب علموں کو اپنی بھاری آواز میں ''ہاؤ'' کر کے ڈرا دیا کرتا تھا۔ اس کا سب سے محبوب مشغلہ کسی بھی گلی کی نکڑ پر کھڑے ہو کر آواز لگانا کہ ''چیز ونڈی دی لئی جاؤ'' اور بچے اس کی آواز پر اِکھٹے ہو جاتے تو وہ دوسری گلی کی طرف اشارہ کرتا جب بہت سارے بچے اس جانب بھاگ جاتے تو وہ خود بھی اس خیال سے کہ شائد کوئی چیز بانٹ ہی نہ رہا ہو خود بھی ان کے پیچھے بھاگ جاتا۔ میٹرک تک اس کی لائی اور بنائی ہوئی خبروں پر اسکول کے استاد طالب علم اعتبار کرنے لگے تھے کیونکہ ان تمام خبروں کا وہ عینی شاہد خود ہوتا تھا۔ لیکن اسے میڈیکل کی تعلیم حاصل کرنا پڑی۔ اب اسے محسوس ہوتا تھا کہ بچپن میں دیکھی جانے والی روشنی آپریشن تھیٹر کی ہو گی لیکن اس نے میڈیکل کالج میں بھی ابھی عینی شاہد خبروں کو کم نہیں کیا تھا اور اس کے ساتھی طالب علم اس کی خبروں میں دل چسپی لیتے تھے۔ اس وقت ملکی منظر نامے میں ان کی کوئی جگہ نہیں تھی، اس کے باوجود انہوں نے ایک

وہ اپنی بھاری بھرکم آواز سے بہت سے کمزور دل طالب علموں کو خوف سے رلا دیتا تھا انہیں یہی محسوس ہوتا تھا کہ وہ اسکول سے نکلیں گے تو ہلاکو خان اور اس کی خونخوار فوج ان کو پکڑ لے گی، وہ بہت سے چھٹی کے وقت گیٹ سے باہر جھانکتے کمزور دل طالب علموں کو اپنی بھاری آواز میں ''ہاؤ'' کر کے ڈرا دیا کرتا تھا۔

جمہوری حکومت کی ''جرنیلی رخصتی'' پر خود ساختہ جلا وطنی اختیار کی۔ جرنیل کی حکومت پکی ہونے وہ اپنی جلا وطنی خود ہی متروک کر کے واپس آ گئے۔ ایک نجی چینل کے پروگرام میں بطور مہمان شامل ہونے لگے

اور پھر ''آگ لینے آئی اور مالک بن بیٹھی'' کے مصداق وہ اسی پروگرام کے اینکر ہو گئے اس کے ''طوطے، چڑیا'' بھی خبر لانے لگے تھے اور اس پر وہ اپنے بھاری بھرکم لہجے اور اس واقعے کے عینی شاہد ہو کر اس نے بہت عزت سمیٹی اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نے کئی بڑوں کی آنکھوں میں کیمرہ میں دیکھ کر آنکھیں ڈالی تھیں ہر نیوز چینل اس کا دیوانہ تھا بلکہ کئی چینل ''اس کے مطابق'' ڈیمانڈ ماننے کو تیار تھے اس نے عینی شاہد ہو کر بہت سوں کو رگیدا۔ ابھی جرنیل چیف ایگزیکٹو سے صدر مملکت ہی ہوئے تھے آمریت سے ''بہترین انتقام'' جنم لے

وہ اس بات سے شائد بے خبر ہے کہ میثاق جمہوریت کے تحت آنے والی باری پھر ان کی ہوگی جنہوں نے اسے اس چینل تک پہنچایا ہے اور آنے والے دورِ حکومت میں شائد وہ کسی دیہاتی ریڈیو پروگرام میں صحت کے حوالے سے مفید مشورے دے رہے ہوں گے۔

چکا تھا۔ پارٹی کا وزیراعظم تو بن گیا اب مرحلہ کسی جیالے کا تھا جو صدارت کے فرائض سنبھال سکے اس کے لئے جہاں ایک نئی این آر او ٹائپ ترمیم کی ضرورت تھی وہیں عینی شاہد جیسے ڈاکٹرز کو ''سائلنس'' پر لگانے کی ضرورت تھی جو کہ اس محاذ پر بہت سرگرم ہو چکے تھے۔ متوقع صدر کے خلاف ایسی ایسی رپورٹس الیکٹرونک اور پرنٹ میڈیا میں آ رہی تھیں کہ اگر قوم میں پڑھنے، سننے یا دیکھنے کی صلاحیت ہوتی شائد جیالے صدر کی اصطلاع تاریخ کی کتابوں میں ہی کہیں درج رہ جاتی۔ حکومت نے

اس ''عفریت'' سے نمٹنے کے لئے پی ٹی وی کی ''پھاہی'' تیار کی اور ڈاکٹر عینی شاہد اس میں پھنستے چلے گئے سب کچھ جیالے صدر کا من چاہا تھا بھاری بھرکم لہجہ نرم و نازک ہوتا چلا گیا اور تھوڑے

انہوں نے ایک جمہوری حکومت کی ''جرنیلی رخصتی'' پر خود ساختہ جلا وطنی اختیار کی۔ جرنیل کی حکومت پکی ہونے وہ اپنی جلا وطنی خود ہی متروک کر کے واپس آ گئے۔

ہی عرصے میں پی ٹی وی کو ایم ڈی اور چیئرمین کی ضرورت ہی نہ رہی اور اس نے بھی خود ہی پی ٹی وی سے استعفٰی دے دیا۔ وہ چینل جو سب کچھ ''اُن کے مطابق'' ہی کرنے کے لئے تیار تھے ان کے اپنے عینی شاہدین کی تعداد بڑھ چکی تھی اور پھر ایک وقت وہ بھی آیا کہ ڈاکٹر عینی شاہد کو اپنا وجود برقرار رکھنے کے لئے رمضان المبارک کے افطاری پروگرام میں بھی شریک ہونا پڑا۔ وہ اب ایک نجی چینل کے پروگرام میں بیٹھتا ہے، جی بھر کر اپنی بھڑاس نکالتا ہے لیکن اس کا بھاری بھرکم لہجہ اس کے کہے کی چغلی کھا رہا ہوتا ہے شائد اس کے یقین کرنے والوں کی تعداد بالکل نہ ہونے کے برابر ہے اب اس نے جیالے صدر کے بیٹے کے خلاف محاذ بنا رکھا ہے بالکل ایک عینی شاہد کی طرح لیکن وہ اس بات سے شائد بے خبر ہے کہ میثاق جمہوریت کے تحت آنے والی باری پھر ان کی ہوگی جنہوں نے اسے اس چینل تک پہنچایا ہے اور آنے والے دورِ حکومت میں شائد وہ کسی دیہاتی ریڈیو پروگرام میں صحت کے حوالے سے مفید مشورے دے رہے ہوں گے۔

شاہی اور عوامی دل گردہ

بہت دنوں سے پیٹ کے اندر کچھ نادیدہ مسائل سر اٹھا رہے تھے، نادیدہ کے ساتھ ساتھ پیچیدہ بھی، کہ مثانے کا خزانہ بھرا رہتا تھا مگر کوشش کے باوجود ہمارے ملکی خزانے کی طرح خالی ہو کر ہی نہ دیتا تھا۔ اب اگر ہمارے قارئین میں سے کسی نے ہمارے ملکی خزانے میں ۲۳/ارب ڈالر کا زرِ مبادلہ موجود ہونے کا ذکر کیا تو اُسے مدلل جواب دیا جا سکتا ہے۔ بہرحال واپس اپنے موضوع پر آتے ہیں۔ جب تکلیف بڑھ گئی تو آخر ڈاکٹر کے پاس جانا پڑا اور وہاں سے ایک میڈیکل لیب میں، اور وہاں سے رپورٹ لے کر پھر واپس ڈاکٹر کے پاس، جس نے ہمیں دوستی کے ناتے بہت گھما پھرا کر بتایا کہ آپ کے گردے میں پتھری ہے! ہماری عقل پر تو پہلے ہی پتھر پڑے ہوئے تھے، گردے میں پتھری کا سُن کر تو ہمارے اوسان خطا ہو گئے۔

یہ بات وزیرِ اعظم جناب نواز شریف کے گردے میں پتھری کی دریافت اور علاج سے پہلے کی ہے۔ ہمیں اس قدرِ مشترک کے ساتھ ساتھ ایک اور قدرِ مشترک کا پتہ بھی چل گیا، ہم تو خیر ہیں ہی عام سے آدمی اس لئے ایک عام سے ہسپتال ہی میں جا سکتے تھے، مگر جناب نواز شریف وزیرِ اعظم ہو کر بھی ایک نجی ہسپتال میں ہی اپنے ٹیسٹ کروانے گئے، شاید انہیں بھی احساس ہو گیا ہو کہ ملکی خزانے پر پہلے ہی میٹرو بس، آرنج ٹرین اور دیگر بڑے بڑے منصوبوں کے سبب اچھا خاصا بوجھ پڑ چکا ہے۔ اور تیسری قدرِ مشترک یہ ہے کہ ہماری طرح وہ بھی دوائیں لے رہے ہوں گے اور ضروری احتیاط بھی کر رہے ہوں گے۔ ہاں البتہ چوتھی کوئی قدرِ مشترک ہم تلاش نہیں کر پائے، اس کی بجائے ایک عدد قدرِ مختلف ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گئے ہیں کہ بہت سے کالم نگاروں اور میڈیا میں آنے والی خبروں کے مطابق پچھلے کچھ دنوں سے انہیں چُپ سی لگ گئی ہے، جبکہ ہم بدستور بولتے جا رہے ہیں۔ ہمیں ان

ڈاکٹر کے پاس، جس نے ہمیں دوستی کے ناتے بہت گھما پھرا کر بتایا کہ آپ کے گردے میں پتھری ہے! ہماری عقل پر تو پہلے ہی پتھر پڑے ہوئے تھے، گردے میں پتھری کا سُن کر تو ہمارے اوسان خطا ہو گئے۔

کی خاموشی اس لئے حیرت میں ڈال رہی ہے کہ میاں صاحب تو "دِل گردہ" رکھنے والے آدمی ہیں، بڑے سے بڑے بحران میں بھی ہمت نہیں ہارتے، تو اب بھلا ایسا کیا ہو گیا ہے۔ مانا کہ پہلے انہیں دل کا آپریشن کروانے کے لئے انگلستان کے ایک نجی ہسپتال میں بھی جانا پڑا تھا، مگر الحمدللہ، اور چشمِ بد دُور، اس کے بعد سے تو اُن کی صحت پہلے سے بھی اچھی ہو گئی ہے۔ ان کی چپ کا ایک سبب شاید یہ ہو سکتا ہے کہ ان کے ساؤنڈ سسٹم کا تعلق گُردوں سے ہو اور اِسی طرح ہمیں چپ نہ لگنے کا سبب یہ ہو سکتا ہے کہ ہماری قوتِ نطق کا تعلق جسم کے کسی اور حصے سے ہو! تاہم ہمیں ان نام نہاد تجزیہ نگاروں اور تجزیہ کار اینکروں سے ہرگز اتفاق نہیں ہے جو ان

کی خاموشی کے ڈانڈے پانامہ لیکس کے ''مُعلقہ'' یا ''حفاظتی تحویل میں'' لیے گئے فیصلے سے جوڑ رہے ہیں۔اس بارے میں تو یہی ایک مصرع کافی ہے:

ہو رہے گا کچھ نہ کچھ، گھبرائیں کیا

گُردوں کی اس بیماری نے ہمیں ایک اور شعر کی یاد دِلا دی جس میں گردوں کی لفظی ساخت تو یہی ہے مگر اس کا تلفظ ذرا مختلف ہے اور معنی بھی۔ پہلے آپ یہ شعر دیکھئے، پھر اس کا تلفظ بھی بتادیں گے۔

غافل تجھے گھڑیال یہ دیتا ہے منادی
گرِدوں نے گھڑی عمر کی اِک اور گھٹا دی

تو اس لفظ گرِدُوں کا مطلب آسمان ہوتا ہے، اور آسمان بھی وہ نہیں جو مہربان ہوتا ہے، بلکہ وہ والا آسمان جو انسان کے لئے منفی رویئے لے کر آتا ہے۔ ہمارے بہت سے پڑھنے والے تو شاید لفظ ''گھڑیال'' پر بھی اٹک گئے ہوں گے اور انہوں نے اس کا ایک اور مطلب یعنی ''مگرمچھ'' نکالا ہوگا۔ اگرچہ یہ مطلب بھی درست ہے مگر اس شعر میں گھڑیال کا مطلب وہ بڑے سائز کی دیواری گھڑی ہوتی ہے جس کے نیچے ایک عدد پینڈولم بھی لٹک رہا ہوتا ہے اور یہ ہر سیکنڈ میں دائیں سے بائیں (یا بائیں سے دائیں) جاتا اور واپس آتا ہے۔ چنانچہ اب اس شعر کا مطلب ہماری طرح آپ بھی سمجھ گئے ہوں گے کہ اے غافل انسان، یہ ہر لحظہ دائیں بائیں حرکت کرنے والی سیکنڈ کی سوئی یا پنڈولم تیری عمر میں ایک اور گھڑی کم ہونے کا اعلان کر رہی ہے۔ موبائل فون کے اس عہد میں تو لوگ گھڑی کو بھی بھول چکے ہیں تو گھڑیال تو اس نئی نسل میں سے شاید کسی نے دیکھا بھی نہ ہوگا اس لئے یہ سب کچھ کہنے کی ضرورت پیش آئی۔ اور اس شعر کا مطلب ہم جیسے عمر رسیدہ اور مریض آدمی کے لئے تو اَور بھی خطرناک اور تنبیہ آمیز ہو جاتا ہے کہ او میاں، ہوش کے ناخن لے، یہ گھڑیال تجھے خبردار کر رہا ہے کہ وہ گھڑی آنے والی ہے جب تجھ سے کہا جائے گا کہ ''پیش کر غافل اگر کوئی عمل دفتر میں ہے''۔

شعر و شاعری بہت ہو چکی، واپس ''گردے'' پر آتے ہیں اور اب ذرا اپنے اور آپ کے منہ کا ذائقہ بدلنے کی کوشش کرتے ہیں، جو لوگ ہماری طرح معدے میں کولسٹرول بھرتے رہنے کے شوقین ہیں جانتے ہیں کہ بکروں کے گُردوں کے ساتھ کچھ اور قابلِ بیان اجزاء مثلاً کلیجی، دِل وغیرہ اور ایک ناقابلِ بیان جز وملا کر تیار کردہ ایک بہت ہی لذیذ ڈش ''کٹا کٹ'' گھی یا چربی اور تیز مصالحوں میں تل کر پیش کی جاتی ہے، اور جنہیں کچھ سُر ساگر سے دلچسپی ہے یہ بھی جانتے ہیں کہ آگ پر دھری ہوئی بڑی کڑاہی میں اس ڈش کی تیاری کے دوران سٹیل کے کڑچھے یا چمچے سے جب ان ''اجزائے لذیذہ'' کو اُلٹ پلٹ کیا جاتا ہے تو اس عمل کا صوتی ردِ عمل ایک باقاعدہ مست کر دینے والی موسیقی کی صورت میں برآمد ہوتا ہے جس سے نہ صرف کٹا کٹ نوش فرمانے کے منتظرین بلکہ دیگر ''سامعین'' بھی پوری طرح لطف اندوز ہوتے ہیں۔ یہ موسیقی بھی کٹا کٹ کی تیاری کے نتیجے میں اٹھنے والی خوشبوؤں کی طرح انتہائی اشتہا انگیز ہوتی ہے۔

ہم واپس گُردوں کی پتھری کے موضوع پر آتے ہیں اور اپنی تاریخ کی دو انتہائی اہم شخصیات کا تذکرہ کر کے یہ کالم اس اعلان کے ساتھ مکمل کرتے ہیں کہ اس واقعے کی ہم سے یا کسی اور کے ساتھ ''کسی قسم کی مماثلت محض اتفاقیہ ہوگی''۔ اُن دو اہم شخصیات میں سے ایک مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور دوسری جناب جوش ملیح آبادی تھے۔ دونوں نظریاتی طور پر مختلف الخیال ہونے کے باوجود گہرے اور بے تکلف دوست تھے اور اکثر ان کی ملاقاتوں میں ہلکی پھلکی ''فرینڈلی فائرنگ'' بھی ہوتی رہتی تھی۔ ایک مرتبہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کو گردے میں پتھری کی شکایت پیدا ہو گئی، انہوں نے دورانِ گفتگو جناب جوش ملیح آبادی کو اپنی بیماری سے آگاہ کیا تو جوش جیسے بذلہ سنج بھلا اس موقع کو بھی کہاں جانے دیتے تھے، فوراً بولے: ''مودودی، اللہ تمہیں اندر سے سنگسار کر رہا ہے!''

مقطع میں کہیں کوئی سخن گسترانہ بات نہ آپڑی ہو اس لئے دست بستہ یہ کہہ کر کالم تمام کرتے ہیں کہ:

رُوئے سخن کسی کی طرف ہو تو رُوسیاہ

ارمغانِ ابتسام کا اگلا شمارہ نئے قہقہوں کے ساتھ